فرخ دلدار

نام کتاب	:	بزمِ خیال
		(مجموعہ مضامین)
مصنفہ	:	فرخ دلدار احمد۔کینیڈا
سال اشاعت	:	جنوری/2023ء
تعداد	:	500
رابطہ	:	

basitsaadia@gmail.com
Tel. : +1 (647) 570-4566

Bazm-e-Khayal

A Collection of Articles

by

Mrs. Farrukh Dildar Ahmad - Canada

انتساب

اپنے والدین اور بچوں کے نام

میرے شفیق والدین نے زندگی کے ہر موڑ پر

مجھے اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھا

اور زندگی کی دشوار گزار راہوں پر ہمیشہ

میرے لئے روشنیاں بچھاتے چلے گئے۔

اور میرے بچوں کی فرمانبرادی اور محبت نے

میرے دل کو ہمیشہ سکون بخشا

اور زندگی میں مسکراہٹیں بکھیریں۔

○○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین-بزمِ خیال

○○

پیش لفظ

میرے پیش نظر اس وقت محترمہ فرخ دلدار صاحبہ کی پہلی تصنیف ہے جو مختلف ادوار میں اجلاسوں اور شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کل 22 عالمانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ہر مضمون قلمکار کے ذہن کے وسیع افق کی عکاسی کرتا ہے۔ زبان پر گرفت، الفاظ کا چناؤ، خیال کی رفعت جگہ جگہ پر جھلملاتے ستاروں کی طرح نظر آتی ہے۔ سفر نامے پڑھ کر مصنف کے جہاں دیدہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے اپنے عقیدے سے والہانہ لگاؤ پتھر پر لکیر کی طرح راسخ ہے۔ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مَے وہ کس قدر سرشار ہیں اس کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے جہاں بصیرت اور مسرت کے دریچے وا ہوتے ہیں وہیں ایمان وعقیدے کی تازگی کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔

پہلا مضمون مصنف کتاب کے نانا جان حافظ مولوی عبد العلی صاحبؓ اور ان کے برادر اصغر حضرت مولوی شیر علی صاحب کے والد گرامی، حضرت نظام الدین صاحبؓ (313) کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ کا ذکر حقیقۃ الوحی کے صفحہ نمبر 529 پر حضرت نظام الدین اور حمہ شاہ پور کے نام سے درج ہے۔ کیونکہ آپ بھی اس نشان آسمانی کے شاہد تھے جس کا الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہوا تھا۔ یاد رہے کہ حضرت مولوی شیر علی صاحب کو انگریزی حکومت کی طرف سے سیشن جج کے عہدے کی پیشکش ہوئی تھی مگر آپ نے مسیح الزماںؑ کی غلامی قبول کرنے کو ترجیح دی۔ اور قرآن کریم کے انگلش ترجمے سے یوروپی اور مغربی ممالک میں یہ روحانی علم پھیلا یا تھا۔

دوسرا مضمون حضرت مولوی عبدالعلی صاحب ؓ کے حالات زندگی پر ہے۔ان کے برادر اکبر مولوی شیر علی صاحب نے قرآن مجید کا انگلش ترجمہ کیا تو چھوٹے بھائی نے قرآن حفظ کیا، پڑھایا اور سنایا اور اپنے چھ بچوں میں قرآن کی محبت راسخ کر دی۔آپ نے علی گڑھ سے بی اے ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی تھی۔علی گڑھ روانہ ہونے سے قبل بیعت کر چکے تھے اور 313 اصحاب ؓ کبار میں شامل تھے۔انجام آتھم میں آپ کا نام میاں عبدالعلی موضعہ عبدالرحمن ضلع شاہ پور کے نام سے بیعت نمبر 140 میں لکھا ہے۔کتاب البریہ میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے میاں عبدالعلیٰ محمڈن کالج علی گڑھ کے نام سے کیا ہے۔1896 کے موسم گرما میں مسیح پاک علیہ السلام نے نماز ظہر سے پہلے تخلیہ میں چھوٹی مسجد میں آپ سے انگریزی کی کتاب سنی جو کسی یہودی عالم نے عیسائیت کے رد میں تصنیف کی تھی۔حضرت حافظ صاحب سرگودھا کے پہلے مسلمان وکیل تھے۔

یادرفتگاں کے ضمن میں مصنفہ نے اپنے والد گرامی پر جو مضمون ''ایک مرد درویش کیپٹن ڈاکٹر محمد سعید'' صفحہ قرطاس پر اتارا ہے وہ بار بار پڑھنے کو جی کرتا ہے۔آپ کے والد صاحب نے جب امرتسر میڈیکل کالج کی تعلیم مکمل کی تو حکومت ہند کے ایماء پر فوج میں ملازمت لے لی۔اس لئے مدراس، کلکتہ، برما اور ملایا میں خدمات سرانجام دیں۔پاکستان کے قیام کے بعد ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

ان کے کالج کے ساتھیوں میں سے ایک پاک فوج کے جنرل برنی تھے جو ان کی گونا گوں خوبیوں کا برملا اعتراف کرتے تھے۔آپ بہت اچھے کھلاڑی تھے۔1942ء میں لانگ جمپ میں آل انڈیا ریکارڈ قائم کیا۔انڈیا اولمپک میں بیسٹ ایتھلیٹ قرار پائے۔ معلومات کا انسائیکلو پیڈیا تھے۔عالم اور علم بخش تھے۔کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کرتے تو

علم کے دریا بہا دیتے۔

کتاب میں سفرنامے (سوئے حرم ، چڑھتے سورج کی سرزمین، ساگوآرو کیکٹس Saguaro cactus کی زمین ۔ایری زونا) بھی شامل ہیں۔سوئے حرم یعنی مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے سفر کے دوران جو کچھ دیکھا وہ اس صحیح طریق سے قلم بند کیا ہے گویا ان کے مناظر نے دماغ نے ان مقدس مقامات کی تصویر بنالی تھی۔ لکھتی ہیں:

''صحن کے درمیان میں خانہ کعبہ اپنے رعب وجلال کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہا ہے اور چاروں اطراف سنگ مرمر کی محرابیں، سیڑھیاں اور فرش اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرر ہے ہیں۔ خانہ کعبہ کا صحن نہایت کشادہ اور خوبصورت سرخ قالینوں سے مزین ہے جو گولائی میں طواف کی جگہ چھوڑ کر خانہ کعبہ کے ارد گرد بچھے رہتے ہیں۔ سنہری جالیوں کے خوبصورت اور نفیس سٹینڈ بھی مختلف زاویوں سے درمیان میں رکھے ہوئے ہیں جن پر قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں۔ ان قالینوں کے ساتھ مختلف راستے آنے جانے کیلئے بنے ہوئے ہیں جہاں ٹھنڈے یخ آب زم زم سے لبا لب خوبصورت کولر قطاروں میں رکھے ہوئے ہیں۔آتے جاتے آب زم زم سے پیاس بجھانے سے جو سکون ملتا ہے وہ نا قابل بیان ہے۔''

چڑھتے سورج کی سرزمین یعنی جاپان کا سفرنامہ بھی بڑا دلچسپ، سحر انگیز اور گھر بیٹھے جاپان کی سیر کروا دیتا ہے۔ جو کچھ دیکھا اور دل سے محسوس کیا اس کو بغیر کسی تامل کے، بغیر گھٹائے یا بڑھائے ،بغیر ہموار کئے ،بغیر مصلحت کے موزوں الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہر چیز ہر منظر ہر ملاقات کو بڑے دلفریب رنگ میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔25 ویں سلور

جو بلی جلسہ سالانہ میں شرکت کی روداد بڑی ایمان افروز ہے۔ لکھتی ہیں:

''اگر چہ 125 ملین آبادی والے ملک کے لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں مگر ابھی تک ان کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح قدرت کے حسین نظاروں سے بہت پیار ہے۔ ان کے تمام باغوں کی اتنی احتیاط سے منصوبہ بندی کی جاتی ہے کہ قدرت کی ہر خوبصورتی اور رنگ مربوط طریقے سے نظر آئے۔ چیری بلاسم Cherry Blossom ان کا قومی پھول ہے جو اپریل میں اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اس کو دیکھنے کیلئے ٹی وی پر اعلان کیا جاتا ہے کہ ان دنوں فلاں فلاں جگہ پر پھولوں کی بہار ہے وہاں جایئے۔ ہم چونکہ مئی میں گئے تھے اسلئے ہم نے کچھ بچی کھچی چیری بلاسم کی بہار ہم نے بھی دیکھ لی۔''

مضمون ''دلدار من'' ان کے شوہر نامدار کرنل دلدار احمد صاحب (ریٹائرڈ) اور ''میر اعلی'' ان کے لخت جگر علی کے بارے میں ہے۔ دلدار من میں جتنی باتیں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب حقیقت اور سچ پر مبنی ہیں۔ ان میں کوئی مبالغہ نہیں۔ راقم ان کا گواہ ہے۔ جب بھی ان سے عاجز کا واسطہ پڑا، ان کو خوش اخلاق، خوش لباس اور خوش خصال پایا۔ جو بھی ٹورنٹو مشن ہاؤس کسی کام سے آیا اس کا کام پوری تندہی اور دلجمعی سے کیا۔ عرصہ دراز تک جمعہ کے روز خطبہ سے پہلے دعائیہ اعلانات کرتے رہے۔ کسی نے سفر پر جانا ہوتا تو اس کیلئے تعارفی خط کر لکھ دیتے۔ محترم کرنل صاحب جماعت احمدیہ کے جن اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے وہ یہ ہیں: راولپنڈی میں نائب امیر اور ناظم انصار اللہ مقرر ہوئے۔ جلسہ سالانہ ربوہ پر نائب ناظر خدمت خلق، گھوڑ دوڑ میں چیف جج، حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اور خلافت رابعہ کے انتخاب کے موقعہ پر مکمل سکیورٹی انچارج، ممبر تحریک جدید، ممبر مجلس انتخاب خلافت۔ اس کے بعد

لاہور منتقل ہونے کے بعد ناظم انصار اللہ و نائب امیر کے طور پر خدمت سرانجام دیں۔

جماعت احمدیہ لاہور، مرکزی دعوت الی اللہ کے ممبر۔ 1991 میں کینیڈا ہجرت کرنے کے بعد سیکرٹری امور عامہ، مقرر ہوئے۔ 1992 میں حضور ایدہ اللہ نے ان کو سیکرٹری ٹورنٹو مشن ہاؤس مقرر فرمایا اور تیس سال تک آپ نے یہ فریضہ احسن طریق سے سرانجام دیا۔

ایک ماں اپنے لخت جگر، نورِ نظر کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگائیں:

"علی کیلئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں کچھ کچھ فرزانہ بھی ہوں اور کچھ کچھ دیوانہ بھی۔ مگر اس کے بھولے پن کی معصومیت، سادگی اور خلوص اتنی مٹھاس لئے ہوئے ہے کہ ہماری دنیا میں اصلی فرزانہ تو یہی آتا ہے۔ جس کے پیار اور محبت اور ہر ایک پر دل سے نچھاور ہونے کی خصوصیت سب کو اپنے حصار میں لئے رکھتی ہے۔ اس کے پیار کی چھاؤں میں سب ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ آج جو یہاں ہم سب بیٹھے ہیں تو اس عافیت میں علی کی شخصیت کا اہم کردار ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کے طفیل ہمارے یہاں کینیڈا آنے کا وسیلہ بنایا۔"

مندرجہ بالا عبارتوں کے مطالعہ سے جہاں مصنف کے اسلوب نگارش کی دل کشی سے انسان محظوظ ہوتا ہے وہیں ان کی اسلام اور احمدیت سے والہانہ لگاؤ، ان کی وسعت مطالعہ، ان کی وسعت نظری، ان کی بلندی فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف کے مضامین کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بات کہنے کے لئے جو لہجہ اپنایا ہے وہ اتنا سنجیدہ اور پر اثر ہے کہ قاری ان کی سحر انگیزی کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ یہ بات کہنے میں دو رائے نہیں کہ کتاب کے مطالعہ سے ان کی بصیرت، ان کی ژرف نگاہی کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ امید کی

جاتی ہے کہ باذوق قارئین محترمہ فرخ دلدار احمد کی کتاب ''بزم خیال'' کو کھلے ہاتھوں سے قبول کریں گے، اس کو پوری توجہ اور دل چسپی سے پڑھیں گے۔امید واثق ہے کہ اس سے ادب اور تہذیب کی روح افضاء خوشبو چارسو پھیلے گی اور فضا کو معطر کرے گی۔ان شاءاللہ۔

حقیر پر تقصیر

زکریا ورک   22 ستمبر 2022ء

مسپل (ٹورنٹو) کینیڈا

zakaria.virk@gmail.com

○○

عرض حال

آپ کی خدمت میں کچھ مضامین کے ساتھ حاضر ہوں۔ جہاں تک لکھنے لکھانے کا تعلق ہے تو زندگی میں کبھی لکھنے کیلئے ہر گز نہیں لکھا۔ضرورت وقت کے تحت مجبوراً لکھنا پڑتا رہا۔موبائیل فون کی ایجاد سے پہلے خطوط نویسی ایک مجبوری تھی۔فوجی کی بیوی تو سالوں اور مہینوں فقط خطوط پر ہی گزارا کرتی تھی جن میں سوائے بچوں اور حالات خانہ داری کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔کینیڈا آنے پر یہی سلسلہ والدین اور بچوں کیلئے مخصوص ہوا لیکن وہ خطوط واقعی دل سے لکھے تھے۔اور وطن اور گھر والوں کی اُداسی کا سوز اُن میں مستزاد تھا۔ویسے بھی وہ کینیڈا میں گزارے ہوئے 20 سالوں میں اپنے تجربات اور کینیڈا کی تاریخ پر مشتمل ایک خاصے کی چیز تھے جو والدین نے خطوط غالب کی طرح ہی سنبھالے ہوئے تھے مگر ان کے جانے کے بعد وہ بھی ضائع ہو گئے۔

کینیڈا میں آنے کے بعد جب زندگی میں کچھ ٹھہراؤ ملا تو اجلاسوں میں پڑھنے کیلئے جو موضوعات دئے جاتے تھے ان کے لئے اکثر مضامین لکھنے پڑے۔مگر پھر یہ اوراق کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا کے مصداق نہ جانے کہاں کھو گئے۔کچھ اِدھر اُدھر پرسوں میں پڑے رہ گئے۔بہر حال شعبۂ اشاعت نے اُن اوراق پراگندہ کو اکٹھا کر کے اُن کے سپرد کرنے کو کہا تو ہم نے جو کچھ دستیاب ہوا، لا حاضر کیا۔

اب وہی ریزہ ریزہ چُن کر اور پرو کر یا یوں کہئیے کہ گلدستہ بنا کر آپ کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ان مضامین میں مَیں نے موضوع کی سنجیدگی اور افادیت کو ملحوظ خاطر رکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ دلچسپی کا پہلو بھی رکھا تا کہ لوگوں پر بار خاطر نہ ہو۔اور ان سنجیدہ باتوں کو کچھ دوسرے

انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی تا کہ سماعت پر گراں نہ گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ پیغام بھی ہلکے پھلکے انداز میں پہنچ جائے ؛ جیسے درود شریف کے بارے میں، شغل صوتِ سرمدی، وقف جدید کے بارے میں مولوی صاحب اور تحریک جدید کے نئے انداز وغیرہ۔ کیونکہ میں تعلیم و تربیت کو ہمیشہ نرم ملائم اور ہنستے مسکراتے کرنے پر یقین رکھتی ہوں جو کہ انسانی ذہن پر زیادہ مثبت اثر چھوڑتا ہے۔

یہ تحریریں آپ کو خواتین کی خاکہ گری ہی نظر آئیں گی جن میں مَیں نے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ یا ایک طرح سے مضرابِ لجنہ بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنی طرز کا ساز چھیڑے ہوئے ہے۔ مگر شاید مجموعی طور پر قابل قبول ہو۔ اُمید کرتی ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ ویسے بھی یہ سال لجنہ جوبلی کا سال ہے ۔ یہ میری طرف سے جوبلی کا تحفہ بھی ہے۔ گر قبول افتد زھے عزو شرف۔

فقط والسلام

فرخ دلدار

15/جنوری 2023ء

○○

سیرت نگاری

حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ آف ادرحمہ

ضلع سرگودھا کی تحصیل بھلوال میں ''چاوہ'' اورللیانی کا علاقہ ریڈ بلڈ مالٹوں اور کنو کی پیداوار کیلئے دنیا کا ایک منفرد علاقہ مانا جاتا ہے۔اُسی چاوہ کی ثمر بار زمین سے عالم احمدیت کو وہ شیریں پھل عطا ہوا جس کی شیرینی آج دُنیا کے ہر حصے میں پھیلی ہے۔ادرحمہ کی جماعت کے افراد آج دنیا کے ہر حصے میں اپنے اس شجر سایہ دار حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ کو یاد کرتے ہیں۔جس ایک شخص کی قبولِ احمدیت سے پورا گاؤں احمدی ہوگیا اور وہاں احمدیت ایک مضبوط بنیاد پر قائم ہوکر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی منادی بن گئی۔

حضرت مولوی نظام الدین صاحب ایک عالم دین گھرانے میں حضرت غلام مصطفیٰ صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔یہ رانجھا قوم کا ایک علم دوست گھرانہ تھا۔جہاں یکے بعد دیگرے دینی علوم کے جاننے والے پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔مولوی نظام الدین اور ان کے چھوٹے بھائی حکیم شیر محمد صاحب اپنے وقت کے جید اور معتبر عالم تھے اور اپنے علاقہ میں جانے پہچانے اور محترم تھے۔مولوی نظام الدین میرے نانا جان حافظ عبدالعلیٰ صاحبؓ اور مولوی شیر علی صاحبؓ کے والد گرامی تھے اور میری دادی جان عصمت بی بی بنت حکیم شیر علی صاحبؓ کے حقیقی چچا تھے۔چونکہ اس خاندان میں علم و فضل کا ہمیشہ سے چرچا رہا تھا تو اس بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے

والد غلام مصطفیٰ صاحب کے ساتھ باہر اپنی زمینوں پر گئے اور اپنی لہلہاتی فصلوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کا ذکر اپنے والد سے کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ:

''یہ ہمارا ورثہ نہیں، ہمارا ورثہ علم ہے۔ ہمیں زمین نہیں علم چاہئے۔''

یہ بات اُن کے دل کو لگ گئی۔ اُن کی شادی بھی چاوہ کے ایک علم دوست گھرانے میں ہوئی۔ جن میں حفاظ کی اکثریت تھی۔ ان کی بیگم بھی حافظہ قرآن تھیں اور نہایت نیک اور نرم دل خاتون تھیں۔ وہ اپنے والد کی دو ہی بیٹیاں تھیں چنانچہ زمین دونوں بیٹیوں کو ہی ملنی تھی تو اُنہیں تین مربع زمین بیوی کی طرف سے وراثت میں ملی۔ مگر انہوں نے زمین لینے سے صاف انکار کر دیا کہ زمین میرا مقصد نہیں ہے۔ چنانچہ وہ حصول تعلیم کیلئے دور دراز مقامات پر جاتے رہے۔ پشاور میں بھی ایک مشہور استاد سے زانوئے تلمذ طے کیا اور آخر میں آ کر اس علاقے کے پیر سیال شریف کے مرید ہو گئے۔ پیر صاحب جو خود ایک متقی اور عالم باعمل تھے۔ ان کی تربیت اور تعلیم بہت اعلیٰ رنگ میں کی۔ پیر صاحب کے متعلق مولوی نظام الدین صاحب کی روایت ہے کہ وہ اپنے کھیت میں خود ہل چلا کر اور ذاتی کنوئیں کا پانی دے کر گندم اگاتے تھے۔ کہتے تھے کہ رزق حلال خود کما کر کھانا چاہئے اور یہی محنت اور تقویٰ کی تربیت اپنے شاگردوں اور طالبعلموں کو بھی دی۔ حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ قرآن، حدیث، عربی فارسی اور طب میں دسترس رکھتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو تمام مروجہ تعلیم میں مہارت تھی۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں میں نے خود دیکھی اور پڑھی ہیں۔ ہمارے نانا جان حافظ عبدالعلی صاحبؓ

کے گھر میں یہ کتب خانہ تھا اور یہ کتابیں گرمیوں میں باہر دھوپ میں سکھائی جاتی تھیں تا کہ دیمک نہ لگ جائے۔ بڑی بڑی رجسٹر نما کتابیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے صفحوں پر سُرخ اور سنہرے حاشیوں کے ساتھ کالی سیاہی سے لکھی ہوتی تھیں۔حاشیوں پر کچھ نوٹس اور وضاحتیں بھی ہوتی تھیں۔عناوین بھی سُرخ سیاہی سے لکھے ہوتے تھے۔فارسی زبان میں فقہ،طب اور مذہبی مسائل پر لکھی ہوئی تھیں۔

اُن کے مُرشد پیر سیال صاحب بہت صاحب طریقت بزرگ تھے۔انہوں نے اُن کی علمی اور روحانی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اُس زمانے کے تمام منازل سلوک انہیں طے کروائے۔

حضرت مولوی نظام الدین صاحبؒ نے بچپن میں اپنی والدہ کی وفات کے بعد ادرحمہ میں اپنے ننھیال کے ہاں پرورش پائی اور انہوں نے بھی اپنے نواسے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ چنانچہ حصول تعلیم کے بعد وہ مستقل طور پر ادرحمہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ادرحمہ میں مسجد بنوائی اور خود اس کے امام ہوئے۔ جہاں ہر وقت قرآن کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔اپنے بیٹے اور بھتیجے کو قرآن حفظ کروایا۔ نوافل،تہجد، اشراق ، چاشت اور اوّابین ہمارے خاندان میں اُن کی روایت ہے۔ روحانی طور پر بھی بہت اعلیٰ مقام پر تھے۔لوگ اُن کو اپنا دینی رہنما مانتے تھے۔ سچی خوابیں ، روحوں سے ملاقاتیں اور دوسری کئی کرامات بھی ہمارے بزرگ ہمیں سناتے تھے۔روحانی معاملات میں کئی روایات حضرت مولوی غلام رسول صاحب راجیکیؒ سے بہت ملتی جلتی ہیں۔

اُن کی شخصیت میں ایک قدرتی رعب تھا اور لوگوں کے دلوں میں اُن کی عزت اور وقار تھا۔ ویسے بھی بہت لمبے قد کے جسیم آدمی تھے۔ ہاتھ میں ایک عصا رکھتے تھے۔ کہیں کوئی لڑائی جھگڑا یا غلط بات دیکھتے تو سختی سے منع کرتے اور صلح صفائی کرواتے۔ اُن کی بھتیجی جو حکیم شیر محمد آف ہجن کی بیٹی تھی کو حکیم صاحب موصوف کی وفات کے بعد حضرت مولوی نظام الدین صاحب ؓ (عرف باواجی) اپنے گھر لے آئے اور پرورش کی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میرے باواجی حضرت عمر ؓ جیسے رعب والے تھے۔ ویسے بھی لمبے قد کے جسیم آدمی تھے۔ دونوں بیٹوں کا قد کاٹھ اپنے والد پر تھا۔ نئی نسل میں میرے بیٹے علی کو اُن دونوں بھائیوں کی طرح کہا جاتا ہے۔

اُن کی قبولِ احمدیت کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اُس زمانے کے تمام عالمِ دین یہ تو جانتے تھے کہ یہ وقت امام مہدی کے ظہور کا ہے۔ تمام نشانیاں بھی پوری ہو چکی ہیں لیکن پرانے اعتقاد کے مطابق حضرت عیسیٰ کے آسمان سے اُترنے کے منتظر بھی تھے۔ اس اثنا میں اُن کے بھائی حضرت حکیم شیر محمد صاحب ؓ، حضرت مولانا حکیم نورالدین خلیفۃ المسیح اوّل ؓ کے ہم جلیس ہونے کی وجہ سے احمدیت پر ایمان لا چکے تھے اور اُس کے بعد اُن کے بیٹے حافظ عبد العلیٰ ؓ بھی۔ دونوں 313 صحابہ کبار میں سے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے حضرت مولوی نظام الدین صاحب ؓ کو بھی پیغام حق پہنچانے اور احمدیت کے مسائل علمی رنگ میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کی۔ تینوں جید عالم تھے اس لئے ادرحمہ کی مسجد میں اکٹھے بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتے اور یہ گفتگو اتنا طول کھینچ جاتی کہ صبح سے شام تک مختلف مسائل زیر بحث آتے۔ الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ دونوں طرف

کتابوں کا انبار لگ جاتا۔قرآن کی آیات پرغوروتدبر ہوتا رہتا۔ چنانچہ ایک رات قرآن کی آیت پرغور کرتے ہوئے شرح صدر ہوئی اور پکار اُٹھے کہ یہ سچ ہے۔ چنانچہ صبح اُٹھ کر قادیان جانے کا فیصلہ کیا اور جا کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر آئے اور آ کر مسجد میں اعلان کیا کہ لوگو! میں تو امام مہدی اور مسیح پر ایمان لے آیا ہوں۔ اگر آپ چاہوتو میرے پیچھے نماز پڑھو ورنہ آپ کی مرضی۔ لوگوں کو آپ کے تقویٰ اور علم پر اتنا ایمان تھا کہ یک زبان ہوکر بولے:

''مولوی جی جتھے تُسی او تھے اسیں''یعنی جو آپ کا ایمان ہو وہ ہمارا ایمان ہے۔

چنانچہ اس پر تمام گاؤں ایمان لے آیا اور آج تک یہ گاؤں احمدی گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔اس بات میں ایک مرکزی نقطہ یہ ہے کہ بھائی اور دونوں بیٹے احمدی ہوئے مگر زیادہ لوگ احمدی نہیں ہوئے مگر جونہی یہ ایک شخص ایمان لے آیا تو پورا گاؤں پورے وثوق سے احمدی ہوگیا۔ اس سے اُن کے علم وفراست روحانی بلندی اور تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر روشنی پڑتی ہے۔اس لحاظ سے بھی ہم ان کو اپنے علاقے کا سرسید کہتے ہیں۔

دوسری وجہ سرسید کہنے کی یہ ہے کہ علم دوست گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خود بھی دور دور جا کر علم حاصل کیا اور پھر یہ درس و تدریس کا سلسلہ آگے بھی جاری رکھا۔ گاؤں میں سب کو قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے۔ بیٹے اور بھانجے کو حفظ بھی کروایا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے دونوں بیٹوں کو جو صرف یہی اولاد تھے اتنی چھوٹی سی عمر بھیرہ پڑھنے کیلئے بھجوا دیا اور اسی طرح اپنے ایک بھانجے کو بھی۔ تمام عمر اُن کی جدائی

برداشت کی مگر اس معاملہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ہمارے نانا جان حضرت حافظ عبدالعلیٰ صاحبؒ اور اُن کے بھانجے دل احمد صاحب 1889ء میں علی گڑھ جا بھی چکے تھے۔ پھر مولوی شیر علی صاحب کو ایف سی کالج لاہور سے بی اے کروایا۔ ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ اتنے محدود ذرائع آمدنی میں سے انہوں نے کس طرح یہ خرچ برداشت کئے ہوں گے اور پھر اتنے پسماندہ سے علاقے میں رہنے کے باوجود یہ آگاہی تھی کہ اب یہ نئے علوم کا زمانہ ہے اور نئے زمانے کے مطابق ہوگا۔ اُس وقت کے رؤسا اور پڑھے لکھے لوگ تو بچوں کو علی گڑھ بھجوا ہی رہے تھے۔ مگر اس زمانے میں ادرحمہ جیسی دور افتادہ جگہ پر یہ سوچ اور دور اندیشی رکھتے تھے کہ اب ہمیں اس نہج پر پڑھنا ہے اور اس وقت کوئی ایسے ذرائع آمد و رفت بھی نہیں تھے جبکہ ہمارے گاؤں ادرحمہ میں پکی سڑک 90 کی دہائی میں بنی ہے۔

ادرحمہ میں ویسے بھی اس قدر علم پھیلا یا کہ آس پاس کے دیہات میں یہ بات مشہور تھی کہ ادرحمہ کے تو ''ڈھگے'' بھی پڑھے ہوئے ہیں (ڈھگے یعنی بیل) اس بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ آس پاس کے دیہات کے لوگ اپنے خط وغیرہ پڑھوانے کیلئے ادرحمہ ہی آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ موضع نورانوالی کا ایک شخص ایک خط پڑھوانے کیلئے ادرحمہ جا رہا تھا۔ دونوں گاؤں کے درمیان ڈیڑھ دو میل کا ہی فاصلہ ہے۔ سڑک کے کنارے ایک کسان ہل چلا رہا تھا اُس کا حقہ سڑک پر پڑا تھا۔ وہ آدمی حقہ پینے کیلئے بیٹھ گیا۔ کسان نے اُس کا نام لیکر پوچھا کہ کہاں چلے ہو۔ کہنے لگا ڈاکیہ ایک خط دے گیا ہے۔ پڑھانے کیلئے تمہارے پِنڈ جا رہا ہوں۔ کسان نے کہا دکھاؤ تو سہی؟ خط پڑھ کر

اس شخص سے کہا پریشان کیوں ہو! یہ تحصیلدار صاحب کی طرف سے رسید ہے کہ تمہارا سارا مالیہ وصول ہوگیا ہے۔ وہ شخص مطمئن ہوکر واپس اپنے گاؤں مورانوالی چلا گیا۔ گھر والوں نے جلد واپس آنے کا سبب پوچھا تو کہا کہ:

''ادرحمہ میں تو ''ڈھگے بھی پڑھے ہوئے ہیں۔''

راستے میں ہی ادرحمہ کا فلاں کسان ہل چلا رہا تھا اُس نے خط پڑھ دیا اور میں واپس آ گیا ہوں۔ اور واقعی جب شادی کے بعد میں ادرحمہ جا کر رہتی تھی تو احساس ہوتا تھا کہ عمومی ماحول نیکی اور علم کا ہے۔ لوگ عمومی طور پر پڑھے لکھے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے کہ ایک دفعہ گنتی کی گئی تو پتہ چلا کہ ادرحمہ سے 34 اساتذہ آس پاس کے دیہات کے سکولوں میں پڑھانے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک رمضان کے مہینے میں مجھے ساتھ ایک گاؤں میں کسی کام سے جا کر رہنا پڑا تو مجھے لگا کہ کسی جاہلیت کے گڑھ میں آ گئی ہوں۔ خاموش رمضان جہاں صبح ایک اذان اور ڈھول کی تھاپ پر روزہ کی سحری اور افطاری کا احساس سا ہوتا تھا اور نہ کوئی خاص رمضان کی گہما گہمی ہی نہ تھی جبکہ ادرحمہ میں رمضان ایک بولتا ہوا روحانی رمضان ہوتا تھا جہاں مسجد سے اذانیں، تہجد، نوافل، درس اور گہما گہمی نظر آتی تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ آس پاس کے علاقے میں تو ادرحمہ ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور مسجد اس کا کیمپس ہے۔

آج بھی ادرحمہ کی بیت الفتوح کی طرز پر بنائی ہوئی 3 منزلہ بلند و بالا اور وسیع مسجد جو آپ کی بنائی ہوئی مسجد کی جگہ پر ہی بنی ہے دنیا کی تمام نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ بلند کھڑی ہے مگر ہمارے مسلمانوں نے اُسے متروک شدہ اور بند ہی کر دیا ہے۔ انا للہ وانا

الیہ راجعون۔

حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ کا ذکر حقیقۃ الوحی کے صفحہ نمبر 529 پر حضرت نظام الدین صاحبؓ ادرحمہ، شاہپور کے نام سے درج ہے کیونکہ آپ بھی اُس آسمانی نشان کے شاہد تھے جس کا الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہوا تھا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو 27 مارچ 1907ء کو الہام ہوا کہ 25 دن تک یعنی 7 مارچ 1907ء سے لیکر 31 مارچ 1907ء تک جو 25 دن کا عرصہ بنتا ہے کوئی نیا واقعہ ظاہر ہونے والا ہے۔ چنانچہ ٹھیک 31 مارچ 1907ء کو ایک بڑا شعلہ آسمانی آسمان پر ظاہر ہوا۔ عصر کے وقت ایک آگ کا بڑا شعلہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر زمین پر گرا، جس کو مشرق و مغرب میں بہت سے لوگوں نے دیکھا۔ اس کے ایک شاہد حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ بھی تھے جس کا ذکر حقیقۃ الوحی میں حضرت مسیح موعودؑ نے صفحہ 529 پر کیا ہے۔

حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ کے والد حضرت غلام مصطفیٰ صاحب کا یہ فقرہ کہ ''زمین نہیں علم ہماری میراث ہے'' تو ان کے اس فرمانبردار بیٹے نے اسے نہ صرف اپنا نصب العین بنایا بلکہ چاروں اکناف میں یہ روحانی علم پھیلانے کا موجب بھی ہوئے۔ میں سمجھتی ہوں حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ نے جب اُس وقت انگریزوں کے دیئے ہوئے سیشن جج کے عہدے کو حقیر سمجھتے ہوئے مسیح الزماں کی غلامی قبول کی اور پھر قرآن کریم کے شاندار ترجمے سے تمام یورپ اور مغربی ممالک میں یہ آسمانی روحانی علم پھیلا دیا۔ اور آج جبکہ یہاں کی نئی نسل یہی قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتی ہے تو میرا ذہن

پھر اپنے اُن آباء کی طرف جاتا ہے کہ اُن کی یہ علمی میراث آج تمام دنیا میں قرآن کریم کے ترجمے کی صورت میں وہی روشنی پھیلا رہی ہے جو ہمارے ان بزرگوں کی خواہش تھی۔ الحمدللہ علی ذالک۔

○○

حضرت حافظ عبد العلی صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
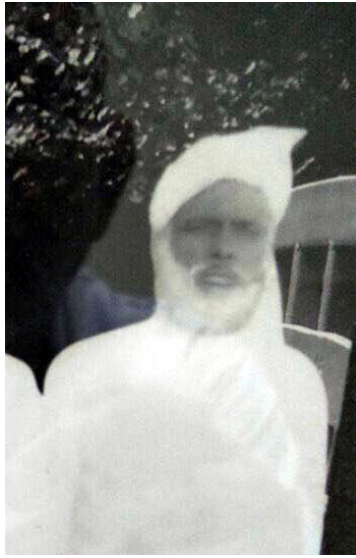
خدا تعالیٰ جب کسی کو خاص کام کیلئے چن لیتا ہے تو اُن سے کوئی خصوصی ایسے کام کروالیتا ہے جو صدقہ جاریہ اور افادۂ عام کا کام کرتے ہیں۔ حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ بھی صحابہ مسیح موعودؑ میں ایسا ہی شہرتِ دوام کا مقام پا گئے۔ مگر یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خاموشی سے خدا تعالیٰ کو خوش کرتے ہیں اور بظاہر اتنا اثر نہیں چھوڑتے مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اور اُس کی نسل کیلئے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

آج میں ایسی ہی ایک شخصیت اپنے نانا جان حضرت حافظ عبد العلی صاحب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ بیان کروں گی جو مولوی شیر علی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ مولوی شیر علی صاحب نے قرآن کریم کے انگلش ترجمے کی صورت میں قرآنی انوار نئی نسل کیلئے پھیلائے اور حضرت حافظ عبد العلیٰ صاحبؓ نے قرآن حفظ کیا، پڑھایا اور سنایا اور اپنے چھ بچوں کے دلوں میں قرآن کی محبت اسقدر راسخ کر دی کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمارا سارا خاندان قرآن کی محبت کے ساتھ اُس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق پاتا

ہے۔الحمدللہ۔

حضرت حافظ عبدالعلیٰ صاحب ؓ ادرحمہ ضلع سرگودھا (جو اُس زمانے میں موضع عبدالرحمن ضلع شاہپور کہلاتا تھا) میں مولوی نظام الدین ؓ کے ہاں جٹ رانجھا برادری میں پیدا ہوئے۔ والدہ بھی حافظہ قرآن تھیں اور آپ خود بھی حافظِ قرآن تھے۔ حضرت مولوی صاحب نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرلیا تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی مولوی شیر علی ؓ کے ساتھ گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ گئے۔ پھر مزید تعلیم کیلئے علی گڑھ تشریف لے گئے اور بی.اے.ایل.ایل.بی کی تعلیم حاصل کی۔

اپنے چچا حکیم شیر محمد آف ہجّن اور حضرت خلیفہ اوّل ؓ کی تبلیغ سے آپ اور آپ کے چچا مولوی غلام نبی صاحب ؓ مشرف بہ احمدیت ہوئے۔ 19 سال کی عمر میں آپ علی گڑھ جانے سے پہلے بیعت کرچکے تھے اور 313 اوّلین بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔ انجام آتھم میں آپ کا نام میاں عبدالعلیٰ موضع عبدالرحمن ضلع شاہپور کے نام سے بیعت نمبر 140 میں لکھا ہے۔

حضرت اقدس علیہ السلام نے کتاب البرّیہ میں آپ کا ذکر اپنی خاص پرامن جماعت میں میاں عبدالعلیٰ محمڈن کالج علی گڑھ کے نام سے کیا ہے۔ حضرت اقدس علیہ السلام سے بہت اخلاص کا تعلق تھا۔ ایک دفعہ 1896 کے موسم گرما میں ظہر سے پہلے تخلیہ میں چھوٹی مسجد میں حضور ؑ نے آپ سے ایک انگریزی کتاب سنی جو کسی یہودی نے عیسائیت کے ردّ میں لکھی تھی۔

حضرت مولوی صاحب بوقتِ خطبہ الہامیہ مجلس میں موجود تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ خطبہ کے وقت حضورؑ کے چہرے پر نظر نہیں ٹکتی تھی۔ حضورؑ کی آواز بدلی ہوئی تھی اور ایک خاص جلالی نشان کے ساتھ الفاظ آپکے منہ سے ادا ہو رہے تھے، جن کی کیفیات بیان نہیں ہوسکتیں۔ خطبہ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک آدمی درد بھری داستان سُن کر روسکتا ہے اور ایک درد بھرا منظر دیکھ کر آنسو بہا سکتا ہے مگر خدا کے حضور وہ رونا قابل قدر ہے جو اُس کی خشیت کے ماتحت رویا جائے۔ خطبہ الہامیہ 1904ء میں حضرت اقدس علیہ السلام نے مسجدِ اقصیٰ میں پڑھا۔

مولانا جلال الدین شمس صاحب نے حافظ صاحب کا ذکر حضرت اقدس کے معاصر علماء میں کیا ہے جنہوں نے حضرت اقدسؑ کی بیعت کی۔

دونوں بھائی دیگر علوم کے علاوہ انگریزی زبان میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ نانا جان کو درس وتدریس کا ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ جس کو بھی پڑھایا اُسے علم وفضل میں طاق کر دیا۔ یہی ملکہ آگے ان کی بیٹیوں میں بھی آیا۔ جن دنوں مولوی شیر علی صاحب ایف سی کالج میں پڑھ رہے تھے تو آخری سال میں بہت بیمار ہو گئے۔ حافظ عبدالعلی بھائی کی تیمارداری کرتے۔ یخنی بنا بنا کر پلاتے اور پھر سب کورس کی کتابیں اُن کو پڑھاتے۔ مولوی صاحب نے اس طرح پڑھ کر بی اے میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی۔ گورنمنٹ کی طرف سے انہیں ڈائریکٹ سیشن جج کی آفر ہوئی مگر ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

کے مصداق بنتے ہوئے مولوی شیر علی صاحب نے وہ خط پھاڑ کر پھینک دیا اور

وقت کے امام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں جا کر حاضر ہو گئے۔

حضرت حافظ عبد العلی صاحب ؓ اپنے چھوٹے بھائی مولوی شیر علی صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا مولوی صاحب تو آپ نے جواب دیا کہ عمر میں مَیں بڑا ہوں مگر ویسے وہ بڑے ہیں۔

حدیث مبارکہ ہے کہ جس نے اپنی دو بیٹیوں کی تربیت کی اُس نے جنت میں اپنا گھر بنایا۔ بیٹیاں ایک نسل کی تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں اور اچھی نسلیں اچھی ماؤں سے پروان چڑھتی ہیں۔

ہمارے نانا جان کا ایک بیٹا اور 5 بیٹیاں تھیں (دو بیٹے یکے بعد دیگرے گیارہ بارہ سال کی عمروں میں وفات پا گئے جس کا غم انہوں نے صبر سے برداشت کیا)

یہ وہ زمانہ تھا کہ بیٹیاں ویسے ہی پسندیدہ نہیں ہوتی تھیں اور پھر خاص طور پر اُس علاقے اور اُس دور میں بیٹیوں کو پڑھانا ایک بہت ہی امرِ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جس طرح ان کے والد صاحب مولوی نظام الدین صاحب نے دنیا حاصل کرنے کی بجائے علم حاصل کرنے اور پھیلانے کو ترجیح دی اُسی طرح حافظ عبد العلی صاحب نے بھی اپنی بیٹیوں کو بے حد مخالف حالات کے باوجود پڑھایا اور اس زمانے کے مطابق اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اُن کی دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

انہوں نے 1920ء سے ہی سرکاری سکولوں میں پڑھایا۔ پھر اپنی دو بیٹیوں کو لاہور بھیج کر اعلیٰ تعلیم دلوائی اور مولوی فاضل بھی کروایا۔ اُس زمانے میں پورے سرگودھا شہر میں زنانہ سکول میں مسلمان خاندانوں کی صرف چند لڑکیاں پڑھتی تھیں۔

مسلمان لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا اور بہت مخالفت تھی۔عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پڑھ لکھ کر لڑکیاں آزاد ہو جاتی ہیں مگر نانا جان اس کے مخالف تھے لیکن ان کو یہ خیال بھی رہتا تھا کہ اسطرح لڑکیوں کو گھر میں قید کر کے رکھنا بھی مناسب نہیں ۔ چنانچہ آپ اپنی بیٹیوں کو لیکر خود سیر کروانے کیلئے نکلتے اور سرگودھا کے نواحی باغات میں لے جاتے۔(جس پر ہمارے ماموں جان سخت چڑتے اور ناراض ہوتے) رستہ میں ان کی تربیت اور پڑھائی جاری رہتی۔

انگلش گرائمر ولٹریچر کے علاوہ قرآنی آیات اور سورتیں ترجمہ کے ساتھ یاد کرواتے اور سنتے۔ چنانچہ ہماری تمام خالاؤں کو قرآن مجید کی لمبی سورتیں اکثر یاد تھیں اور دینی علوم کا وسیع ذخیرہ تھا۔اس کے علاوہ انگلش اُردو، فارسی،حساب،الجبراء، جومیٹری اور جغرافیہ میں اُن سے بڑا عالم ہم آج کل کے بہت تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی نہیں دیکھتے۔ ہماری تمام خالاؤں اور امی جان کو تدریس کا ملکہ اپنے والد سے ملا تھا۔ چنانچہ حساب، الجبراء، جومیٹری اتنی مہارت سے پڑھایا کرتیں کہ جس نے بھی پڑھا اُس میں طاق ہوگیا۔جغرافیہ ایسا کہ دنیا کے نقشے کا کوئی ملک،اس کا محل وقوع،آب و ہوا اور خطہ سب از بر بتادیا کرتی تھیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا مطالعہ وسیع تھا اور سعدی و رومی کے اشعار اکثر پڑھا کرتی تھیں۔اجلاسوں میں ہماری خالاؤں کی تقریریں اوّل نمبر پر ہوتیں۔سیرت النبیؐ کے جلسے میں خالا جان روشن کی تقریر لوگ خاص طور پر سننے کیلئے آتے تھے۔تمام جماعتی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی اور اکثر بطور صدر کام کرنے والی ہوئیں۔

گھریلو کام کاج اور سلیقے میں بھی اعلیٰ تھیں۔ اور یہ سب ہمارے نانا جان کی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اس پسماندہ علاقے اور وقت میں اپنی بچیوں کو زندگی کے ہر شعبے میں زمانے کے ہم قدم رکھا۔ اُن کی تین بیٹیوں نے تدریس کے شعبے میں کام کیا اور ایک خالہ کی پہلی تعیناتی ہی بطور ہیڈ مسٹریس ہوئی۔

اس کے علاوہ ہم نے اپنی ننہال میں گلہ شکوہ اور غیبت کا کوئی رجحان نہیں دیکھا۔ اس لحاظ سے ہماری خالاؤں کی محفلیں کچھ ''پھیکی'' ہی ہوتی تھیں۔ کوئی غیبت یا لوگوں پر تبصرہ تنقید یا ہنسی اُڑانا سب ناپید ہوتا تھا۔ صرف جماعتی یا نیکی اور احمدیت کی ہی باتیں ہوتی تھیں جو بچپن میں تو اپنے سر سے ہی گزرتی تھیں۔

حضرت حافظ عبد العلی صاحبؓ سرگودھا کے پہلے مسلمان وکیل تھے۔ لمبا عرصہ سرگودھا کے امیر جماعت رہے۔ مسجد میں باقاعدگی سے نمازوں کی امامت اور رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے۔ آپ متقی، عالم باعمل، صراطِ مستقیم پر چلنے والے نیک نفس اور امین شخص تھے۔ لوگ اکثر ان کے پاس اپنی امانتیں رکھوایا کرتے تھے۔ پارٹیشن کے وقت اُن کے ہندو دوست بھائی سنتوش جی اور دوسرے دوستوں نے اپنے گھروں کی کنجیاں اُن کے سپرد کردیں کہ اگر واپس آگئے تو آپ سے لے لیں گے ورنہ آپ خود رکھیں۔ اسی طرح کئی دوستوں نے سونا اور دیگر قیمتی سامان رکھوایا۔ اور اگرچہ اُن کی اپنی بیٹی (میری والدہ) قادیان سے مہاجر ہوکر ان کے پاس رہنے کیلئے آرہی تھیں مگر آپ نے یہ خود رکھنا گوارا نہ کیا۔ اور سونا اور گھروں کی چابیاں اور سب سامان گورنمنٹ کے سپرد کردیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ گورنمنٹ کی امانت ہے۔ وہ جس طرح چاہے تقسیم

کرے۔ جبکہ اپنی بیٹی کو اتنا عرصہ اپنے میکے میں ہی رہنا پڑا اور ہمارے والدین 1955ء میں خود اپنی محنت سے کما کر مکان بنوا سکے۔

مہمان نوازی، خدمت خلق اور والدین کی خدمت کا بھی حق ادا کیا۔اُن کے پاس آس پاس کے دیہات سے مقدمات والے اور دیگر اپنے مختلف کاموں کیلئے لوگ آتے تھے تو ان سب کی مہمان نوازی کے ساتھ ان کے کاموں میں مدد کرتے۔امیر جماعت کی حیثیت سے بھی لمبا عرصہ خدمات سرانجام دیں۔ ایک بامقصد اور فعال زندگی گزارنے کی توفیق ملی۔خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

ایک عالم باعمل باپ اور حافظ قرآن والدہ کی آغوش میں پلنے والے یہ دونوں گوہرِ آبدار بھائی اپنے اپنے انداز میں اپنے ماحول میں چمکے اور اپنی نسلوں کے لئے ہدایت کا باعث ہو گئے۔

ہمیں الفضل آن لائن حضرت حافظ عبدالعلی صاحبؓ کے بارے میں ایک مضمون پڑھنے کو ملا جس سے ہمیں بھی اُن کے بارے میں کئی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔

یہ مضمون مکرم غلام مصباح بلوچ صاحب، استاد جامعہ احمدیہ کینیڈا کا تحریر کردہ ہے جو کہ روزنامہ الفضل آن لائن لندن کی 15 ستمبر 2022ء کی اشاعت میں طبع ہوا ہے۔ قارئین کے استفادہ کیلئے روزنامہ الفضل کے شکریہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔جزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

حضرت حافظ عبدالعلی رضی اللہ عنہ ولد حضرت مولوی نظام الدین رضی اللہ قوم جٹ رانجھا پیشہ زمینداری موضع ادرحمہ ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ آپ اندازاً 1874ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان میں احمدیت کی توفیق سب سے پہلے آپ کے چچا حضرت مولوی شیر محمد رضی اللہ عنہ آف ہجن یکے از 313 صحابہ (بیعت: 7ر ستمبر 1889ء۔ وفات: 1904ء) کونصیب ہوئی، جس کے بعد آپ کا گھرانہ بھی داخل احمدیت ہوگیا۔ آپ کے والد حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ اور والدہ حضرت گوہر بی بی صاحبہؓ بھی اصحاب احمد میں سے تھے۔ اسی طرح چھوٹے بھائی حضرت مولوی شیر علی رضی اللہ عنہ بھی سلسلہ احمدیہ کے ایک درخشندہ گوہر تھے۔

حضرت حافظ عبدالعلی رضی اللہ عنہ نے بفضلہٖ تعالیٰ ابتدائی عمر میں قرآن کریم حفظ کرنے کی توفیق پائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی میں چلے گئے جس کے بعد لاہور سے وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے مئی 1893ء میں برموقع مباحثہ مابین حضرت مسیح موعود علیہ السلام وعبداللہ آتھم بمقام امرتسر بیعت کی توفیق پائی۔ بیعت کے چند دن بعد علی گڑھ ایف اے میں داخلے کے لیے چلے گئے۔ (الحکم 28ر جنوری 1943ء صفحہ 8۔ رجسٹر روایات صحابہ نمبر 3 صفحہ 144) آپ اپنی بیان کردہ روایات میں فرماتے ہیں:

''مباحثہ مذکورہ میں عاجز بھی شامل تھا۔ حضور کو اپنے دعاوی کے اثبات میں قرآن شریف کی آیات از بر یاد تھیں۔ پوری یاد تھیں۔ عاجز اور ایک اور حافظ کا یہ کام تھا کہ حضور کو سیپارہ، سورۃ اور رکوع کا پتہ عرض کردیں۔ غالباً قرآن شریف کھول کر وہ جگہ نکال

کر پیش کر دیتے۔ عاجز چند دن کے بعد علی گڑھ ایف۔اے میں داخل ہونے کے لئے چلا گیا۔

ڈاکٹر مارٹن کلارک والے مقدمہ اقدام قتل میں ایک دفعہ حضور کپتان ڈگلس کے سامنے بمقام بٹالہ پیش تھے۔ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔حضور نے نماز پڑھنے کے لئے عدالت سے اجازت چاہی۔عدالت نے اجازت دے دی۔حضور بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ عرصہ (غالباً بیس سال فرمایا) ہوا۔مجھے ایک خواب آئی تھی کہ میں ایک بادشاہ یا حاکم کے روبرو پیش ہوں۔نماز کا وقت آ گیا۔میں نے اس سے نماز کی اجازت چاہی۔اس نے مجھے اجازت دے دی۔آج وہ خواب میری پوری ہوئی۔میں اس وقت موجود تھا۔جب آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

اسی مقدمہ کے دوران میں آپ گورداسپورہ بمع خدام تشریف رکھتے تھے علی احمد صاحب وکیل کی کوٹھی پر۔آپ کے اردگرد بہت خدام بیٹھتے۔آپ خلوت کو بہت پسند فرماتے۔چھوٹی سی کوٹھی تھی۔آپ خلوت کے حصول کے لئے چھوٹے کمروں میں تشریف لے جاتے۔

اسی مقدمہ میں ''مارٹینو'' (Martinow) مجسٹریٹ ضلع امرتسر نے آپ کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کئے۔اسی اثناء میں وہ مقدمہ عدالت ضلع گورداسپورہ میں قانونی بناپر تبدیل ہو گیا۔وارنٹ گرفتاری منسوخ ہو گئے۔معمولی اطلاع نامہ کے ذریعہ اطلاع یابی ہوئی۔آپ کو حالات معلوم ہوئے۔آپ فرماتے کہ:

''راہ خدا میں ہم ہتھکڑی کو سونے کا کنگن خیال کرتے اور خوش ہوتے اور خوشی سے

پہنتے۔‘‘

یہ ارشادات آپ نے نچلے گول کمرے میں فرمائے۔

آپ شام کا کھانا بمعہ خدام چھوٹی مسجد کے چھت پر تناول فرماتے۔ میں بھی کئی دفعہ پاس بیٹھنے کا شرف حاصل کرتا آپ تھوڑا سا کھانا کھاتے۔

ایک دفعہ موسم گرما میں ظہر سے پہلے تخلیہ میں چھوٹی مسجد میں حضور نے مجھ سے ایک کتاب (انگریزی) سنی۔ چند دن کے لئے ایسا ہوا۔ یہ کتاب کسی یہودی نے عیسائیت کے ردّ میں لکھی تھی۔ یہ غالباً 98ء کی بات ہے۔

آپ نہایت اعلیٰ اخلاق رکھتے تھے۔ ایک دفعہ بعد از نماز صبح سیر کے لئے باہر تشریف لائے۔ مرزا نظام الدین صاحب کے مکان کے بڑے دروازے کے سامنے ایک چبوترہ تھا۔ وہاں آپ کا ایک غریب اور عاجز سا خادم بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت معمولی اس کی پوشاک اور حالت تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ بخار کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا۔ حضور! بخار فلاں وقت ہوجاتا ہے۔ آپ خود اندر تشریف لے گئے۔ ایک گلاس دودھ اور ایک گولی کونین لے آئے اور اسے دونوں چیزیں استعمال کے لئے دے دیں۔

آپ کا اسوۂ حسنہ یہ تھا۔ ’’اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ‘‘

آپ مرزا نظام الدین وغیرہ سے اس لئے قطع تعلق رکھتے تھے کہ ان کا خدا کے ساتھ تعلق نہ تھا۔

میں بوقت خطبہ الہامیہ موجود تھا۔ حضور کی آواز اس وقت بدلی ہوئی تھی۔ ضلع

سیالکوٹ کا ایک سید ملہم (خادم حضور) میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ فرشتے بھی سننے کے لئے موجود ہیں۔

ضلع شاہ پور سے ایک سکھ بمعہ اپنے لڑکے کے ''مٹھہ ٹوانہ'' موضع سے آیا۔ اس کے لڑکے کو غالباً تپ دق تھا۔ حضرت مولوی نورالدین صاحب سے دوا کرانے آیا تھا۔ اس کا باپ دعا کے لئے حاضر ہوتا۔ آپ دعا فرماتے۔ آپ کو الہاماً ایک نسخہ معلوم ہوا۔ جو اس پر معرفت حضرت مولوی صاحب استعمال ہوا اور وہ لڑکا شفایاب ہوگیا۔ وہ نسخہ اب تپ دق کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔''

(رجسٹر روایات صحابہ جلد 3 صفحہ 144۔147)

یہی روایات الفضل 24/جون 1942ء صفحہ 3 پر شائع شدہ ہیں۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ 313 کبار صحابہ میں بھی شامل ہیں آپ کا نام اس فہرست میں 140 نمبر پر موجود ہے۔ آپ نے کچھ عرصہ حیدرآباد دکن میں بھی وکالت کی۔ 1928ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جلسہ سیرت النبیؐ کا آغاز فرمایا تو آپ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق مبارکہ کی اشاعت کے لیے سیرت رسولؐ پر انعامی مضامین کا مقابلہ کرایا چنانچہ آپ کی طرف سے اخبار الفضل میں یوں اعلان شائع شدہ ہے:

تین انعام نقد

پچاس روپے! پچیس روپے! دس روپے!

پہلا انعام اس غیر مسلم بھائی یا بہن کو دیا جائے گا جو حضرت رسول عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے: 1۔ پاک حالات زندگی 2۔ بنی نوع انسان پر احسانات 3۔ مخلوق خدا کے لیے بے نظیر قربانیاں۔ پر بہترین مضمون لکھ کر ہندوستان کے کسی مقام پر جلسہ منعقدہ 20/جون میں سنائے، جس کی تصدیق مقامی جماعت احمدیہ کے امیر کریں اور اس مضمون کی نسبت حضرت خلیفۃ المسیح قادیان اپنے درجہ کے مضامین میں سب سے بہتر ہونے کی تصدیق فرمائیں۔ یہ مضمون کم ازکم 16 صفحہ فل سکیپ کاغذ پر ہو۔

دوسرا انعام اس مسلمان بہن کو جو عنوانات بالا پر کم ازکم 16 صفحے کا مضمون 20/جون کے زنانہ جلسہ کے لیے قادیان بذریعہ رجسٹری حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں بھیج دے یا اس جلسہ میں خود سنائے۔ بشرط تصدیق حضرت خلیفۃ المسیح دیا جائے گا۔

تیسرا انعام تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے کسی طالب علم کو جو کم ازکم 12 صفحے کا مضمون مذکورہ بالا عنوانات پر لکھ کر جلسہ 20/جون میں سنائے۔ بشرط تصدیق حضرت خلیفۃ المسیح انعام دیا جائے گا۔

خاکسار حافظ عبدالعلی۔ وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن عقب کتب خانہ سرکاری۔

(الفضل 31/جنوری 1928ء صفحہ 1)

بعد ازاں آپ بلاک نمبر 9 سرگودھا شہر میں رہائش پذیر ہوگئے۔ حضرت مولانا غلام رسول راجیکی صاحب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''...سرگودھا شہر میں بھی مَیں بار ہا گیا۔ وہاں کے امیر حضرت حافظ مولوی عبد العلی صاحبؓ بی اے ایل ایل بی پلیڈر برادر حضرت مولانا شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ و ارضاہ تھے۔ سرگودھا میں علاوہ درس و تدریس کے حضرت حافظ صاحب سے علمی و روحانی مذاکرہ اور مجالست کا بھی موقع ملتا۔ حافظ صاحب اکثر یہ فرمایا کرتے کہ مجھے کوئی ایسی نصیحت یا کلام سنائیں جس سے روحانیت اور قرب الٰہی میسر آئے اور وہ بات مختصر اور مطلب خیز ہو۔ حافظ صاحب کی اس فرمائش پر میں نے ان کی خدمت میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ شعر پیش کیا کہ:

حریصِ غربت و عجزم ازاں روزے کہ دانستم

کہ جا در خاطرش باشد دلِ مجروح غربت را

یعنی میں اسی روز سے غربت اور عجز کا حریص رہتا ہوں جب سے مجھے اس بات کا علم ہوا ہے کہ اس جانِ جہاں اور محبوب ازل کے دل میں ایسے ہی دردمند عاشق کے لئے جگہ ہے جس کا دل غربت و مسکینی سے مجروح ہو چکا ہو۔

حافظ صاحب اس شعر کو سن کر بہت خوش ہوئے اور جب کبھی بھی اس کے بعد میرے ساتھ ان کی ملاقات ہوتی تو اس شعر کا اور اس کے مطالب کا ضرور شوق کے ساتھ ذکر فرماتے اور اس کو بار بار پڑھتے اور روحانیت کے حصول کے لئے بہت ہی مفید نسخہ قرار دیتے اور اکثر فرماتے کہ یہ شعر تصوف کی جان ہے۔''

(حیات قدسی صفحہ 185۔186)

آپ بفضلہٖ تعالیٰ موصی (وصیت نمبر 6374) تھے۔ آپ نے 18رنومبر 1948ء کو وفات پائی اخبار الفضل نے لکھا:

''یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برادر اکبر حضرت حافظ عبدالعلی صاحب بی اے ایل ایل بی مورخہ 18رنومبر 1948ء بروز جمعرات اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ آپ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پرانے صحابہ میں سے تھے۔ احباب بلندی درجات کے لیے دعا فرمائیں۔''

(الفضل 23رنومبر 1948ء صفحہ 3)

آپ کی اہلیہ کا نام حضرت دولت بی بی صاحبہ تھا، انہوں نے 1903ء میں بیعت کی۔ (الفضل 16رجون 1943ء صفحہ 7) ان کی وفات 24ردسمبر 1949ء کو ہوئی، آپ کے بیٹے مکرم عبدالمالک صاحب نے اعلان وفات دیتے ہوئے لکھا:

''میری والدہ (زوجہ حضرت حافظ عبدالعلی صاحب مرحوم) 24ردسمبر کو نہایت مختصر سی علالت کے بعد دائمی اجل کو لبیک کہتی ہوئی اپنے مولائے حقیقی سے جا ملیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ احباب دعائے مغفرت فرما کر مشکور فرمائیں۔''

(الفضل 17رجنوری 1950ء صفحہ 2)

آپ کی اولاد میں:

1۔ غلام فاطمہ صاحبہ (وفات: 9/دسمبر 1968ء) اہلیہ مخدوم بشیر احمد صاحب

2۔ غلام حفصہ صاحبہ اہلیہ چوہدری نذیر احمد صاحب

3۔ روشن بخت صاحبہ اہلیہ غلام احمد صاحب ضلعدار

4۔ چوہدری عبدالمالک صاحب

5۔ مبارکہ بیگم صاحبہ اہلیہ چوہدری علی اکبر صاحب سابق نائب ناظر تعلیم

6۔ زیب النساء بیگم صاحبہ (وفات: 8/ستمبر 2002ء) اہلیہ ڈاکٹر محمد سعید صاحب سرگودھا

(نوٹ: آپ کی تصویر آپ کی نواسی محترمہ فرخ دلدار صاحبہ اہلیہ کرنل دلدار احمد صاحب ٹورانٹو، کینیڈا نے مہیا کی ہے، فجز اھااللہ احسن الجزاء)

○○

حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ مضمون مکرم کرنل دلدار احمد صاحب، کینیڈا کا تحریر کردہ ہے جو کہ قارئین کے استفادہ کیلئے اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

حضرت مولوی شیر علی صاحب ؓ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نہایت ہی مخلص اور فدائی صحابہ میں سے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک کشف میں دیکھا کہ حضور کے سامنے ایک فرشتہ آیا ہے جس کا نام شیر علی ہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ؓ فرماتے ہیں کہ:

''میں کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولوی شیر علی صاحب ؓ مرحوم حقیقتاً ایک فرشتہ سیرت بزرگ تھے اور اُن کے متعلق لوگوں کی زبان پر فرشتے کا لفظ غالباً الٰہی تصرف کے ماتحت جاری ہوا تھا۔''

حضرت مولوی شیر علی صاحب ؓ پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''ادرحمہ'' میں 24 نومبر 1875ء میں پیدا ہوئے جو تحصیل بھلوال ضلع سرگودہا میں واقع ہے۔ حسن

اتفاق سے یہ عاجز (دلدار احمد) بھی اسی گاؤں میں پیدا ہوا اور حضرت مولوی صاحبؓ کی رشتہ داری سے مشرف بہ ہے۔

حضرت مولوی صاحبؓ کے والد ماجد کا نام حضرت مولوی نظام الدین صاحبؓ تھا۔ وہ اپنے گاؤں کے امام اور روحانی لیڈر تھے۔ حضرت مولوی صاحبؓ کی والدہ نہایت ہی نیک اور پارسا خاتون تھیں اور حافظہ قرآن تھیں ۔ حضرت مولوی صاحبؓ دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی حضرت حافظ عبد العلی صاحبؓ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ابتدائی تین سو تیرہ اصحاب میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہے ۔ دونوں بھائیوں کو دوران تعلیم ہی قبولیت احمدیت کی سعادت حاصل ہوئی اور دونوں کا شمار حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نہایت ہی وفادار مخلص صحابہ میں ہوا۔ ایک روایت کے مطابق کسی دوست نے بڑے بھائی حضرت اور حافظ عبد العلی صاحبؓ بی اے ایل ایل بی، جو کہ ایک لمبا عرصہ امیر جماعت احمدیہ سرگودہا رہے تھے سے پوچھا کہ کیا آپ بڑے ہیں یا مولوی شیر علی صاحبؓ بڑے ہیں ۔ حضرت حافظ عبد العلی صاحبؓ نے جواب دیا کہ مولوی شیر علی صاحب بڑے ہیں تاہم پیدا میں پہلے ہوا تھا۔

حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ پہلی دفعہ 1897ء میں جبکہ ابھی وہ طالبعلم ہی تھے قادیان آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کی ۔ اُس وقت انکی عمر صرف 20 سال تھی ۔ انہوں نے 1899ء میں ایف سی کالج لاہور سے بی اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں ساتویں پوزیشن پر کامیاب ہوئے ۔ اُسی وقت انکو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے سول جج کے اعلیٰ عہدہ کی پیشکش ہوئی ۔لیکن اُس وقت ان تک

ایک اور پیشکش بھی پہنچ چکی تھی جوان کو زیادہ عزیز تھی کیونکہ وہ ان کے دل سے اُٹھی تھی اور دل کی آواز یہ تھی کہ:

''قادیان جاؤ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدموں میں بیٹھو اور اپنی زندگی دین اسلام کی خدمت میں گزاردو۔''

حضرت مولوی صاحب ؓ نے یہ دوسری پیشکش قبول کرلی اور تا وفات اس پر کامل وفاداری سے قائم رہے۔

قادیان آنے اور اپنے آپ کو خدمت اسلام کے لئے وقف کردینے پر سب سے پہلے وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور 1899ء سے 1910ء تک یہ فرائض نہایت ہی محنت، اخلاص اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ؓ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولوی صاحب ؓ نے ہیڈ ماسٹری کے فرائض اس خوبی سے سرانجام دیئے کہ اُن کا ہر شاگرد گویا آپکا عاشق زار تھا کیونکہ ان کے وجود میں طلباء کو نہ صرف ایک قابل ترین استاد مل گیا تھا بلکہ شفیق ترین باپ بھی میسر آ گیا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اُن کے شاگرد جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، بسا اوقات اُن کے ذکر سے قلوب میں رقت اور آنکھوں میں آنسو محسوس کرتے ہیں۔''

سکول کی ملازمت کے بعد حضرت مولوی صاحب ؓ ریویو آف ریلیجیز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُن کے ہاتھ سے بعض ایسے مضامین نکلے جو

سلسلہ کے لٹریچر میں خاصی شان رکھتے ہیں ۔ انگریزی زبان میں حضرت مولوی صاحبؓ کا مقام بہت بلند تھا اور نہایت صاف، صحیح اور بامحاورہ انگریزی لکھتے تھے جس کی سلاست اور صحت پر رشک آتا ہے۔

حضرت مولوی صاحبؓ نہایت ہی سادہ لباس پہنتے اور بہت ہی سادہ عادات رکھتے تھے۔ انکی قابلیت کی عظمت لیکن سادگی کے شعار پر ایک دلچسپ واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ جب آپ ریویو آف ریلیجنز کی ادارت پر مامور تھے۔ ایک مرتبہ دو انگریز افسر قادیان آئے۔ جب وہ آپکے مکان کے قریب سے گزر رہے تھے تو وہیں حضرت مولوی صاحبؓ اپنی بھینسیں چرا رہے تھے۔ آپ کا گریبان کھلا ہوا تھا اور نہایت سادہ لباس میں ملبوس تھے۔ ان انگریز افسروں میں سے ایک نے حضرت مولوی صاحبؓ سے پوچھا کہ ہمیں ریویو آف ریلیجز کے ایڈیٹر سے ملنا ہے وہ کس جگہ ملیں گے۔ تو حضرت مولوی صاحبؓ نے فرمایا: چلئے میں آپکو ان کے مکان پر لے چلتا ہوں۔ اور اُن کو اپنے ہمراہ لا کر اپنی بیٹھک میں بٹھا کر فرمایا آپ تشریف رکھیں میں انہیں بلا لاتا ہوں ۔ حضرت مولوی صاحبؓ کا مقصد یہ تھا کہ چائے وغیرہ تیار کریں اور باتوں باتوں میں تعارف بھی ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کے گھر ہی لے چلیں۔ اس پر حضرت مولوی صاحبؓ نے فرمایا: ریویو کا ایڈیٹر تو میں ہی ہوں۔ وہ دونوں افسر یہ سن کر بے حد حیران ہوئے اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا کہ ہم تو سمجھے تھے کہ اس رسالہ کا ایڈیٹر کوئی انگریز ہوگا۔

ریویو آف ریلیجنز کی ایڈیٹری کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

ارشاد کے ماتحت وہ قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ وتفسیر کے لئے مقرر کئے گئے اور انکی بقیہ زندگی اسی پاکیزہ اور بابرکت کام کی بجا آوری میں گزری۔ اس غرض کیلئے انہیں انگلستان بھی بھجوایا گیا اور بالآخر یہ کام قادیان واپس آ کر تکمیل کو پہنچا۔ قادیان کے زمانہ میں حضرت مولوی صاحبؓ کی امداد کے لئے حضرت ملک غلام فرید صاحب ایم اے، مولوی عبدالرحیم صاحب درد ایم اے، حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے اور خان بہادر چوہدری ابوالہاشم صاحب ایم اے مقرر تھے۔

قرآن کریم کا ترجمہ بلاشبہ حضرت مولوی صاحبؓ کا ایسا کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک تابندہ رہے گا۔ آپ کی یہ عزیز ترین خواہش تھی کہ یہ کام ان کی زندگی میں تکمیل پذیر ہو۔ چنانچہ آپ کی صاحبزادی محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ ایک روز ابا جی نے مجھے اپنا خواب سنایا کہ میں نے چند روز ہوئے خواب میں دیکھا کہ فرشتے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں شیر علی ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ انجمن نے میرے سپرد ایک کام کیا ہے وہ پورا کرلوں تو چلوں گا۔ یہ خواب اس رنگ میں پورا ہوا کہ جب آپ اس مقدس فریضہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے تو خدا تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

حضرت مصلح الموعودؓ نے اپنے دیباچہ تفسیر القرآن کے آخر میں حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ کی خدمت قرآن کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

''میں اس دیباچہ کے آخر میں مولوی شیر علی صاحب کی ان بینظیر خدمات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے باوجود صحت

کی خرابی کے قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کرنے کے تعلق سے کی ہیں۔''

حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ فرماتے ہیں کہ حضرت مولوی صاحبؓ باوجود پیرانہ سالی کے جس محنت اور شغف اور توجہ کے ساتھ قرآن مجید کا کام کرتے تھے وہ ہم سب کے لئے ایک مشعل راہ ہے۔

حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کبھی قادیان سے باہر تشریف لے جاتے تو بالعموم حضرت مولوی صاحبؓ کو ہی اپنی جگہ امیر مقرر فرمایا کرتے تھے۔آپکو یہ فخر بھی حاصل ہوا کہ 1924ء میں جب حضور انگلینڈ تشریف لے گئے تو بر صغیر کے امیر آپ ہی مقرر ہوئے۔

حضرت ملک غلام فرید صاحب ایم اے مرحوم بیان فرماتے ہیں:

''خدا کا یہ عبادت گزار بندہ، جماعت کا نہایت قابل احترام بزرگ اپنی ساری عظمت کے باوجود مجسم انکسار تھا۔قادیان میں کون سا غریب سے غریب انسان ایسا تھا جس کو یہ احساس نہ تھا کہ حضرت مولوی سے السلام علیکم کہنے میں پہل کرنا ناممکن نہیں تو بیحد دشوار ضرور ہے۔میں نے انکے انکسار اور فروتنی کے عجیب نظارے دیکھے ہیں۔سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کشمیر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔پیچھے حضرت مولوی صاحبؓ امیر جماعت تھے۔جمعہ کا دن تھا۔حضرت مولوی صاحب نے خطبہ دیا۔نماز پڑھائی پھر اپنی سنتیں جو شروع کیں تو اتنی لمبی پڑھیں کہ ساری مسجد نمازیوں سے خالی ہوگئی۔میں اتفاق سے کسی کی خاطر بیٹھا تھا۔مولوی صاحب نماز پڑھتے رہے۔

پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ میں بھی چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد جو واپس آیا تو دیکھا کہ مولوی صاحب مسجد میں اکیلے اپنے بازوؤں کا تکیہ بنائے سو رہے ہیں۔ شدید گرمی کے دن تھے۔ ایک دوست بھی میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ یہ مولوی صاحب آجکل ہمارے امیر ہیں اور ہم ان کی اسی طرح فرمانبرداری کرتے ہیں جیسے امیر المؤمنین کی۔ لیکن یہ غریب دل انسان کس سادگی سے خالی زمین پر سو رہا ہے۔

حضرت مولوی صاحب میں دو ایسی خصوصیات تھیں جن کے باعث ہر خاص و عام اُنکے تقویٰ اور بزرگی کا معترف تھا۔ پہلی خصوصیت تو جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے السلام علیکم کہنے میں ان سے سبقت لے جانا ایک نہایت ہی مشکل امر تھا اور دوسری جیسے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ نے اپنی ایک تقریر میں بیان فرمایا تھا یہ تھی کہ جب امام الصلوٰۃ ہوئے تو سورۃ الفاتحہ کی آیت اھدنا الصراط المستقیم اتنی بار پڑھتے کہ مقتدین کو ایسا احساس ہوتا کہ گراموفون ریکارڈ کی طرح اس آیت پر سوئی اٹک گئی ہو۔

آپکے عجز و انکسار کا ایک اور واقعہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مکرم مولوی تاج الدین صاحب لائلپوری بیان فرماتے ہیں کہ خاکسار مدرسہ احمدیہ قادیان میں مدرس تھا اور حضرت مولوی شیر علی صاحب ان دنوں ناظر دعوۃ و تبلیغ کے فرائض سرانجام دے رہے تھے کہ آپ کی طرف سے مجھے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے جالندھر جانے کا تحریری حکم ملا۔ لیکن میں اُن دنوں بعارضہ بخار بیمار رہا تھا۔ اور کمزوری کی وجہ سے سفر کے قابل نہ تھا۔ اس لئے میں نے معذرت لکھ بھیجی۔ دوسرے روز مجھے حضرت مولوی صاحب کے دستخطوں سے ایک چٹھی ملی جس میں ڈاکٹری

سرٹیفکیٹ پیش کرنے کی ہدایت تھی ۔ میں نے ڈاکٹر حشمت اللہ خاں کا تصدیقی سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔غالباً تیسرے روز بعد جب کہ جلسہ کی تاریخ میں صرف ایک دن باقی تھا حضرت مولوی صاحب خاکسار کے مکان پر تشریف لائے اور میرا حال دریافت کرنے کے بعد مجھے کچھ رقم دے کر فرمایا۔ یہ جالندھر جانے کا خرچ ہے جو وہاں کی جماعت نے بھیجا ہے۔ مجھے کوئی اور موزوں آدمی نہیں مل سکا اس لئے آپ تشریف لے جائیں۔میں آپکی صحت کے لئے دعا کرونگا۔حضرت مولوی صاحب ؓ نے کچھ اس انداز سے جانے کا ارشاد فرمایا کہ میں انکار نہ کرسکا۔اور میں نے وعدہ کرلیا کہ میں انشاء اللہ تعالیٰ صبح کی گاڑی سے روانہ ہوجاؤنگا۔

علی الصبح سٹیشن پر پہنچ کر جب میں ٹکٹ لینے کے بعد گاڑی پر سوار ہونے لگا تو دیکھا کہ حضرت مولوی صاحب پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا تو حضرت مولوی صاحب مجھے ایک طرف لے گئے اور فرمایا (گو یہ الفاظ کہتے ہوئے زبان رُکتی ہے لیکن چونکہ حضرت مولوی صاحب کے بلند اخلاق کا اُن سے ثبوت ملتا ہے اس لئے مجبوراً یہ الفاظ لکھ رہا ہوں):

> ’’میں ایک جاہل اور بیوقوف آدمی ہوں۔دراصل اپنے کلرک کے کہنے پر میں نے آپ سے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ طلب کر لیا تھا۔ورنہ میری طبیعت ایسا نہیں چاہتی تھی۔میں بہت شرمسار ہوں اور معافی مانگنے آیا ہوں۔‘‘

غور کیجئے یہ الفاظ اسی شخص کے ہیں جسے 1899ء میں بی اے پاس کرتے ہی سول

جج کا عہدہ گورنمنٹ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اور جس نے خدمت اسلام کی خاطر وہ عہدہ ٹھکرا دیا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قوت قدسی نے حضورؑ کے ماننے والوں میں یہ انقلاب برپا کر دیا تھا کہ وہ سراپا عجز وانکسار بن گئے اور یہی ان کی عظمت کا نشان تھا۔

مکرم بدر سلطان صاحب اختر مرحوم جو کہ وقف زندگی تھے اور حضرت مولوی صاحبؓ کے رشتہ داروں میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ:

''میں تو دس برس کا تھا جب میں پہلی مرتبہ قادیان جلسہ سالانہ پر آیا۔ ایک روز میں حضرت مولوی صاحبؓ کے ساتھ جلسہ گاہ تک آیا۔ سٹیج کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ جہاں اکثر بزرگان سلسلہ مناسب اور باموقعہ جگہ تلاش کر کے بیٹھ رہے تھے وہاں حضرت مولوی صاحبؓ جوتوں کے قریب کی خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ امر طبعاً مجھے ناگوار گزرا۔ چنانچہ میں نے بچپن کی بے باک اور نڈر طبیعت کے سبب فوراً پوچھا کہ چچا جان لوگ تو آگے بڑھ بڑھ کر اپنی جگہ تلاش کرتے ہیں۔ آپ کیوں جوتوں میں بیٹھتے ہیں۔ اس پر حضرت مولوی صاحبؓ نے فرمایا:

''بیٹا! میں نے جوتوں میں ہی رہ کر سب کچھ حاصل کیا ہے۔''

یہ فقرہ جہاں انکسار پر مبنی ہے وہاں ایک لفظی حقیقت بھی ہے۔ خاکسار االراقم عرض کرتا ہے کہ مولوی صاحب کے متعلق ہمارے خاندان کے بزرگوں نے سان کیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں حضرت مولوی صاحبؓ مرحوم کی یہ عادت تھی کہ ہمیشہ مسجد میں اُسی جگہ بیٹھتے جہاں حضور علیہ السلام نے اپنے نعلین مبارک

اتارنے ہوتے تھے اور جب حضور نماز پڑھنے کے لئے مسجد مبارک میں تشریف لاتے تو حضرت مولوی صاحب حضور کے نعلین اپنی چادر کے پلو سے صاف کرتے اور پھر انہیں سیدھی کر کے رکھ دیتے۔

اب آخر میں میں حضرت ملک غلام فرید صاحب ایم اے مرحوم کے بیان کردہ ایک واقعہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ میاں محمد شفیع صاحب جوم۔ش کے نام سے اخبارات میں مضمون لکھتے ہیں، ہمارے جلسہ سالانہ کی رپورٹ لینے کے لئے قادیان آئے اور میرے پاس ٹھہرے۔ جب ہم جلسہ گاہ میں آئے تو میاں صاحب موصوف مجھ سے کہنے لگے ملک صاحب کوئی ولی اللہ دکھلائیں ۔ میں نے کہا ہمارے نزدیک سب سے بڑے ولی اللہ تو ہمارے امام ہیں۔ اُن کو آپ نے دیکھ لیا ہے۔ کہنے لگے ہاں وہ تو ہیں۔ لیکن پھر بھی میں کسی فقیر ولی اللہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اتنا کہنے ہی پائے تھے کہ حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ ہمارے پاس سے گزرے۔ اس وقت آپ اپنے کندھے پر ایک موٹا کھردرا کمبل ڈالے ہوئے تھے جو اُن کے روزمرہ لباس کا حصہ ہوتا تھا۔ میں نے کہا یہ ہمارے مولوی شیر علی صاحب ہیں۔ 1899 میں گریجویٹ ہوئے۔ یورپ میں تین سال رہ آئے ہیں ۔ انگریزی زبان کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ برسوں انگریزی رسالہ ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر رہے ہیں اور اب قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ میاں صاحب موصوف کہنے لگے۔ میں ایسے ہی فقیر کو دیکھنا چاہتا تھا اور جب تک حضرت مولوی صاحب ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے ان کی نظر مولوی صاحب کا تعاقب کرتی رہی۔

غرضیکہ حضرت مولوی صاحبؓ بڑی روحانی عظمت وشان کے مالک تھے۔سلسلہ عالیہ احمدیہ ہمیشہ ایسے بزرگوں پرفخر کرتا رہیگا۔ یہی اِس سلسلہ کی بنیاد تھے اور بڑی مضبوط بنیاد! خدا تعالیٰ کی بےشمار رحمتیں ہوں مسیح علیہ السلام کے ان پروانوں پر۔وہ اپنا فرض ادا کر گئے اور اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ جہاں وہ ان سے راضی اور یہ اُس سے راضی ۔ خدا تعالیٰ ہمیں ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین۔

OO

صاحبزادی امۃ جمیل بیگم صاحبہ

سرزمین کینیڈا کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پوتی، حضرت المصلح الموعودؓ اور حضرت سیدہ اُمّ طاہر کی بیٹی، خلیفۃ المسیح الثالثؒ و خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی بہن اور خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خالہ محترمہ ومکرمہ صاحبزادی امۃ الجمیل بیگم صاحبہ کینیڈا میں سکونت پذیر ہیں۔

ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ اُن کی بابرکت محبتوں سے ہم فیض یاب ہوتے ہیں۔ ہمارے اجلاسوں میں جب وہ رونق افروز ہوتی ہیں تو دل خدا تعالیٰ کی حمد سے بھر جاتا ہے کہ اس معزز ہستی کی زیارت کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ خاص طور پر نئی نسل کیلئے اُن کا وجود اور اُن کا تعارف ایک نہایت قیمتی اثاثہ ہے۔

اُنہوں نے بیشتر صفات اپنی عظیم والدہ سیدہ اُمّ طاہر سے لی ہیں۔ قربانی وایثار، غریب پروری، بیمار پُرسی، تیمارداری وخدمت گزاری اور مہمان نوازی اُن کا شیوہ ہے۔ غریبوں سے بے انتہا محبت اور عزت کرنے اور ہر ایک کا درد محسوس کرنے والا دل رکھتی ہیں۔ بے شمار لوگوں سے اُن کا رابطہ رہتا ہے اور سب کے دکھ درد میں شریک رہتی ہیں۔ دنیا کے کسی کونے میں کوئی تکلیف محسوس کرتا ہے تو وہ اُن سے اپنی دل کی بات کہہ کر اُن کی دعاؤں کا حصہ دار بنتا ہے۔

گھرداری کے سلیقے طریقے اور صفائی ستھرائی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کھانا

پکانے میں ماہر ہیں۔ اُن کے ہاتھ کا ذائقہ بھی اپنی والدہ کا ہے۔ عسر اور یُسر میں اپنی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اپنی اولاد کی نہایت احسن رنگ میں تربیت کی اور اُن میں عاجزی حیا، محبت وخدمت اور علم وعمل کی اعلیٰ صفات پیدا کیں۔

صاحبزادی امۃ الجمیل صاحبہ کی ذہانت و فطانت میں حضرت المصلح موعودؓ کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ اپنے عظیم والد سے بے انتہا محبت وعقیدت رکھتی ہیں اور چونکہ بچوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی حیثیت سے اُنکی بے حد لاڈلی بھی تھیں اس لئے ان کی یاد اور ذکر کرتے ہوئے بہت پیار اور محبت سے ہمیں اُن کی زندگی کے واقعات سناتی ہیں۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کے دلکش انداز میں اتنی خوبصورت اور تاریخی باتیں سنتے ہیں اور یہ دلچسپ صحبتیں ہمیں حضرت المصلح موعودؓ کے عظیم دور میں لے جاتی ہیں۔

صاحبزادی امۃ الجمیل صاحبہ ایک بہت ہی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ حسِ مزاح اور حسِ لطیف سے مزین اُن کی شگفتہ شخصیت لوگوں کے ہالہ میں سجی رہتی ہے۔ اُن کی صحبتیں اور محفلیں اس قدر دلچسپ و جاندار ہوتی ہیں کہ اُن کے ساتھ گھنٹوں بیٹھنے کا پتہ نہیں چلتا۔ اُن کے برجستہ جملے اور تبصرے اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ حافظہ اس غضب کا پایا ہے کہ برسوں پرانی باتیں اپنی تمام باریکیوں کے ساتھ ان کی یاداشت میں رقم ہیں۔ مردم شناسی اور نورفراست اُن کے خون میں ودیعت ہے۔ ایک نظر میں ہر چیز کا ادراک کر لیتی ہیں۔ جماعت کی عمومی کیفیت پر گہری نظر رکھتی ہیں اور جہاں تربیت کی ضرورت ہو وہاں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتی ہیں۔ شعر وادب سے بہت لگاؤ ہے اور بہت اعلیٰ شعری وادبی ذوق رکھتی ہیں۔

تندرستی اور بی بی جمیل میں البتہ کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔مگر یہاں بھی اُن کی زندگی سے بھرپور شخصیت کا پلہ بھاری رہتا ہے۔اور تندرستی نظریں جھکائے ان کا ساتھ دینے میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔خدا تعالیٰ اُن کو صحت اور خوشیوں کے ساتھ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔آمین۔ان کے وجود سے ٹورانٹو آباد لگتا ہے۔

○○

ایک مرد درویش۔کیپٹن ڈاکٹر محمد سعید

(اپنے والد محترم کی سادہ اور عملی ذاتی زندگی کے بارے میں)

حکایت ہے کہ سکندر اعظم ایک دفعہ دیوجانس کلبی کی شہرت سُن کر اُس کی خدمت میں حاضر ہوا جو باہر کہیں دھونی رمائے بیٹھا تھا۔اُس نے بہت عقیدت سے پوچھا کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔کلبی نے کمال بے پرواہی سے کہا کہ بس ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ بات مجھے اپنے مرحوم باپ کے بارے میں اکثر یاد آتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بے حد صفاتِ سے نوازا ہوا تھا مگر طبیعت میں سادگی،قناعت اور نمود و نمائش سے بیزاری بدرجہ اُتم پائی جاتی تھی۔زندگی میں بہت سی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے مگر ان کے متعلق ذکر تک کرنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا،چہ جائیکہ ان سے کوئی فائدہ اُٹھاتے۔

آج ان کے متعلق قلم اُٹھاتے ہوئے جو ایک لفظ بار بار میرے ذہن کے پردے پر اُبھرتا ہے وہ ایک ''مردِ درویش'' کا ہے۔تمام عمر سادگی، درویشی اور غریب پروری سے گزارتے ہوئے 80 سال کی عمر میں خاموشی سے چل دیئے جبکہ تمام غربا اور مساکین

نے کہا کہ آج ہم یتیم ہوئے اور سب جاننے اور چاہنے والوں نے تڑپ کر اور ٹوٹ کر اُن کی خاموش عنایتوں اور خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ افسوس کرنے جو بھی آیا اُس نے سعید کی سعید فطرت اور اُس کی اچھائیوں کا ہی ذکر کیا کیونکہ ان کی زندگی میں کوئی غلط یا صراطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی بات تھی ہی نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی حکیم شیر محمد صاحبؓ آف ہجن (یکے از 313) کے نواسے اور محترمہ عصمت بی بی صاحبہ اور چوہدری محمد بخش صاحب کے بڑے بیٹے تھے۔ 1918ء میں ادرحمہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے دادا حکیم صالح محمد صاحب اور نانا حکیم شیر محمد صاحب اپنے علاقے کے پائے کے حکیم تھے۔ شائد یہی ورثہ انہیں ڈاکٹری کے شعبے میں لے آیا۔ جونہی میڈیکل کالج امرتسر سے فارغ ہوئے حکومتِ وقت کے کہنے پر فوج میں شمولیت اختیار کی۔ اُن دنوں گاندھی جی کے کہنے پر ہندوؤں نے فوج میں جانے سے انکار کیا ہوا تھا۔ اس لئے تمام مسلمان ڈاکٹر فوج میں گئے۔

آپ مدراس، کلکتہ، برما اور ملایا میں تعینات رہے۔ جاپانیوں کے خلاف جو آپریشن ہوئے ان میں شامل رہے۔ پاکستان بننے پر سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے لیکن اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے فوج کا اچھا صاف ستھرا کیریئر بہت پسند تھا۔ ان کے ساتھیوں میں سے جنرل برنی جب بھی ہمیں ملتے تو ابا جان کی گونا گوں خوبیوں کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔

اپنے والدین کے ہاں دس سال بعد پہلی نرینہ اولاد ہونے کے ناطے اس بے حد لاڈلے بچے نے تمام عمر لاڈ اور عیش و آرام کو ناپسند ہی کیا۔ اُن کی نانی کا چونکہ اپنا بیٹا نہیں

تھا اس لئے ان کی تمام والہانہ محبتوں کے مورد بنے رہے اور ہمیشہ نانی کی دعاؤں اور شفقتوں کا ذکر کرتے حالانکہ طبیعت میں ایک طرح کی بے پرواہی تھی مگر کہتے تھے کہ نانی نے جو میرے لئے جو دعائیں کیں وہ سب پوری ہوئیں۔

ان کے والد چوہدری محمد بخش گرداور تھے اور علاقے کے اچھے زمیندار بھی تھے اسلئے گھر میں ہر طرح کی فراوانی اور آرام وسکون تھا۔ مگر قدرتی طور پر سہل پسندی ان کی فطرت میں نہ تھی۔ شروع سے ہی کسرتی جسم پایا تھا۔ وجیہہ، خوب مضبوط اور توانا شخص تھے۔ کہا کرتے تھے کہ میں بچپن میں اسقدر طاقتور تھا کہ بھاگتے ہوا آتا اور دیوار پر چلتے ہوئے گھر کی چھت پر چڑھ جاتا۔ یہی بات ان کے بہترین کھلاڑی بننے میں مد ثابت ہوئی۔

کبڈی کے بہترین کھلاڑی تھے اور قادیان میں بہت مشہور تھے۔ امرتسر میڈیکل کالج میں اپنے کھیلوں میں آنے کے متعلق سنایا کہ ایک دن میں Dissection Room سے باہر نکلا تو وہاں ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ میں بطور تماشائی وہاں پہنچا اور پھر شوقیہ ہی میں نے کتاب ایک طرف رکھی اور چھلانگ لگا دی جو کہ ان سب سے آگے تھی۔ لہٰذا فوراً کھلاڑیوں کی فہرست میں شامل کر لئے گئے۔ اُس زمانے میں ہندوستان میں سخت محاذ آرائی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے آپ کو مجبور کیا کہ تم ضرور کھیلوں میں حصہ لو تا کہ ایک آئیٹم تو ہندو سکھوں سے چلا جائے۔ کیونکہ وہ کھیلوں میں ہر جگہ چھائے ہوئے تھے۔ مگر سکھ مجبور کر رہے تھے کہ ہم سے پیسے لے لو مگر حصہ نہ لو۔ لیکن آپ کے انکار پر سکھ سخت مشتعل ہوئے اور کہا ہم تمہیں مزا چکھائیں گے

مگر آپ نے ہر کھیل میں حصہ لیا اور ہر کھیل میں فرسٹ پرائز جیتا۔

کھیلوں میں آپ کے نو آئیٹم تھے: 100 میٹر۔200 میٹر۔ ہائی جمپ۔ لانگ جمپ۔Hop Step and Jump۔ تیرا کی 100 گز۔ڈائیونگ اور شاٹ پُٹ۔

امرتسر میڈیکل کالج میں ان کی شہرت بیسٹ ایتھلیٹ کے طور پر نمایاں رہی۔ وہ لانگ جمپ اور Hop Step and Jump میں پنجاب اور آل انڈیا کے چیمپئن رہے۔1942ء میں لانگ جمپ اور Hop Step Jump میں آل انڈیا ریکارڈ قائم کیا۔ یہ ریکارڈ 1970ء تک قائم رہا۔ انڈیا اولمپک میں آل انڈیا بیٹ اتھلیٹ قرار پائے اور اولمپکس میں جانے کیلئے سلیکٹ ہوئے۔مگر جنگ عظیم دوم شروع ہونے پر اولمپک ملتوی ہوگئے۔ان کے کاغذات میں ان کا سلیکشن سرٹیفکیٹ آج بھی ہمیں ان کی یاد دلاتا ہے۔

انہوں نے زندگی میں بے شمار کپ، ٹرافیاں اور ایوارڈ جیتے جو قادیان کے محلہ دارالفضل میں ان کی بیٹھک کی زینت بنتے رہے۔ اخبارات میں اُن کی تصاویر اکثر چھپا کرتی تھیں۔

لیکن ان تمام کامیابیوں کے باوجود اپنے کھیل کو کبھی وجہ تفاخر نہ جانا بلکہ ہمیشہ اُس کے ذکر سے گریز کرتے تھے۔ہمیں ان کے کالج کے زمانہ اور سپورٹس کی باتیں اُن کے کالج کے دوست جنرل برنی سے ہی سننے کو ملیں۔ ابا جان نے تو کبھی بھول کر بھی ہمارے سامنے یا کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کیا۔

طبیعت میں نام ونمود سے بیزاری اور بے تعلقی کمال تھی۔ ایک دفعہ قادیان میں حضرت مصلح موعودؓ کی صدارت میں کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ آپ مقابلوں

میں سب سے آگے تھے۔ حضرت مصلح موعودؓ نے انعام دینے کیلئے بلایا تو موصوف روپوش ہو چکے تھے۔ ایک سکھ جو یہ مقابلے دیکھ رہا تھا بولا:

''اگر میرا پتُر ہوندا تے میں دو مجھاں دا دودھا اہنوں پیاندا''

بعد میں بھی بڑے بڑے انعامات، کپ اور ٹرافیاں جیتے مگر زندگی بھر انعامات لینے کیلئے جانے سے گریز ہی کرتے رہے اور بعد میں یہ کام اپنے پروموٹر کے سپرد کر دیا کہ خود ہی وصول کرتے پھرو۔

ایک دفعہ میری بیٹی اپنی ایک سہیلی کے گھر گئی تو وہاں ابا جان کے دوستوں کے ساتھ ان کے بڑے بڑے کپوں اور ٹرافیز کے ساتھ ایک تصویر کو دیکھ کر اُس نے ابا جان کو پہچانا۔ گھر آ کر اُس کا ذکر کیا تو بے پرواہی سے کہنے لگے ہاں وہ میرا پروموٹر تھا جو میرے کپ وصول کیا کرتا تھا۔

کہا کرتے تھے کہ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم تو صرف دو ہی ہیں۔ ایک علم الابدان اور ایک علم الادیان۔ مجھے تو اپنے علم الابدان پر فخر ہے۔ یہ سپورٹس تو درمیان میں ایسے ہی آ گیا۔

ہم ابا جان کو ہر طرح کی معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہتے تھے۔ عالم اور عِلم بخش تھے۔ زندگی کے کسی شعبے پر بات کرتے تو علم کا دریا بہا دیتے۔ انگریزی اور اُردو ادب پر دسترس حاصل تھی۔ فلاسفر قسم کی طبیعت پائی تھی۔ اسلئے فلسفہ کے اکابرین پر بھی عبور حاصل تھا۔ مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ یہی ترغیب ہمیں بھی دیتے۔ ہمیں چھٹی کلاس سے ہی تمام مغربی سکالرز کی مشہور تصنیفات کے ترجمے مطالعہ کروا دئے تھے جو زندگی

بھر کام آئے۔ ہمارے گھر تمام مشہور ادبی رسائل از قسم نقوش و ادبی دنیا وغیرہ کے علاوہ ہر قسم کے اخبار و رسائل آیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہر اخبار کا ایڈیٹوریل ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اس سے حالاتِ حاضرہ کا صحیح تجزیہ اور بہترین زبان و بیان سیکھنے کو ملتا ہے۔

ہمیں آٹھویں جماعت تک اسلامی ہسٹری کا لٹریچر بشمول نسیم حجازی اور رئیس احمد جعفری اور دیگر اسلامی ہسٹری کی کتب بہت پڑھنے کیلیئے دیں۔ شعر و شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ تمام اساتذہ کا کلام ازبر تھا اور اُن کا تقابلی جائزہ بھی لیتے۔ پاکٹ سائز کا دیوانِ غالب سنہرے حاشیوں والا اُن کے سرہانے رکھا ہوتا تھا۔ حسب موقع اکثر باتوں کا جواب شعر سے دیا کرتے تھے۔ اقبال کے بھی مداح تھے کہ اُس کی شاعری نے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں بہت کردار ادا کیا۔

مضمون نگار اور مورخ بھی تھے۔ ہر قوم کی ہسٹری اُس کے شروع سے آخر تک بیان کرتے۔ مختلف زبانوں کے ماخذ اور تقابل میں یدطولیٰ تھا۔ پنجابی اور عربی کو فصاحت و گہرائی میں انگلش پر فوقیت دیتے۔ حالاتِ حاضرہ اور ورلڈ پالیٹکس کا بہترین تجزیہ کرتے اور موجودہ ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی یلغار کو محسوس کرتے ہوئے اور نئے ورلڈ آرڈر کو بنتے ہوئے دیکھ کر مستقبل کا جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتے اور اس کے مطابق ہمیں بدلنے کا کہتے تو وہ آج ہم ہر قدم پر پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ کہتے تھے کہ ہمیشہ دس سال بعد کی پلاننگ کیا کرو۔ میرے لئے تو ابا جان کا کہنا ہر لفظ اور مقولہ مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے اور اُس کے مطابق عمل کرنے میں عافیت محسوس کرتی ہوں۔

گھر کے Handy Man کے طور پر Mr. Fixit بھی تھے اور اپنا ٹول بکس ہمیشہ

تیار رکھتے تھے۔ گھر کی تمام توڑ پھوڑ کی مرمت اور الیکٹریشن کا کام بخوبی کر لیتے تھے۔ باغبانی ایسی کہ پورا گھر باغ و بہار بنایا ہوا تھا۔ ہر طرح کا پھل، سبزی اور پھلوں سے بھرا رہتا تھا۔ ہمارے والدین نے بڑے نادر پودے لا کر لگائے خصوصاً چھوٹی الا ئچی، سدا بہار کاغذی لیموں، سُرخ امرود، انار، انجیر، شہتوت اور مالٹے کینو کے پھلدار درخت تھے۔ انگور کی بیلیں اپنے پورچ پر چڑھا رکھی تھیں۔ بوگن ویلیا اور چنبیلی گلاب کے پھول بہار دیتے تھے۔ بانس بھی ایک طرف بطور باڑ کے تھے۔ جانوروں سے بھی بہت محبت تھی۔ خصوصاً مُرغیاں اور ٹرکی بھی ابا جان کے مشاغل میں سے ایک مشغلہ تھا۔ ان کی سپیشل غذا کا دھیان رکھنا اور خود بنا کر کھلانا۔ ٹرکی تو جیسے اُن کا اسسٹنٹ تھا۔ ہر وقت ساتھ ساتھ۔

گھر کے چھوٹے سے چھوٹے کام سے کبھی عار نہیں سمجھی۔ میری بچپن کی یادوں میں ان کا ہماری کاپیوں پر کور چڑھانے، کتابیں جلد کر کے دینی، پینسلیں اور قلمیں تیار کر کے رکھنی، لکھائی کی مشق کروانی، انگلش اور حساب پڑھانا، ہمارے سکول کے چارٹ بھی بنا کر دینے اور اوپر خود ڈرائنگ کر کے تصویریں بنا کر بھی دینی۔ گرمیوں کی رات کو باہر ہمیں ستاروں کا علم اور راستے بتانا۔ جنرل نالج کے کوئز کروانے وغیرہ۔

مجھے بچپن میں کیک بنانے کا شوق ہوا تو کچن میں میرے ساتھ پوری دلچسپی سے کیک بنانے میں مدد کرنا۔ اُن دنوں Oven تو ہوتے نہیں تھے، چولھے کے کوئلوں کو سیٹ کر کے مجھے Bake کرنے میں مدد کرنا۔ چھوٹی بہن کو شامی کبابوں کا شوق ہوا تو اُس کے ساتھ مل کر بنواتے۔ اس کے سکول کے آرٹس اور کرافٹس بنا کر دیتے۔ دراصل

ابا جان کو خود کام کرنے سے بے حد خوشی ملتی تھی۔ نوکروں سے کام کروانا جیسے ان کیلئے عذاب سا ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں نوکر ہی گھر کا کام کرتے تھے مگر ابا جان کو چڑ ہی لگی رہتی تھی اور ان کا اونچی آواز میں غصّے بھرا فقرہ اکثر گھر میں گونجتاLet Them goاکثر امی جان سے اس بات پر بحث ہوتی اور جونہی موقع ملتا خود شروع ہو جاتے۔

ہمارے گھر میں ایک شفاخانہ ہمہ وقت کھلا رہتا تھا۔ ابا جان نے اپنے پیشے کو صرف اور صرف غربا اور خدمت خلق کیلئے وقف رکھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد امی جان نے گھر میں ایک بہت اچھا کلینک بنوایا کیونکہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ گھر میں کلینک کھولا جائے۔ مگر ابا جان نے کہا کہ میں نے خدمت کرنی ہے۔ ہمیں لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ ایک دن بھی یہ کلینک نہیں کھلا۔ مگر گھر میں صبح سویرے مریضوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ ہم سب گھر والے صبح ٹرے تیار کر کے ناشتے چائے اور کھانے وغیرہ مریضوں کو پیش کرتے رہتے اور ابا جان اُن کو نسخے لکھ لکھ کر دیتے رہتے۔ کبھی بھی کسی امیر یا غریب سے فیس نہیں لی۔ ایک دن ان کے ایک نواسے نے کہا کہ ابا جان آج تو میں کسی نہ کسی سے فیس لیکر رہوں گا۔ چنانچہ اُس نے ایک مریض سے لے بھی لی۔ مریض کے جانے کے بعد اُس نے ابا جان کو وہ روپے دکھائے تو ابا جان جیسے اُن کو دیکھ کر تڑپ گئے اور فوراً بولے ہائے ہائے یہ کیا کیا۔ اُس غریب نے کچھ سودا سلف لینا ہوگا۔ کچھ خریدنا ہوگا۔ بھاگو بھاگو ابھی اُس کو جا کر دے کر آؤ۔ ابھی دور نہیں گیا ہوگا، فوراً بھاگو۔ اتنا شور مچایا کہ وہ گھبرا کر بھاگا مگر اُسے ڈھونڈ نہ سکا۔ واپس آ کر بتایا تو غصے سے اُنہوں نے وہ روپے اُس کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا جاؤ اب اس کا محل بنوالو۔

ادر حمہ اپنے آبائی گاؤں میں جب کبھی کسی خوشی یا غمی یا کسی موقع پر چکر لگتا تو سارا گاؤں بلکہ آس پاس کے دیہات والے بھی اُمڈ آتے اور ابا جان صبح سے شام تک مریض دیکھتے رہتے۔ آپ خود بھی ساتھ بہت سی دوائیاں لے جاتے اور بانٹتے رہتے۔ درمیان میں گھر والے جہاں مہمان ہوتے وہ کھانا تیار کر کے بلاتے رہتے مگر آپ اس ہجوم سے نکل ہی نہ پاتے۔ شام کو کہیں گھر آتے اور کھانا کھا سکتے۔ اور اگلی صبح میرا درویش باپ بغیر کسی سے سواری لئے پیدل ہی تین میل کا سفر کر کے نزدیکی شہر ''بھابڑے'' کیلئے چل پڑتا اور بس لے لیتا۔ کسی سے سوال کرنا یا کوئی فائدہ اُٹھانا تو فطرت میں تھا ہی نہیں۔ عجب بے نفسی خاکساری سے زندگی گزار دی مگر خلقِ خدا کی خدمت کیلئے تن من دھن قربان تھا۔

ایک دفعہ امی جان گھر پر نہیں تھیں۔ بھابھی ہی گھر پر تھیں۔ اتنے میں فیصل آباد کے علاقے سے انکے دو پرانے مریض ان کو دکھانے کیلئے آئے تو ابا جان نے پہلے اُن کو کھانا کھلایا اور بھابھی جان سے گرم گرم روٹیاں لے جا کر ساتھ ساتھ اُن کو دیتے رہے۔ ہمیں تو ان باتوں کی عادت تھی مگر بھابھی جان کیلئے یہ بات انتہائی حیران کن تھی اور نئی تھی کہ ایک تو مریض دیکھیں اور پھر خود ساتھ ساتھ گرم روٹی بھی اُن کو دیتے رہیں۔ وہ آج تک ابا جان کی غریب پروری اور سادگی کو یاد کرتی ہے۔

مجھے گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کبھی نہیں بھولتی۔ ایک مریض جس کی پسلیاں فریکچر تھیں ان کے پاس آیا۔ آپ نے اُسے دیکھا اور کہا کہ میں تمہیں پلستر لگا دیتا ہوں۔ گھر کے پورچ میں اُسے بٹھا کر پلستر کا سامان تیار کیا۔ شدید گرمی میں پسینے سے نہائے

ہوئے صرف ایک دھوتی پہنے ہوئے ابا جان برآمدے کی اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ کر دوسری سیڑھی پر اسے بٹھا کر اُس کے سینے کے چاروں طرف پلستر کر رہے تھے۔ اور میں حیرت سے اُس درویش ڈاکٹر اور اُس کے غریب مریض کو دیکھ رہی تھی۔

ابا جان کے ہاتھ میں شفا اور تشخیص دونوں ہی خداداد تھیں۔ فوراً مرض کی تہہ تک پہنچ جاتے اور نسخہ لکھ دیتے بعد میں جب لیب ٹیسٹ کا زمانہ آیا تو لوگ اُن کی بات کا یقین نہ کرتے ہوئے ضرور ٹیسٹ کروانے پر زور دیتے۔ آپ ان کے اصرار پر کروانے کیلئے کہہ دیتے کہ چلو پیسے خرچ کرنا چاہتے ہو تو کرلو۔ مگر پھر نتیجہ بعینہ وہی ہوتا جو ابا جان پہلی نظر میں ہی بتا چکے ہوتے۔ خاص طور پر اُمراء کی تسلی اِسی طرح ہوتی تھی اور وہ واپس آ کر شرمندہ ہوتے ہوئے نسخہ لکھوا لیتے۔ ہم سب بچے جہاں کہیں بھی ہوتے تو فون پر ہی دوائی پوچھ لیا کرتے تھے تو وہ بذریعہ امی جان دور سے ہی کہہ دیتے کہ اُسے کہہ دو یہ دوائی کھالے۔ بعض دفعہ یہاں کے ڈاکٹروں سے بے شمار ٹیسٹ کروا کر بھی وہی ملتی تھی۔

ابا جان کا بچپن انتہائی لاڈ پیار اور آسائش میں گزرا۔ گھر میں ہر طرح کی ریل پیل تھی۔ مگر طبیعت میں سادگی، جفاکشی اور خاکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مشکل سے مشکل کام کرنا اُن کیلئے کوئی مشکل نہ تھا۔ ہر محنت اور عرق ریزی کا کام بخوشی اور آسانی سے کر لیتے۔ بناوٹ، تصنع اور منافقت سے بے حد نفرت تھی۔ نہ کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی پسند کرتے۔ اُس کیلئے ایک مذاحیہ مہمل سا لفظ ''ڈھنڈس'' ایجاد کیا ہوا تھا جو عموماً اپنے ان مریضوں کیلئے جو بیماری کا بہانہ کرتے یا وہم رکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ لوگ جو بیکار تکلف اور منافقت میں پڑے ہوتے ان کیلئے کہتے کہ بیکار ''ڈھنڈس'' کر رہا ہے۔

لہٰذا ہم بھی اُس ''ڈھنڈس'' قسم کے رویے سے اجتناب ہی کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی کی غیبت یا بدظنی کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ حسن ظنی کی نصیحت کی اور اپنی آخری نصائح میں بھی حسن ظنی کی ہی تلقین کی۔ لوگ کسی کے متعلق بری بات بھی کہتے تو ہمیشہ اس شخص کی اچھائی نکال کر بیان کرتے یا پھر چپ رہتے۔

دینی علوم کا گہرا علم اور لگاؤ تھا۔ قرآن کریم اکثر زبانی یاد تھا اور خوبصورت قرأت کرتے تھے۔ جماعت کے خلاف اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خلاف کوئی بات نہ سُن سکتے اور بہت غیرت کا مظاہرہ کرتے اور فوراً ٹوک دیتے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا گہرا مطالعہ تھا۔ اکثر امی جان کے ساتھ ان کتابوں کو ڈسکس کیا کرتے تھے۔ حدیث اور فقہ کا بھی اچھا علم تھا اور اکثر بروقت بیان کرتے تھے۔ پرانے زمانے کی تمام تفاسیر پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تفسیر کو ترجیح دیتے کہ اس زمانے کے امام کی مکمل لکھی ہوئی ہے اور سب سے بہترین ہے۔ خلیفۃ رابع رحمۃ اللہ کا خطبہ جمعہ بہت باقاعدگی سے سنتے اور آخری دن بھی جمعہ کے خطبہ سننے کے فوراً بعد طبیعت بگڑی اور وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جمعہ کی نماز باقاعدگی سے پڑھنے جاتے۔ تقویٰ کی باریک راہوں پر خود بھی عمل پیرا رہتے اور ہمیں بھی اس کی تلقین کرتے۔ ایک دفعہ میں بازار سے شاپنگ کر کے آئی اور سب کو دکھا رہی تھی تو اس میں ایک کپڑے کا پیس فالتو پایا گیا۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو فوراً بولے تقویٰ کا تقاضا ہے کہ فوراً واپس کر کے آؤ۔

ابا جان کی طبیعت کے مطابق فوج کی نوکری ہی مناسب تھی کیونکہ وہ رشوت ستانی

خوشامد اور منافقت پسند نہیں کرتے تھے اور سِول میں اس کے بغیر جیسے کام نہیں چلتا۔ رشوت کے بھی بہت سے طریق ہیں۔ جن میں تحفے تحائف بھی شامل ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ گھر میں دے جاتے تو سخت غضبناک ہوتے کہ کیوں وصول کیا۔ اسی طرح جب ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر تھے تو کسی قسم کی رشوت لینی تو ایک طرف اپنے عملے اور افسر صاحبان کو بھی سختی سے منع کرتے تھے۔ جس پر وہ لوگ اکثر خلاف ہو جاتے کہ نہ کھاتا ہے نہ کھانے دیتا ہے۔

ابا جان کی اُردو اور انگلش کی لکھائی اسقدر خوشخط تھی کہ بلا مبالغہ چھاپہ خانہ کی ہی سمجھی جاتی تھی۔ آواز بھی خوبصورت تھی اور گانے اور گنگنانے کی بھی بہت عادت تھی۔

یہ سادہ اور درویش شخص گھر میں سادہ لباس قمیص اور دھوتی پہننا۔ باہر البتہ شرٹ اور پینٹ میں نکلنے کی عادت تھی۔ شلوار قمیص سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی اور نہ ہی لباس کی تراش فراش سے۔ جیسا سلا پہن لیا۔ جیسا ہوا رہ لیا مگر کھانے کا معاملہ الگ تھا۔ امی جان کہا کرتی تھیں انہیں زندگی میں کسی قسم کا شوق یا خواہش نہیں ہے سوائے اچھا کھانے کے۔ اس میں کوئی سمجھوتا یا Compromise نہیں تھا۔ دراصل بحیثیت ڈاکٹر ابا جان غذا کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ اصول کہ

You are, what you eat.

کا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ متوازن غذا اور ورزش زندگی گزارنے کا بہترین طریق ہے۔ ہر کھانے کی چیز میں Nutrition Factor پہلے دیکھتے اور اُس کے مطابق کھاتے تھے۔ پروٹین ڈائیٹ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ گوشت کے بے حد شوقین تھے۔

گوشت کی ہر قسم اور خصوصاً بھنا ہوا گوشت ان کی محبوب ڈش تھی۔ اکثر زکام اور فلو کو کمزوری کی وجہ بیان کرتے اور علاج میں بھنے ہوئے گوشت کی پلیٹ کھانے کا مشورہ دیتے جس پر لوگ مسکراتے مگر اب ہم نے بھی اس کی افادیت کو جانا ہے اور کام میں سوپ اور بھنے ہوئے گوشت کی دعوت اُڑانے سے کافی آرام ملتا ہے۔ وٹامنز اور Supplements سے بہت چڑتے تھے اور منع کرتے تھے۔ ان کے بقول یہ سب غذا سے ہی حاصل کرنے چاہئیں۔

مگر مجموعی طور پر کافی چسکورے تھے۔ میرا مطلب ہے زرا بھی غیر معیاری کھانا اس حلیم اور بے پرواہ شخص کو پلک جھپکتے میں انتہائی برہم بھی کرسکتا تھا۔ یا کم از کم انتہائی بدمزہ طبیعت ہو جاتی۔ غربا کے بارے میں بھی یہی کہتے کہ ان کو سوائے mal nutrition کے اور کوئی بیماری نہیں ہوتی اور کثر مذاقاً اپنے گاؤں کے غریب لوگوں کو کہہ دیتے کہ اگر کہیں شادی ہو تو کسی طریقے وہاں گھس جایا کرو اور خوب 'رج' کے کھالیا کرو۔ صبح کی بیڈ ٹی کی بہت عادت تھی جو خود بناتے تھے۔ ہم سب بچے جب بھی چھٹیوں میں اکٹھے جاتے تو صبح کھانے کی میز پر بڑے بڑے تھرمس خوب کڑک میٹھی چائے کے بسکٹوں اور اس کے ساتھ رس پڑے ملتے تھے جو بھی اُٹھتا جاتا چائے کی چسکیاں لینے لگتا۔ ہم سب اُس مزیدار چائے کا ذائقہ کبھی نہیں بھولتے۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ بعض باتوں میں عجیب وغریب مضحکہ خیز چیزوں کا مظہر بنتا تھا مثلاً ابا جان کا ذکر مکمل نہ ہوگا اگر میں ایک 8 انچ لمبے 5 انچ چوڑے اور 4 انچ اُونچے لکڑی کے ٹکڑے کا ذکر نہ کروں جیسے وہ اپنے ملٹی پرپز گٹکے کے نام سے موسوم

کرتے تھے اور اپنے مختلف کاموں کے استعمال میں لاتے تھے۔ وہ اُن کیلئے گرمیوں میں تکیہ کا کام دیتا تھا جیسے وہ سر کے نیچے رکھتے تھے تاکہ گردن کو ہوا لگتی رہے۔ اور پھر اسی کو لمبائی کے رُخ تکیے پر رکھ کر لیٹے لیٹے ٹی وی دیکھ لیا کرتے تھے۔ اپنی مرمتوں کے کاموں جیسے وہ Make and Mend کا نام دیتے تھے۔ اُس پر رکھ کر چیزوں کی مرمت اور کیل وغیرہ ٹھوکنے کیلئے کوئی سبزی وغیرہ کاٹنے کیلئے اور بطور ایک چھوٹی سی میز کے اپنے بستر کے پاس ہمیشہ رکھتے تھے۔ مگر زیادہ تر وہ تکیے کے اوپر پڑا ہوا ایک چھوٹے تکیے کا کام دیتا تھا جس سے گردن کو ہوا لگتی رہے۔ ''گُٹکا'' بچوں بڑوں سب کیلئے عجوبہ نما چیز ہوتی کہ یہ ہر وقت بستر پر کیوں براجمان رہتا ہے اور مہمانوں کیلئے مستقل وجہ مسکراہٹ۔

نہ تکلف، نہ احتیاط، نہ زعم
زندگی کی زبان سادہ تھی

ابا جان 1942ء سے لیکر 1945ء تک فوج کی زندگی کے حالات کبھی کبھی بیان کرتے جہاں وہ مدراس، کلکتہ، برما اور ملایا میں تعینات رہے۔ جنگ عظیم دوم کے واقعات میں قابلِ ذکر ان کا ریاست میسور کے علاقہ وائے ناڈا کے صندل کے جنگلات میں جنگی حالات اور رہنے اور کھانے کے طریقے۔ صندل کی لکڑی جلانے سے تمام جنگل خوشبو سے بھر جاتا۔ مخصوص جڑی بوٹیاں اور جنگلی مُرغ پکا کر کھانے، بانس کی کثرت اور ٹیڈی نسل کی بکریاں جو پنجابی سپاہی واپس پنجاب بھی لے کر آئے، اس طرح یہاں ٹیڈی نسل پھیلی۔

یہاں سے انہیں برما کے محاذ پر جہازوں کے ذریعے بھیجا گیا۔ وہاں ایک مورچے میں اپنا فرسٹ ایڈ کا سامان لیکر بیٹھے تھے کہ دوسرے مورچے سے ایک حوالدار نے بلایا کہ آپ میرے مورچے میں آجائیں۔ جونہی وہاں گئے ایک بم ان کے مورچے میں آکر پھٹا۔

وہاں اوکی ناوا جزیرے پر جاپانیوں کا قبضہ تھا۔ امریکن وہاں سے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں لیکر گزر گئے۔ جاپانیوں نے زمین میں مورچے بنائے ہوئے تھے۔ رات کو جب امریکی باہر سورہے تھے تو جاپانیوں نے چن چن کر سب امریکیوں کو بھون دیا۔

یکم اگست 1945ء کی بات ہے کہ ان کی ڈویژن کو حکم ملا کہ ہمیں سلایا (سلانینیا) پر حملہ کرنا ہے۔ آپ کو کوئین میری جہاز پر جانا تھا جس پر اڑھائی ہزار آدمی اور ایک بریگیڈ کا سامان آجاتا تھا۔ اِس کے ساتھ 12 جہازوں کا قافلہ تھا۔ چھوٹے بحری جہاز اور سب مرین اور تین Destroyer کے علاوہ دس جہاز اس کنوائے کی حفاظت کیلئے ساتھ تھے۔ جنگی کشتیاں بھی ساتھ تھیں۔ جہاز پر مکمل اندھیرا رہتا تھا۔ رات کو کوئی سگریٹ بھی نہیں پی سکتا تھا۔ سب کے دِلوں میں ایک اضطراب تھا۔ کیونکہ ہم نے Fweetan Han پورٹ پر اُترنا تھا اور اس کیلئے ہمیں مشقیں بھی کروائی گئی تھیں۔

اس کیلئے ہمیں کچھ میٹر تیر کر بندرگاہ تک پہنچنا تھا اور آگے جاپانیوں نے ہمیں چھوڑنا نہیں تھا۔ دس دن کا سفر تھا۔ 8/اگست کو ہم نے دیکھا کہ ہمارے افسر تختۂ جہاز پر آگئے۔ ہمیں کچھ نہیں بتایا گیا تھا مگر ہم بھی ساتھ ہی آگئے۔ دور سے دیکھا تو سمندر میں روشنی نظر آئی۔ ہم نے سمجھا جاپانیوں نے حملہ کر دیا ہے لیکن ہمارا C.O اور جہاز کا کپتان

بمع چنداا اور انگریز افسروں کے علیحدگی میں باتیں کررہے تھے اور بہت خوش نظر آرہے تھے۔ ہمارے استفسار پر پتہ چلا کہ امریکیوں نے پانچ اور آٹھ تاریخ کو جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر دو ایٹم بم برسائے ہیں اور اب ہمیں لڑنا نہیں پڑے گا کیونکہ جاپانیوں نے سرنڈر کر دیا ہے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ بہرحال بحفاظت سلا یا اُتر گئے اور جاپانیوں کو ہم نے سرنڈر کروانا شروع کر دیا۔ اُن کیلئے کیمپ بنائے گئے اور خاردار تاریں لگائی گئیں۔ جاپانی سلام کرتے تھے اور ہتھیار پھینک دیتے تھے۔ ہر افسر کو جاپان کا ریوالور، ایک تلوار ایک ٹائپ رائٹر اور ایک بائیسکل ملا۔ (مالِ غنیمت سے) اس بائیسیکل کا ٹائر پنکچر نہیں ہوتا تھا۔

وہ بنیادی طور پر ایک سخت جان اور محنتی شخص تھے۔ اپنی زندگی میں خاکساری کو ایک وجہِ امتیاز سمجھتے تھے۔ ان کے بقول خاکساری ایک بڑا وصف ہوتا تھا مگر اب یہ متروک ہوتا جارہا ہے۔

انہوں نے زندگی کو ایک عملی Pragmatic شکل میں دیکھا۔ وہ زندگی بھر غریبوں اور حاجت مندوں کے دوست اور ترقی پسند رہے۔ زندگی بھر بیوی بچوں کا خیال کیا مگر ان کیلئے یا اپنی ذات کیلئے کبھی نہیں جیے کہ ایک ایماندار اور خود شناس شخص کی یہی پہچان ہوتی ہے۔

شمع محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق

OO

دِلدارِمَن

ہمیشہ سچ بولنے کی عادت، نرم اور پاک زبان کا استعمال،غریب سے ہمدردی اور دکھ دور کرنے کی عادت، وسعتِ قلب اور مضبوط عزم اور حوصلہ۔جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپؒ نے جماعت کے لئے اِن پانچ باتوں کا لائحہ عمل پیش کیا تو پڑھتے ہی میرے منہ سے بےاختیار نکلا کہ اے یہ تو دلدارِاحمد ہیں... یقیناًان تمام خوبیوں کا مرقع یہ شخص واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔ ہر ایک کا دل رکھنے والا یہ کریم انسان، یار باوفا جس نے اپنے بیگانے سب سے وفا کی۔نہایت خوش خلق ، بےضرراور نافع الناس وجود۔ایک باہمت نہایت مخلص صابر وشاکر اور خدمتِ دین میں بشاشت اور خوشی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا احمدیت کا سچا اور مخلص فرزند جس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے مجھے دائمی رفاقت کا شرف بخشا اور تمام عمران اوصاف کے حامل شخص کے ساتھ میں نے ایک جنتی زندگی گزاری۔الحمدللہ۔

پاک اور نرم گفتگوان کا ایک ایسا وصف ہےجس کا اپنے پرائے سب معترف ہیں۔

کبھی کسی سے درشت لہجے میں بات نہیں کرتے۔ ہمیشہ شُستہ اور پاک زبان استعمال کرتے ہیں۔ بہت کم غصہ میں آتے ہیں اور گالی گلوچ ان کی ڈکشنری میں بالکل نہیں۔ لوگوں کے بقول مشن ہاؤس ٹورنٹو میں اُن کی آواز اور شخصیت ٹیلیفون اور ملاقات پر تسلی اور اطمینان کا باعث بنتی رہتی ہے۔

غرباء سے ہمدردی اور دُکھ کو دور کرنے کی عادت بچپن سے تھی بلکہ اُس زمانے میں تو 'سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے' والی بات بھی تھی۔ جب کم جیب خرچ ملتا تھا اُس وقت بھی دوسروں کی ہمدردی میں سب کچھ نثار کر دینے کی تڑپ رکھتے تھے۔ جب شروع میں تنخواہ ملنی شروع ہوئی تو ایک دن کافی رقم لیکر سڑک پر کھڑے ہو گئے اور ہر فقیر کو روپے بانٹنے شروع کر دیئے اور پھر تمام عمر خاموشی سے اسی خدمت خلق پر کمر بستہ رہے۔ اس معاملے میں لاکھوں کی بات ان کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

ہمارا گھر ہمیشہ اپنے پرائے سب کیلئے ایک ایسا ٹھکانہ رہا جہاں سب آ کر راحت و اطمینان حاصل کرتے۔ جہاں جہاں بھی رہے سب کو بلا کر رکھنا، سیریں کروانی، ان کی ہر ضرورت کا دھیان رکھنا اور ہر طرح سے ہر کام میں مددگار رہنا اُن کا طرّہ امتیاز ہے۔

مضبوط عزم اور وسعتِ حوصلہ بھی اُن کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔ کسی پریشانی یا غم کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری نہ کرتے ہوئے فوراً دوا اور دُعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اُس کے تدارک کیلئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ وسعتِ حوصلہ اتنا کہ کسی سے انتقام یا بدلہ لینا، کسی کی بدتمیزی یا طعن وتشنیع یا زیادتی کو لوٹانا یا کم از کم اُس کا جواب ہی دے دینا جیسے سیکھا ہی نہیں۔ ہمیشہ ایک بات کہ سچے ہو کر جھوٹوں کی طرح تذلل اختیار کرو۔

عفواور درگزر رہی بہتر ہے۔کسی کی ناراضگی کو دل میں دبا چھوڑتے ہیں۔ چہرے پر ایک لمحے کے لئےغم کا سایہ آتا ہےاور پھر جلد ہی مٹ جاتا ہے۔

عبادت اور نیکی تو شاید گُھٹی میں پڑی تھی۔ پانچویں کلاس میں قادیان نانی کے پاس پڑھنے کیلئے آ گئے ۔گھر کے قریب ہی مسجد دارالفضل تھی۔ جونہی اذان ہوتی نماز کیلئے چل پڑتے۔اس پر نانی باقی گھر والوں کوشرم دلاتے ہوئے کہتیں کہ دیکھو چھوٹا سا ہے۔بغیر کسی کے کہنے کے جونہی اذان ہوتی ہے،ٹوپی سر پر رکھ کر مسجد کا قصد کرتا ہے۔

یہ نیکی اور سعادتمندی ہمیشہ ساتھ رہی اور 40 سال کی عمر سے تہجد شروع کی اور پھر کبھی ناغہ نہیں ہوا۔خدا تعالیٰ نے بھی ہمیشہ رحمت کی نظر رکھی اور رؤیا وکشوف سے تسلی اور محبت کا تعلق رکھااوراسی اللہ تعالیٰ کے تعلق کے نتیجے میں تقویٰ کا ایک نور رہتا ہے۔

یہاں پر میں دلدار صاحب کی ایک خواب کا ذکر کروں گی۔آپ آنحضرت ﷺ کی اپنی اُمت سے ملاقات کا نظارہ دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی اُمت ساحل سمندر پر ایک بہت ہی لمبی اور کسی قدر چوڑی قطار میں بغرض استقبال محو انتظار کھڑی ہے۔دور سمندر میں چاندی رنگ کا ایک سمندری جہاز آ رہا ہےاور حضور ﷺ اس میں تشریف لا رہے ہیں۔حضور ﷺ سفید عمامہ اور سفید لباس میں جہاز سے اُترتے ہیں اور اپنی اُمت سے ملنے آتے ہیں۔جب اس عاجز کے پاس پہنچتے ہیں تو میرا تعارف کروایا جاتا ہے:''شیخ عبدالحکیم''۔ پھر چند لمحات کے بعد آپؐ دوبارہ اس عاجز کے پاس تشریف لاتے ہیں اوراس عاجز کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں:''انعام اللہ''۔

ویسے بھی خدا تعالیٰ نے خوبصورت شخصیت اور مزاج سے نوازا ہے۔جوانی میں

فوج کی وردی میں اور پی کیپ میں یہ ڈھول سپاہی بہتوں کیلئے آفت جاں ہوتا تھا۔

ان کی والدہ نے ان کے بچپن میں ایک خواب دیکھی کہ دلدار احمد نے پہلے منظور کی وردی پہنی ہے اور پھر مولوی شیر علی کا کرتہ پہن لیا ہے۔ یہ خواب بعینہٖ پوری ہوئی۔ ہمارے چچا بریگیڈیر ڈاکٹر منظور احمد آرمی میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی پہلے آرمی کی سروس کی اور بعد میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لیکر زندگی وقف کر دی۔ 84ء میں ان کی پوسٹنگ گلگت میں ہوئی۔ اس وقت گلگت میں مارشل لاء تھا اور وہاں کے کمانڈنٹ کے نائب کے طور پر یہ تقریب دنیاوی لحاظ سے بہت سی ترقیوں کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔ مگر انہوں نے آرمی کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہتے ہوئے اپنی مدتِ ملازمت پورا ہونے سے بہت پہلے ریٹائرمنٹ لی اور پھر جیسے شیر علی کا کرتہ پہن کر جماعت کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

راولپنڈی میں بطور نائب امیر اور ناظم انصار اللہ مقرر ہوئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ اس وقت ناظم انصار اللہ مرکز تھے۔ انہوں نے ان کی کارکردگی پر اظہار اطمینان کیا مگر بیعتوں کی کمی کا ذکر کیا۔ اس پر خدا تعالیٰ کی مدد سے غیر از جماعت دوستوں کی بسیں ربوہ لے جانی شروع کیں۔ اس کے علاوہ جلسہ سالانہ ربوہ پر نائب افسر خدمت خلق کے فرائض، گھوڑ دوڑ میں بطور چیف جج، مرکزی انصار اللہ کے اجتماع پر مجلسِ صحابہ کی صدارت کا شرف، حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ کی وفات اور خلافت رابعہ کے انتخاب پر مکمل سیکورٹی انچارج کے فرائض، ممبر تحریک جدید کا اعزاز اور ممبر مجلس انتخاب خلافت کا اعزاز ملا جس کی بنا پر لندن میں خلافت خامسہ کے انتخابی بورڈ میں شامل ہونے کا اعزاز

ملا۔الحمدللہ۔

راولپنڈی میں ناظم انصار اللہ کے فرائض کی ادائیگی میں ٹیکسلا اور پنڈی سے ربوہ تک کے سائیکل سفر کے وفود بھیجے۔غرضیکہ ہر لحاظ سے بھر پور خدمت سلسلہ کے بعد پروموشن پر فوجی فاؤنڈیشن میں لاہور ٹرانسفر ہوئی تو یہی شب و روز یہاں پر جاری ہوگئے۔ لاہور میں بھی ناظم انظار اللہ لاہور، نائب امیر جماعت احمدیہ لاہور، مرکزی دعوت الی اللہ کمیٹی کی ممبر شپ اور تین اضلاع کی نگرانی کے فرائض غرضیکہ اپنی شادی کے ابتدائی دس سالوں کے بعد سے میں نے انہیں اپنی نوکری کے علاوہ سلسلے کا کام کرتے ہی دیکھا۔درمیان میں دفتر سے آکر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹہ آرام کے بعد فوراً مسجد روانہ ہوجاتے۔دوپہر کو جب ہماری آنکھ کھلتی تو موصوف کے سلیپر پڑے دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ جاچکے ہیں۔ویسے بھی کم گو ہیں مگر پھر تو کوئی ضروری بات بھی کرنی ہوتی تو دفتر میں فون پر ہی ہوسکتی تھی۔گھر میں تو کم ہی نظر آتے تھے۔کینیڈا آنے کیلئے سب تیاریاں ہم نے اکیلے ہی کیں۔ انہیں تو صرف روانگی سے دو دن قبل امیر جماعت چوہدری حمید نصر اللہ خان صاحب نے چھٹی دی اور وہ بھی اپنے سب عزیز واقارب سے ملنے کیلئے چلے گئے۔

پھر یہاں کینیڈا میں ہمارا ورود ہوا۔بس یوں کہیئے کہ کینیڈا میں ابتدائی 6 ماہ ہی ہم نے فارغ گزارے۔وہ ازسرنو تعارف والی بات تھی۔کہاں تو بات کرنے کو وقت نہیں کہاں روز وشب باہم رفاقت ہے۔نئی دنیا اور پرانی دُنیا کے سنگم پر کھڑے ہم نے پھر سے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔مگر فرصت کے چار دن بھی خاصے مصروف تھے۔تلاشِ

روزگار میں کچھ کورسز، کچھ دوسری مصروفیات۔ پھر ملازمت کا سلسلہ چل نکلا اور دوبارہ وہی کاروبار زندگی۔ وہاں تو صرف ایک ہی غمِ روزگار میں مبتلا تھا۔ یہاں دونوں کو ہونا پڑا۔ بہر حال وہ عرصہ بھی یادگار رہا۔ ڈاؤن ٹاؤن میں ملازمت اور رہائش دونوں ہی دلچسپ تھیں۔ ڈاؤن ٹاؤن کی پیدل آوارہ گردی، مالوں میں ونڈو شاپنگ اور Lake Shore پر چہل قدمی وغیرہ جو کہ ان دنوں Homesickness دور کرنے کا ایک علاج بھی تھا۔

1991ء میں کینیڈا آنے کے کچھ ہی دیر بعد نیشنل سیکرٹری امور عامہ منتخب ہوئے۔ اُن دنوں لوگوں کی اخلاقی حالت کچھ بہتر تھی۔ عموماً لین دین کے جھگڑے ہی ہوتے تھے۔ خدا کے فضل سے سب جھگڑوں کو خوش اسلوبی سے نمٹایا اور مولانا نسیم مہدی صاحب نے کرنل کن فیکون کا خطاب دیا کہ ایسے ایسے الجھے کیس کس آسانی سے سلجھ گئے۔

1992ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ نے ان کا تقرر بطور سیکریٹری مشن ہاؤس کیا۔ وقف تو انہوں نے 1974ء سے ہی کیا ہوا تھا۔ اب باقاعدہ کام کا آغاز ہوا اور خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے عرصہ 30 سال سے یہ خدمت سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ الحمدللہ۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی کے علاوہ کبھی گھر نہیں بیٹھے۔

جب 1993ء میں ابوڈ آف پیس کی بلڈنگ تیار ہوئی تو ڈاؤن ٹاؤن سے بلڈنگ میں Move ہوئے اور تقریباً 15 سال اس میں رہنے کا موقع ملا۔ ابوڈ میں آپ نے 1993ء سے لیکر 2004ء لگاتار بعد نماز فجر روزانہ درس قرآن بمع تفسیر دیا۔ اس سے قبل ہماری زندگی میں صبح کی نماز فیملی Get together کا کام دیتی تھی کہ پوری فیملی صبح کی

نماز باجماعت ادا کرتی تھی۔ یہاں آ کر یہ موقع بھی ختم ہوا کہ صبح کی نماز اور باقی نمازیں بھی نیچے ہال میں ہی پڑھی جاتی تھیں اور پھر اس کے بعد تو کارِ جہاں دراز ہی ہوتے چلے گئے۔ کچھ کینیڈا اور کچھ جماعت کی مصروفیات، کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں۔ ہنوز کچھ ایسا ہی سلسلہ جاری ہے۔

ان کے نظام اوقات پاکستان میں بھی اور یہاں پابندیٔ وقت کے ساتھ چلتے ہیں۔ ان کے معمول میں سے کچھ وقت لینا کافی مشکل ہے۔ ہر کام کا ایک ٹائم مقرر ہے۔ لاہور میں ہمسائے کہتے تھے کہ کرنل صاحب کو دیکھ کر وقت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ بہرحال ان اوقات میں سے کچھ لینے کیلئے مجھے جرأت رندانہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیا آپ کسی حلیم، شفیق اور دلدار شخص سے ایسے رعب کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ بس یہ خدائی رعب بھی بیویوں کے اکثر نصیب میں رہتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز میں خوبصورتی ان کی کمزوری ہے۔ خاص طور پر خوبصورت نظاروں، آبشاروں، پہاڑوں، سبزہ زاروں اور باغات و نباتات کے سچے عاشق ہیں۔ خدا تعالیٰ نے رکھا بھی ہمیشہ خوبصورت علاقوں میں۔ مری، ایبٹ آباد، کوئٹہ، راولپنڈی، لاہور، کراچی اور پشاور جیسے خوبصورت شہروں میں تعیناتی رہی۔ مری میں کار چلاتے ہوئے خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے بھی خوبصورت نظاروں کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہوتے اور میں کانپتے ہوئے کہتی بھاڑ میں گئے نظارے سڑک پر نظر رکھیں۔ اس کے علاوہ بھی لمبے سفروں میں جہاں کہیں درخت، پانی اور گھاس کا ایک تنکا بھی دیکھا، بس وہی اتر کر آنکھوں کو تراوٹ بخشی اور پھر آگے کی راہ لی۔

اس حوالے سے پکنکوں اور ایڈونچرز کے بہت شوقین ہیں۔ پاکستان میں ہماری کار کی ڈکی میں مستقل پکنک کا سامان اور دیگر ضروریات موجود رہتی تھیں اور ہر چھٹی کا دن گھر کی بجائے کسی سبزہ زار میں بسر ہوتا تھا۔شروع شروع میں تو میں آمنا وصدقنا کہہ کر اس ہفتہ وار خانہ بدوشی کو جس میں تمام خوبصورت مقاماتِ پاکستان شامل ہیں، اپنی خوش قسمتی کے کھاتے میں ڈال کر خوش ہوتی رہی مگر جب انگلینڈ جا کر بھی قسمت میں تمام لندن کے خوبصورت پارک بمع لیک ڈسٹرکٹ وغیرہ ہی لکھے گئے تو پیمانہ صبر لبریز ہوا کہ لندن میں مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں کبھی اُدھر کا بھی گزر ہو۔کبھی کوئی میوزیم، کوئی تھیٹر یا کوئی اور چیز بھی ان جنتوں کے سوا۔ کیونکہ میرے اندر بہرحال اتنی زاہدانہ صلاحیتیں نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ احتجاج کام آیا اور ہم نے لندن میں کچھ اور بھی لندن والی چیزیں دیکھ لیں اور اب جبکہ ہم رہتے ہی ایک انتہائی خوبصورت ملک میں ہیں تو سمجھیں پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ مشرقی کینیڈا کے دو صوبوں کے سوا تمام کینیڈا کے خوبصورت نظاروں سے جی بھر کے فیضیاب ہو چکے ہیں بلکہ جہاں تک امریکہ میں بھی رسائی ہے، بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

سوشیالوجی یعنی محفل آرائی یا ملنا ملانا کبھی بھی پسندیدہ شغل نہیں رہا۔ یوں بھی دفتر اور پھر جماعتی مصروفیات میں ہی کافی سوشیالوجی ہوجاتی ہے جوان کیلئے کافی ہوتی ہے۔ خسارے میں تو ہماری سوشل لائف ہی رہی کہ بس تنہا تنہا میں اور میری گھریلو مصروفیات بمع بچے۔مگر اس کے علاوہ پکنکس، آؤٹنگز، سیر سپاٹے، شاپنگ کسی میں کمی نہیں رہی بلکہ پورے خاندان میں ان معاملات میں صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں۔

اسلام اور احمدیت کی تبلیغ اور پرچار کو ہر قیمت اور ہر حالت میں پہنچانا ان کی سب سے بڑی ترجیح ہے جس کیلئے بڑے سے بڑے خطرے لینا یا چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں کو بھی کرتے رہنا ان کا معمول ہے۔ چھوٹی باتوں میں تو جیسے کہیں پکنک وغیرہ پر باہر ہوں تو کھلے بندوں پبلک میں نماز پڑھ لینا یا عام روزمرہ لین دین میں اسلامی نقطہ نظر واضح کرتے رہنا یا زندگی کے ہر چھوٹے چھوٹے پہلو میں بھی اسلام احمدیت اور نظامِ جماعت کو اولین ترجیح دینا، جس سے بعض دفعہ ناپسندیدہ صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اپنی فوجی زندگی میں بھی اپنی ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے کسی پروٹوکول یا پارٹیز یا دوستوں کے گھروں میں جا کر اکٹھے بیٹھنا یا اور سوشل تقریبات، Mess یا کلب وغیرہ میں فیملی کے ساتھ شرکت ہمارے لئے شجرِ ممنوعہ تھی بلکہ ان باتوں کی وجہ سے بھی کم میل ملاقات کی عادت پڑ گئی۔

اسی طرح احمدیت کیلئے اپنے کیریئر کو نقصان پہنچنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ 1977ء میں مالیر کینٹ میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ کو اپنے گھر محفلِ سوال و جواب اور مجلس عرفان کیلئے دعوت دی تو اپنے افسران کی طرف سے ناراضگی اور تنبیہی اشارات ملنے کے باوجود یہ محفل منعقد کروائی اور اس کیلئے اپنا پرموشن داؤ پر لگا دیا۔ لیکن خدا تعالیٰ اُدھار نہیں رکھتا۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے لیفٹیننٹ کرنل سے فل کرنل کی پرموشن باعزت طریق پر ہوئی اور جلد ہوئی۔

1982ء میں جب فوج چھوڑی تو اپنی فوج سے الوداعی پارٹی میں یہی احمدیت کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری کو اوّلین فوقیت دی اور سب افسران کے سامنے بلاخوف و خطر دعوتِ حق دے دی۔ ان کے بقول:

''جب مجھے اپنی کور ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے الوداعی پارٹی دی گئی تو میں نے سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے کیلئے جو پیغام دیا تھا وہ مجھے ضرور پہنچانا چاہئے۔ چنانچہ اپنی تقریر میں مَیں نے انہیں حضورؐ کی وہ حدیث سنائی کہ جب مہدی آئے تو اس کو میرا اسلام پہنچانا خواہ تمہیں برف کی سلوں پر سے بھی گھسٹ کر جانا پڑے۔ اُس کے بعد میں نے کہا کہ دوستو وہ مہدی آچکا ہے اور اس کو میرے سمیت کروڑوں لوگوں نے مان لیا ہے۔ میں نے آپ تک یہ پیغام پہنچا دیا ہے۔ آپ اس مہدی کو قبول کرلو۔ خدا تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ میں یہ کہہ کر بیٹھ گیا لیکن مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں شور ہی نہ اُٹھ کھڑا ہو اور اس کا اثر بھی زائد نہ ہو۔

میرے دل سے یہ آواز اُٹھی کہ: لا تخشوھم واخشونی۔ (ان سے مت ڈرو۔ مجھ سے ڈرو) اس آواز کے آتے ہی مجھے کامل تسلی ہوگئی۔ اگلے دن ایک احمدی فوجی افسر نے جو GHQ میں تھے بتایا کہ اگلے روز تمہاری تقریر GHQ میں ہر جگہ موضوع سخن تھی۔''

فوجی فاؤنڈیشن کی نوکری کے دوران بھی راولپنڈی میں نائب امیر اور ناظم ضلع انصار اللہ کے کاموں کی مصروفیت رہتی تھی جو کبھی کبھی دفتری اوقات میں بھی ادا کرنی

پڑتی تھی۔ اس پر فوجی فاؤنڈیشن میں ریڈ الرٹ کا سگنل ہی رہتا تھا مگر خدا تعالیٰ نے عزت رکھی اور لاہور اس جاب پر پرموشن آئے۔ آتے ہی یہاں کے باس نے انہیں وارننگ دی کہ ہم بہت کچھ تمہارے بارے میں سن چکے ہیں اور جانتے ہیں، یہاں سنبھل کر رہنا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ وہاں میرے پاس ذمہ داریاں تھیں یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہے، اس لئے بے فکر رہیں۔ مگر یہاں آتے ہی پھر ناظم انصار اللہ اور پھر نائب امیر منتخب ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے کرم نوازی کی کہ ان کو اپنا دفتر الفلاح بلڈنگ کی اوپر والی منزل میں علیحدہ مل گیا۔

صاحبو! زندگی کے کچھ پہلو عجب ناگفتنی سے ہو سکتے ہیں اور خوامخواہ ایک مسئلہ بن سکتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی مسئلہ ہم دونوں کے ''ہونے'' اور ''لگنے'' کا ہے۔ اگرچہ ہماری عمروں میں کوئی ایسا طول طویل فرق نہیں ہے۔ یہی کوئی بارہ سال کا فرق جو کہ ہمارے زمانے کی شادیوں میں عام ہی ہوتا تھا۔ خصوصاً آج کل جبکہ میرے میاں کے پاس تجنید کا شعبہ ہے تو اکثر فیمیلیز کی تجنید کرتے ہوئے میاں بیوی کی عمروں میں چودہ یا پندرہ حتیٰ کہ بیس سال کا فرق بھی عام نظر آتا ہے تو ہم اکثر سوچتے ہیں کہ ہمارا باہمی فرق کیوں لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ بس شاید بات کچھ نظر آنے کی ہے۔ میں ''ہوں'' نہیں مگر ''لگتی'' ہوں اور وہ ''لگتے'' ہیں مگر ''ہیں'' نہیں۔ کیا کیا جائے۔ لیکن لوگوں کی چبھتی ہوئی نظروں کا نشانہ بننا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور میں اپنے متعلق تو یہی کہتی ہوں کہ مجھے زمین پر اُتارا گیا انہی کیلئے۔ نہ جانے کب یہ معاملات طے پائے مگر لگتا ہے کہ

ان کے نام کا لاحقہ میرے ساتھ ابد سے تھا۔اور پھر اس چھتر چھاؤں کے نیچے ہمیشہ سے پرسکون زندگی گزارتی چلی آئی ہوں۔میرے چہرے کی معصومیت اور طبیعت کا الھڑ پن شاید انہی دلداریوں کا نتیجہ ہے۔لوگ اکثر مجھے دیکھ کر چونک سے جاتے ہیں مگر جب زمانے کی سرد گرم کی ہوا ہی نہ لگنے دی جائے تو ایسی ہی Product وجود میں آتی ہے۔

○○

میرا علی

میں نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان پر
دور ایک چاند ہے جس پر گرہن لگا ہوا ہے لیکن
اُس کا ایک کنارہ نظر آرہا ہے جو بے حد چمک رہا
ہے اور میں کہتی ہوں کہ دراصل یہ چاند ہے مگر
ایسا نظر آرہا ہے۔

لہٰذا جب یہ چاند آج سے 40 سال
پہلے ہمارے گھر میں طلوع ہوا تو ہر طرف خوشی
اور انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ کافی عرصہ کے
بعد ہمارے خاندان میں ایک بچہ آیا تھا۔ ننھال
و ددھیال سب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے
تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ ایک بچے کی رونے کی آواز گھر میں گونجی تو سب
بے حد خوش ہوئے کہ آٹھ سال بعد ایک بچے کی آواز آئی ہے لیکن گرہن تو لگ چکا تھا جو
کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوا تو غم کے بادل بھی چھائے۔ بہر حال علی کیلئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ
میں کچھ کچھ فرزانہ بھی ہوں کچھ کچھ دیوانہ بھی۔ مگر اس کے بھولے پن کی معصومیت سادگی
اور خلوص اتنی مٹھاس اور چاشنی لئے ہوئے ہے کہ ہمیں دنیا میں اصلی فرزانہ تو یہی نظر آتا

ہے۔جس کے پیار محبت اور ہر ایک پر دل سے نچھاور ہونے کی خصوصیت سب کو اپنے حصار میں لئے رکھتی ہے۔ اس کے پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں سب ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔جبکہ آج جو ہم سب یہاں بیٹھے ہیں تو اس عافیت میں علی کی شخصیت کا اہم کردار ہے۔خدا تعالیٰ نے اس کے طفیل ہمارا یہاں آنے کا وسیلہ بنایا کیونکہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نے اسے اپنا دوست بنایا ہوا تھا اور حضورؒ اس سے بہت شفقت اور محبت کا سلوک فرماتے تھے۔آپؒ نے ہی اسے کینیڈا جانے کیلئے کہا۔ چنانچہ حضورؒ کے ارشاد پر ہم یہاں آئے۔ایک طرح سے ہم علی کا یہ احسان نہیں چکا سکتے ورنہ ہم بھی وہاں کی آزمائشوں سے دوچار رہتے۔ ہم سب اپنی خوشیوں میں علی کے رہین ہیں۔

ایک ماں کی حیثیت سے علی کیلئے میرا پیار قدرتی تو ہے ہی مگر جب میں اپنی روزمرہ کی زندگی میں اُس کی تمام عادات وفضائل کا بالکل غیر جانبداری سے جائزہ لیتی ہوں تو بے اختیار میرے دل سے اُس کیلئے دادِ تحسین اُبھرتی ہے۔ میں بالکل ایک عام انسان کی نظر سے جب اُسے دیکھتی ہوں تو بخدا مجھے اُس میں ایک ہیرو کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔ایک ایسا سعید الفطرت انسان عام حالات میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے جس میں منافقت اور برائی کی کوئی ملونی نہ ہو۔اور وہ سب کیلئے سراپا خدمت، ایثار، محبت اور خلوص کا پیکر ہو۔ جو ہر ایک کے لئے سراپا دعا بھی ہو اور دوا بھی۔ اپنے ہاتھ سے اپنی خدمت سے۔ مالی امداد سے اور سب سے بڑھ کر اپنی دعاؤں سے سب کے سروں پر چھتر چھاؤں بننا چاہتا ہو اور پھر بنتا بھی ہو۔جتنی اس کی Limits ہیں اُن کے مطابق وہ

اپنی طرف سے بھرپور حق ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اگر کچھ نہ کر سکے تو بقول اس کے میرے پاس دعا تو ہے ناں، میں وہ تو کر سکتا ہوں اور پھر اس کی دعاؤں میں بلاشرکتِ غیرے ہر ایک حصہ دار ہے چاہے اُس نے اُسے کتنا بھی دکھ پہنچایا ہو۔ وہ علی کی دعا سے محروم نہیں رہتا۔ گالیاں سن کر دُعا دو پا کے دُکھ آرام دو کی عملی تفسیر علی کا دوسرا نام ہے۔

اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کو اپنا فرضِ اولین سمجھنے والا یہ اویس قرنی ہر طرح دِن رات اُن کی خدمت کرتا اور دعائیں لیتا ہے۔ ہر پہلو سے ہمیں خوش کرنے اور آرام دینے کی کوشش میں لگے رہنا، صبح ماں کیلئے ناشتہ بنا کر اُس کے سرہانے رکھ کر اُسے جگانا، شام کو والد کی پسند کے پروگرام لگانا، نماز کی تیاری اور امامت کروانا، کھانا پیش کرنا، اپنی بساط کے مطابق بھرپور خوش کرنا۔ جمعہ والے دن صبح کی نماز پڑھانا اور وقت پر ایم ٹی اے لگا کر خطبہ کی تیاری میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ ماں کے ساتھ صفائی اور کچن کے کام، بازار سے سودا سلف بھی لے آنا۔ مہمانوں کی خاطر مدارات غرضیکہ کوئی بھی کام جو اُس کی بساط میں ہوا احسن رنگ میں کر دینا۔ بہن بھائیوں اور بھتیجوں کے ساتھ پیار خیال اور دعا اور تحفے تحائف۔

طبیعت میں شرافت، سعادت نیکی اور عبادت خدا تعالیٰ کی ودیعت کردہ خاص خصوصیات ہیں۔ پنج وقتہ نماز، رمضان کے پورے روزے رکھنا اور شام کو اکثر ہمیں تراویح بھی پڑھانا، حتیٰ الوسع شوال کے روزوں کی بھی کوشش کرتے رہنا۔ اس کے علاوہ بھی محرم کے روزوں کا اہتمام کرنا، جمعرات کا روزہ رکھنا، نوافل اور تہجد کی کوشش کرتے

رہنا،خصوصیت سے درودشریف پڑھنے کا بہت اہتمام رکھتا،کوئی بھی پریشانی ہو درود شریف کو مزید بڑھا دینا۔ اکثر کہتا ہے کہ درودشریف مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔کچھ شاعری کا بھی شوق ہے۔اکثر اپنی شعروشاعری میں خدا تعالیٰ کی حمد کے اشعار نظم کرتا رہتا ہے۔جیسے ؂

اے خدا مجھ میں باقی نہ رہے کچھ تیرے سوا
وہ کون ہے جس کو میں کہہ سکوں اپنا
میرا جو کچھ ہے وہ بس تو ہی تو ہے اے خدا

حضور کو باقاعدگی سے دعا کیلئے خط لکھنا بھی اس کے معمولات میں ہے۔سب ملنے والوں کیلئے تحفے تحائف خرید کر تیار رکھنا اور دینا۔

اپنی ذاتی زندگی میں عادات واطوار بہت باقاعدہ، ذاتی صفائی ، روز نہانا، صبح وشام دانتوں کی صفائی ، باہر نکلتے وقت اچھا ڈریس اپ ہونا،شیو اور آفٹرشیو، صاف ستھرے رہنا،حتی الوسع واک کرنا، پڑھنا پڑھانا ، مذاق میں پھکڑ پن اور گھٹیا پن پسند نہ کرنا۔حتیٰ کہ ڈرامے اور فلمیں بھی بہت اچھے معیار کی دیکھنا پسند کرنا۔ چیزوں کی چوائس بھی کلاسک ہوتی ہے۔غرضیکہ میں عموماً جب اُسے گہری نظر سے دیکھتی ہوں ایک ماں کی نظر کے علاوہ تو بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔خدا تعالیٰ نے خوبصورت سیرت کے ساتھ خوبصورت شکل وقدروقامت سے نوازا ہے۔اب موٹاپے نے حلیہ بگاڑ رکھا ہے مگر پھر بھی جوانی میں جب موصوف تیار ہوکر باہر نکلتے تو انسان دم بخود رہ جاتا۔

دیوانگی وفرزانگی کے سنگم پر کھڑے اس شخص کی اگر پرکھ کرنی ہوتو اس کے دوستوں کی محبت سے کی جاسکتی ہے جو وہ اس پر نثار ہوتے ہوئے کرتے ہیں اور جس پر میں خود بھی تعجب کرتی ہوں اس کے دوستوں میں اچھے پڑھے لکھے پروفیسر، رائٹر شاعر اور سکالر حضرات شامل ہیں جو واقعی اس سے دل سے پیار کرتے ہیں اور گھنٹوں اس سے فون پر محوِ گفتگو رہتے ہیں اور اس کے ساتھ مل کر شامیں مناتے ہیں۔

آج کی شام میں اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اور کچھ مسکراتے ہوئے احوالِ علی لکھ رہی ہوں۔ یہ گرہن زدہ چاند جب سے میرے صحن میں اُترا ہے اندھیرے نہیں اجالے ہی بکھیرتا چلا آیا ہے۔ جو اگر ہیرو نہیں تو ہیرو سے کچھ کم بھی نہیں۔

ہم دونوں اپنے بعد اس کیلئے فکرمند رہتے ہوئے اس کو فقط خدا کے سپرد کرتے ہوئے محودعا رہتے ہیں کہ وہ خود ہی اس کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین۔

دُعا سے قبل ملے تجھ کو جو تو چاہے
کہ خود دعا کو تیرے ہاتھوں کی ضرورت ہو

○○

سفرنامے

سُوئے حرم

برسوں پہلے کی بات ہے میرے ایک عزیز اسلام آباد میں وزارت حج میں کام کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے ایک دفعہ حجِ زیارات کی دعاؤں کی کتاب بطورتحفہ مجھے دی۔ ورق گردانی کے دوران پہلے پہل تو تمام مقاماتِ مقدسہ کے نام سوائے خانہ کعبہ، حجرِ اسود، مقام ابراہیم اورصفا مروہ کے میرے سر سے گزر گئے۔ ملتزم،مزدلفہ،عرفات،حطیم یہ سب کیا ہیں، مجھے کوئی خاصی دلچسپی نہ ہوئی۔ لیکن ان تمام مقامات پر پڑھنے والی دُعائیں پہلے دن سے میرے دل کو لگ گئیں۔ پھر کافی عرصہ تک میرا معمول یہ رہا کہ ہر روز اس کتاب کو شروع سے لیکر آخر تک پڑھتی اور اکثر دُعائیں مجھے اُن میں سے زبانی یاد ہو گئیں۔ کبھی کبھی دل میں یہ خواہش ہوتی کہ کاش یہ سب دُعائیں اپنی اصل جگہ پر بھی جا کر پڑھ سکوں۔ مگر بظاہر کوئی ایسی صورت پاکستان میں نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے یہ خواہش بس ایک خواہش ناتمام ہی لگتی تھی۔ لیکن جب سے کینیڈا میں رہائش ہوئی تب سے اس خواہش نے سر اُٹھانا شروع کیا اور آخر کار خدا تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہم سب کو وہاں جانے کا موقع مل گیا۔

جدہ کے رستے میں جہاز پر عجیب خوشی، رقت اور کچھ بے چینی کا احساس طاری رہا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب کے گھر جا رہے ہیں۔ کبھی یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی ہم اس سفر پر رواں دواں ہیں۔ کبھی نوافل کبھی درود شریف اور تسبیح مسلسل وردِ زبان اور

ساتھ ہی وہاں پر عبادت احسن رنگ میں کرنے کی دعا۔ جدّہ ایئر پورٹ پر اُترتے ہی اپنے قدموں پر نازاں ہوئے کہ اللہ کے گھر کی زمین کو چھو رہے ہیں۔ وہ رات ہم نے جدّہ میں ایک بہت ہی مخلص بھائی منظور شاہد صاحب کے ہاں گزاری۔ خدا تعالیٰ اُن کو بے حد حساب واجر دے۔ ایسے لوگ دنیا میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ اتنی محبت، اتنا خلوص اور اسقدر قربانی کہ ہم اپنے پندرہ دن کے بابرکت سفر میں ایک ایک لمحہ اُن کے مرہون احسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر بلایا تو میزبانی کیلئے ایسا اعلیٰ انتظام فرمایا کہ یہ سفر ایک روحانی پکنک ثابت ہوا۔ اُن کی مہربانیاں اور عنایتیں اخوت و پیار کی ایک نہایت عمدہ مثال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی میزبانی ان سے کروائی ہے تو اجر بھی وہی دینے والا ہے۔ ہم تو ہمیشہ اُن کیلئے ویسی ہی پر خلوص دعائیں کر سکتے ہیں جیسا کہ سلوک اُنہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔

سوئے حرم ہمارا پہلا سفر جدّہ سے مکہ کی طرف عجب جوش جذبہ اور سوز لئے ہوئے تھا۔ جمعہ کا مبارک دن اور نماز خانہ کعبہ میں ادا کرنے کا سرور۔ عرب کے ''ماڈرن'' صحرا کا نظارہ کہ درمیان میں خوبصورت عمارتیں اور چھوٹی چھوٹی نئی بستیاں کبھی کبھی کسی پہاڑی کے دامن میں چند بکریوں اور اُونٹوں کو پھرتے دیکھ کر پرانے زمانے کی جھلک اچھی لگتی۔ خوبصورت چوڑی سڑک جس پر مختلف بورڈوں کے ساتھ ساتھ کئی Monuments بھی اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ سب سے خوبصورت ایک بہت بڑی عظیم الشان رحل کا نظارہ ہے جو سڑک کے عین اوپر ایستادہ ہے۔ اس رحل کے نیچے سے گزرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے کہ جہاں سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

غیر مسلموں کے لئے سڑک وہاں سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور چیک پوسٹ پر سب سے پوچھ گچھ کے بعد مکہ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ جلد ہی مکہ کی پہاڑیاں نظر آنے لگیں اور آبادی شروع ہوگئی۔ ایک ایک اِنچ کے نظارے کو آنکھوں میں سمو لینے کی کوشش کی کہ یہ تو میرے اللہ میاں کا گھر ہے۔ یہ تو میرے رسول کا گھر ہے۔

ماڈرن مکہ اب کافی سرسبز ہو گیا ہے۔ سڑکوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے درختوں کی قطاریں اُس کی خشکی کو طروت بخش رہی تھیں۔ اُونچی اُونچی عمارتیں اور ہوٹل جا بجا نظر آتے تھے جبکہ اُونچی پہاڑیوں پر بنے ہوئے پرانے گھر مکہ کی اصلی تصویر پیش کر رہے تھے۔ حرم شریف مکہ کے عین وسط میں آ گیا ہے۔ چاروں طرف سے اُونچے ہوٹل بازار اور پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ خدا تعالیٰ کا گھر اپنی عظمت اور شکوہ میں لاثانی ہے۔

حرم شریف میں داخلہ مختلف بڑے بڑے دروازوں میں سے ہوتا ہے۔ جو مختلف اطراف میں بنے ہوئے ہیں۔ ہم بابِ فہد سے اندر داخل ہوئے۔ بڑے ہال کی محرابوں سے گزرتے ہوئے خانہ کعبہ کی پہلی جھلک جب نظر آئی تو قدم وہیں رُک گئے۔ سانسیں جیسے تھم سی گئیں خانہ کعبہ کے جلال رعب اور عظمت نے مسحور اور دل بخود سا کر دیا۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر یاد آیا کہ او ہو یہ تو وقتِ دُعا ہے۔ لہٰذا فوراً دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے اور حضرت خلیفہ اوّل ؓ کی دُعا دہرائی اور اُس کے علاوہ بھی جو کچھ مانگا یاد آیا مانگتے گئے۔ وہاں سے قدم آگے بڑھایا اور صحنِ حرم میں سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر اِردگرد کا نظارہ کیا۔

صحن کے درمیان میں خانہ کعبہ اپنے رعب اور جلال کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے

رہا ہے اور چاروں اطراف خوبصورت سنگِ مرمر کی محرابیں، سیڑھیاں اور فرش اُس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ خانہ کعبہ کا صحن نہایت کشادہ اور خوبصورت ترین سُرخ قالینوں سے مزین ہے۔ جو طواف کی جگہ چھوڑ کر گولائی میں خانہ کعبہ کے اردگرد فرش پر بچھے رہتے ہیں۔ سنہری جالیوں کے خوبصورت اور نفیس سٹینڈ بھی مختلف زاویوں سے درمیان میں رکھے ہوئے ہیں جن پر قرآن شریف رکھے رہتے ہیں۔ ان قالینوں کے ساتھ مختلف راستے آنے جانے کیلئے بنے ہیں۔ جہاں ٹھنڈے یخ آبِ زم زم سے بھرے ہوئے خوبصورت کولر لائینوں میں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آتے جاتے آبِ زم زم سے پیاس بجھانے سے جو سکون ملتا ہے وہ نا قابل بیان ہے۔

صحنِ کعبہ میں جو اطراف میں مردوں کے لئے نماز کی جگہ بنی ہے اور ایک طرف چاہِ زم زم کے پاس عورتوں کیلئے جگہ مخصوص کی گئی ہے۔ سنہری جالیوں سے پارٹیشن سی کر دی جاتی ہے اور باہر ''شرطیاں'' ڈیوٹی پر متعین رہتی ہیں۔

ہم نے اپنے عمرے کا آغاز طواف کیلئے حجرِ اسود کی طرف سے شروع کیا۔ دعاؤں کی کتابیں ساتھ تھیں جن سے سب لوگ دُعائیں پڑھ رہے تھے۔ طواف کے ہر پھیرے کی اپنی علیحدہ دُعا ہے۔ کچھ لوگ گروپوں میں بھی تھے۔ اُن کے گروپ لیڈر اُونچی آواز میں دُعا پڑھتے اور باقی سب لوگ دہراتے جاتے۔ اصولاً ہر پھیرے کے بعد حجرِ اسود کو بوسہ دینا ہوتا ہے لیکن ایک حجرِ اسود اور ہزاروں لوگ اُس پر نثار ہونے کیلئے تیار۔ نتیجہ وہی جو کہ ہونا چاہئے جو دھکم پیل ہر وقت یہ کالا پتھر ملاحظہ کرتا ہے وہ دنیا میں شاید اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ ہم تو دُور سے ہی ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگا کر ہوائی

بوسہ ارسال کرتے رہے۔ حجرِ اسود سے معذرت کے ساتھ کہ جناب مجبوری ہے۔

خانہ کعبہ کے طواف کی کیفیت بھی بیان نہیں کی جاسکتی۔ اوّل تو یہ احساس کہ ارے اتنے نزدیک ہیں۔ اُس کی دیواروں کو ہاتھ لگایا۔ کپڑے کو پکڑ پکڑ کر دُعائیں کیں۔ دروازے کی چوکھٹ کو پکڑا۔ حطیم میں دیوار کے ساتھ سجدہ ریز ہوکر دُنیا جہان کی دُعائیں کیں۔ جیسے ایک لاڈلا اور ضدی بچہ ماں باپ سے مانگتا ہے کہ یہ بھی چاہئے وہ بھی چاہئے، اور یہ بھی احساس ہوا کہ مانگ رہے ہیں تو ملیں گی بھی۔ کس قدر سکون اور اطمینان سا ملتا ہے۔ اللہ میاں کے گھر میں اگر بس میں ہو تو کبھی بھی وہاں سے جدا نہ ہوں۔ میں حجرِ اسود والی کسر حطیم میں جی بھر کے نکال لیتی اور خوب نوافل ادا کرتی۔ میزابِ رحمت اور حطیم دونوں دعا کی قبولیت کے مقامات ہیں۔ خانہ کعبہ کا پرنالہ میزاب کہلاتا ہے اور بیت اللہ کی دیوار کے سامنے جو گول دیوار ہے اُس کی اندرونی جگہ کو حطیم کہتے ہیں۔ یہ حصہ خانہ کعبہ میں شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تعمیر کعبہ کے وقت کسی وجہ سے یہ جگہ خالی چھوڑی گئی تھی۔ اس لئے اس میں نماز ادا کرنا خانہ کعبہ میں نماز ادا کرنے کی طرح ہے۔

طواف کے سات چکر لگانے کے بعد مقامِ ابراہیم میں نوافل ادا کئے اور پھر صفا اور مروہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مسجد الحرام میں حجرِ اسود کے بالمقابل کافی فاصلے پر ایک گنبد نظر آتا ہے جو صفا کی پہاڑی کے اُوپر ہے۔ صفا اور مروہ دراصل دو پہاڑیاں تھیں جن کی چوٹیاں مسجد الحرام کے شمالی دالان کے دونوں کونوں میں اُٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب ہی وہ جگہ تھی جہاں حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنی بیوی حضرت حاجرہ

اور شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو چھوڑ گئے تھے۔ پانی کی تلاش میں حضرت حاجرہ نے صفاء مروہ کے سات چکر لگائے ۔ ان پہاڑیوں کا درمیانی حصہ نشیب میں تھا۔ لہٰذا حضرت حاجرہؓ ننھے اسماعیل کے نظر سے اوجھل ہوجانے کے سبب اس جگہ سے دوڑ کر گزرتی تھیں۔صفاء مروہ ایک بچے کی پیاس اور ماں کی ممتا کی بے تابی بےقراری اور دیوانہ وار پانی کی تلاش کی سعی کی کہانی ہے جسے آج بھی لاکھوں لوگ اُسی ماں کی پریشانی اور پانی کی سعی کی اتباع میں صفاء مروہ کے سات چکر لگا کر دُہراتے ہیں۔صفاء مروہ کی پہاڑیاں تو اب گھس کر ٹیلے رہ گئی ہیں جنھیں خوبصورت گنبد اور قرآنی آیات سے سجایا گیا ہے۔اور ان کی چڑھائی کو بتدریج اس طرح نرم ملائم اور آسان بنا دیا گیا ہے کہ چڑھنا پر لطف اور رُوحانی سکون کا باعث بنتا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان سعی کے رستے کو سنگِ مرمر کے فرش والا دومنزلہ برآمدہ بنا دیا گیا ہے اور اُس کی دیواروں کو خوبصورت ستونوں اور جالیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔جن میں لگے ایئر کنڈیشنوں میں سے نکلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا سعی کرتے ہوئے جسم وجان کو مزید روحانی وجسمانی سکون دیتی ہے۔ ذو قبلتین دو سبز ستون ہیں جہاں سے حضرت اسماعیلؑ کے اُوٹ میں ہوجانے کے سبب حضرت حاجرہؓ وہ جگہ دوڑ کر پار کیا کرتی تھیں۔اُس اتباع میں آج بھی وہاں سے لوگ دوڑ کر گزرتے ہیں۔ہم نے صفا و مروہ کے سات چکر لگا کر اپنی سعی مکمل کی اور آخر میں مروہ پر ایک اِنچ بال کٹوانے کی سنت پوری کر کے واپس بیت الحرام میں آ کر دو نفل نماز ادا کی اور اس طرح ہمارا ایک عدد عمرہ مکمل ہوگیا۔الحمدللہ۔

واپسی پر زم زم کے کنوئیں کی زیارت کی۔ یہ کنواں حرم شریف کے صحن میں نیچے

تہہ خانے میں ہے۔ خانہ کعبہ کے دروازے سے اس کا فاصلہ تقریباً 200 فٹ ہے۔ یہاں عورتوں اور مردوں کیلئے علیحدہ علیحدہ پانی پینے کی جگہ بنادی گئی ہے اور حجاج کی سہولت کیلئے حرم شریف میں بھی آبِ زم زم سے بھرے ہوئے کولر قطاروں میں مختلف رستوں پر رکھے رہتے ہیں۔ جہاں آتے جاتے ٹھنڈا پانی عجب طراوت بخشتا ہے۔

مکہ میں ہمارا قیام ایک ہفتہ رہا۔ وہ دن یوں لگتا ہے کہ حاصلِ زندگی تھے۔ گھر میں توصرف سونے کی غرض سے آنا ہوتا تھا۔ رات اڑھائی بجے سے لیکر صبح نو بجے تک حرم شریف میں اللہ تعالیٰ کے گھر کے بالکل آس پاس عبادت کا جو سرور حاصل ہوتا تھا وہ زندگی کی تمام نعمتوں میں سے افضل ہے۔ جواب تک ہمیں ملیں۔ نو بجے ہم براستہ ہوٹل ناشتہ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آتے اور گیارہ بجے تک سوتے۔ پھر اُٹھ کر نہا دھو کر تیار ہوکر واپس حرم شریف پہنچ جاتے۔ نمازیں ادا کر کے کافی دیر وہاں قرآن شریف پڑھتے اور پھر نمازِ دید ادا کرتے یعنی خانہ کعبہ کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھے رہتے۔ نہ جانے اس گھر میں کیا کشش ہے کہ وہاں سے نظریں نہیں ہٹتی۔ بمشکل تمام بادلِ بخواستہ وہاں سے اُٹھ کر دوبارہ رستے میں کھانا کھاتے ہوئے گھر آتے اور پھر سے تیار ہوکر شام سے پہلے وہاں پہنچ جاتے۔ اِدھر اُدھر کچھ دیکھنے کی نہ تمنا تھی اور نہ وقت۔

شام کی نماز سے پہلے کا وقت میرا بہت پسندیدہ وقت ہوتا تھا۔ سامنے خانہ کعبہ کے آس پاس طواف کرنے والوں کے غول رواں دواں صحنِ حرم میں گول دائروں میں سُرخ قالینوں کے اوپر نمازی صفیں بنا کر بیٹھے ہوئے۔ خواتین چاہِ زمزم والی طرف نماز کیلئے تیار اِدھر اُدھر کی سیڑھیوں پر۔ اکثر عرب خواتین قطار در قطار سفید لبادوں میں

ملفوف مکھن کے پیڑوں کی طرح رکھی ہوئی۔ سامنے خانہ کعبہ اپنے ابنوسی لباس میں ملبوس اپنی مقناطیسی کشش کے ساتھ دِلوں کو اپنی طرف کھینچے ہوئے۔ ڈھلتی ہوئی شام میں حرم شریف کی روشنیاں جل اُٹھتیں اور صحنِ کعبہ چاروں طرف سے نمازیوں سے سجا ہوا اسقدر دلآویز لگتا اور دِل چاہتا کہ وقت تھم جائے اور میں اپنے ربّ کے حضور اپنے رب کے گھر میں یونہی اُس کو چاہتے ہوئے زندگی گزار دوں۔ یکا یک اذان بلند ہوتی اور دلوں پر خدا تعالیٰ کا رعب اور جلال طاری ہو جاتا۔ صفیں درست ہوتیں اور سب رب کعبہ کے حضور دست بستہ حاضر ہو جاتے۔

ہم لوگ عشاء کی نماز کے بعد گھر آ جاتے۔ ہمارا قیام بابِ عبدالعزیز کی طرف سے تھا۔ وہ سات دن بے حد مصروف گزرے۔ تیسرے دِن ہمارے جدّہ والے میزبان بھائی نے گاڑی بھیجی کہ آپ مکہ کی زیارتیں کرلیں۔ چنانچہ ہم نے غارِ حرا، غارِ ثور، میدان عرفات، مزدلفہ، منیٰ تمام مساجد اور جبلِ نور غرضیکہ ہر وہ جگہ دیکھی جو کتابوں میں پڑھی تھی۔ جبل قیس تو خانہ کعبہ کے سامنے والا پہاڑ تھا جہاں کہتے ہیں کہ شق القمر کا واقعہ نظر آیا تھا۔ حضورؐ کا گھر بھی ایک لائبریری کی صورت میں نزدیک ہی تھا۔ اس کے علاوہ شعبِ ابی طالب کا بورڈ بھی ایک شاہراہ پر لکھا نظر آیا۔ میری بے حد خواہش تھی کہ مکہ کی گلیاں پھر کر دیکھوں۔ مگر وقت اس قدر قیمتی تھا کہ حرمِ کعبہ کو مکہ کی گلیوں پر نثار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید پھر خدا تعالیٰ یہ خواہش بھی پوری کردے۔ غارِ حرا پر جانے کی بھی حسرت ہی رہی۔ کافی اونچائی تک پہنچ کر ہمت ہار دی۔ دراصل مسلسل طواف اور سعی نے کافی تھکایا ہوا تھا۔ اس پر تمام دن سب زیارتوں کو دیکھنے میں مصروف رہے اور آخر میں غارِ حرا پر پہنچے تو

کافی تھک چکے تھے۔ ویسے غارِ حرا کافی اُونچی پہاڑی پر واقع ہے۔ مکہ شہر سے کافی دور بھی ہے۔ ہم یہی سوچتے رہے کہ حضورؐ کس قدر Tough تھے کہ اکثر یہاں آ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی عجیب سالگا کہ مکہ ویسے تو کافی ماڈرن کر دیا گیا ہے۔ مگر غارِ حرا کے رستے کو ابھی تک اصلی حالت ہی میں رکھا گیا ہے۔ اوپر جانے کیلئے کوئی Proper راستہ نہیں بنایا گیا۔ شائد مصلحتاً ایسا کیا گیا ہو کہ چشمِ تصور حضورؐ کو اس طرح اوپر جاتے ہوئے دیکھے۔ (اب اوپر نہ چڑھ سکنے کے کچھ تو جواز ہم نے بنائے ہی تھے) بہر حال خود کو کوستے ہوئے شام کو ایک عدد اور عمرہ کر کے واپس آئے۔

مکہ مدینہ میں کینیڈا والی کیفیت اکثر نظر آئی کہ Multi Cultural کافی تھا۔ ہر دیس کے مسلمان جا بجا نظر آتے تھے مگر بیرونی عناصر میں سے انڈو پاک کے لوگوں کی اکثریت غالب لگتی تھی۔ اسی طرح مختلف ملکوں کے ہوٹلوں اور کھانوں کی بھی کافی ورائٹی تھی۔ ہم صبح و شام جس رستے سے آتے جاتے تھے وہاں کافی تعداد میں عربی اور پاکستانی ہوٹل تھے۔ ایک دو دفعہ ہم نے عربی کھانوں کی بھی ٹرائی کی مگر کوئی خاص لطف نہیں آیا۔ جبکہ پاکستانی کھانے تو اِس ذات کے وہاں گرما گرم بن رہے ہوتے تھے کہ سبحان اللہ۔ کافی عرصہ کینیڈا میں رہنے کی وجہ سے پاکستانی ہوٹلوں کے ذائقے کچھ بھول چکے تھے۔ مگر صبح صبح حرم شریف سے واپسی پر رستے میں گرما گرم حلوہ پوری، تازہ بتازہ گرم پراٹھے بڑے بڑے ''تووں'' پر سے اترتے ہوئے بیکریوں سے تازہ خطائیوں کی خوشبو۔ نہاری اور پایوں کی مصالحے دار خوشبوئیں اور تنوروں سے گرم گرم تازہ روغنی نانوں کی چمک الائچی والی سبز چائے اور لپٹن Yellow Lable کی خوشبودار لپٹیں راستہ

روک روک لیتیں۔ رات بھر کے روحانی سرور کے بعد لذتِ کام و دہن دو آتشہ ہو جاتی اور گھر آ کر خوب تھک کر جو سوتے تو بمشکل کہیں 11 بجے آنکھ کھلتی مکہ کے یہ سات دن پلک جھپکتے میں تمام ہوئے اور مکہ کو چھوڑنے کا غم دل کو کچوکے لگانے لگا۔ اگر چہ مدینہ کی کشش بھی کچھ کم نہیں تھی مگر خدا تعالیٰ کے گھر سے جدائی بہت مشکل لگ رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے مقدس گھر خانہ کعبہ کے دیدار سے مُشرف ہو کر اور عمرہ کے مبارک فریضہ سے سبکدوش ہونے کے بعد زندگی کی ایک سب سے بڑی سعادت مدینہ منورہ کی جانب روانگی ہے۔ مقامِ ابراہیم پر اکثر حضرت ابراہیمؑ کی دُعا یاد آتی جو انہوں نے اللہ کا گھر تعمیر کرتے ہوئے کی تھی کہ:

''اے رب ان لوگوں میں سے خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول
اٹھائیو جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے۔''

دُعائے خلیل رسولِ پاکؐ کی صورت میں پوری ہوئی اور وہ سرکارِ دو عالم بن کر دنیا میں تشریف لائے۔ وہ جو اللہ کے بعد سب سے بہتر، وجہ تخلیق کائنات وہ جن ہر فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ وہ جن کے ذکر سے دل کو سیری نہیں ہوتی وہ جو دونوں جہانوں کے بادشاہ ہیں وہ جن کی گدائی کو بادشاہ ترستے ہیں دل سوئے مدینہ کھچا جاتا ہے۔ مکہ سے مدینہ کا سفر محبت کا سفر ہے۔ دل کی دھڑکنوں کا سفر ہے۔ آنکھوں سے رواں آنسوؤں کا سفر ہے اور چشم تصور کا سفر ہے۔

مکہ سے مدینہ کی طرف جونئی ہائی وے اب بنی ہے وہ اُس راستے پر بنائی گئی ہے۔ جو حضورؐ نے ہجرت کے موقع پر اختیار کیا تھا۔ چنانچہ چشم تصور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کو اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو وہاں سے گزرتے پل پل دیکھتی رہی۔کس قدر دشوار گزار راستے تھے۔میلوں کالے پہاڑ اور بڑے بڑے کالے پتھروں کی بجری زدہ زمین۔ خدا تعالیٰ کے توکل کے سہارے یہ مشکل ترین وقت میرے پیارے رسولؐ نے کس طرح حوصلے اور سکون سے طے کیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خوف اور بے قراری کو ''ان اللّٰہ معنا '' کہہ کر دور کیا۔سُراقہ کو کسریٰ کے کنگن پہننے کی بشارت دی اور اپنے جاں نثار رفیقِ خاص کے ساتھ مدینہ کے افق پر بدرِ مُنیر بن کر طلوع ہوئے۔اُس شاہراہ کے آغاز میں ہی صلو علیہ تسلیما والی آیت لکھی دیکھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو اور زبان پر درود شریف جاری ہو جاتا ہے۔راستے میں جا بجا دوسری قرآنی آیات بھی لکھی ہوئی تھیں۔تقریباً 6 گھنٹے کے سفر کے بعد دیارِ رسولؐ میں داخل ہوئے۔وہ دیار جس کی برکتوں اور فضیلتوں کا ہو کیا بیاں۔جس کی گلیوں میں اولیاء کرام نے مدتوں جوتے تک نہیں پہنے۔جس زمین کا چپہ چپہ بابرکت ہے۔جذبہ شوق سبز گنبد کو مدینہ پہنچتے ہی تلاش کرنے لگا۔یہی جی چاہتا تھا کہ سب سے پہلے سبز گنبد کی جھلک سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو پھر کچھ اور سوچیں۔بہر حال قیام و طعام کا بندوبست کر کے نہا دھو کر مسجدِ نبوی کی طرف روانہ ہوئے۔ہمارا ہوٹل مسجد سے پانچ سات منٹ کی واک پر تھا۔کسی نعت کا ایک مصرعہ ہونٹوں پر آرہا تھا کہ ؎

مدینے کا سفر ہے اور قدم آہستہ آہستہ

دل میں محبت و عقیدت،شوقِ دید اور عالمِ وارفتگی پاسِ ادب و تعظیم و تکریم۔قدم واقعی آہستہ اُٹھ رہے تھے۔

مسجد نبوی کی تعمیر نوفنِ معماری کا ایک حسین شاہکار ہے۔موجودہ مسجد کی توسیع 1400 سال کی تاریخ میں آج تک کسی عہد میں نہیں ہوئی۔ یہ موجودہ شاہ فہد کی ذاتی دلچسپی اور عشقِ رسولؐ کے باعث مکمل ہوئی۔

موجودہ توسیع سے پہلے مسجد نبوی کا کل 16500 مربع میٹر تھا۔اور 28 ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔اب مسجد نبوی کا کل رقبہ 98500 میٹر کے برابر ہے۔جو پچھلی تعمیر سے 500 گنا زیادہ ہے۔چھت پر بھی 67 ہزار میٹر اضافی جگہ نماز کیلئے موجود ہے۔ عام دنوں میں ساڑھے چھ لاکھ نمازی بآسانی نماز ادا کر سکتے ہیں۔حج کے دنوں میں یہ تعداد 10 لاکھ تک بھی ہوسکتی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ حضورؐ کے زمانے کا پورا مدینہ منورہ آج کی مسجد نبوی کے اندر سما گیا ہے۔ویسے بھی مختلف دروازوں پر تمام مشہور صحابہ کرامؓ کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان ہی جگہوں پر ان صحابہ کرامؓ کے گھر ہوتے ہوں۔(تحقیق طلب ہے)

اندرونی اور بیرونی ہر طرف سے مسجد دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔اندر نہایت دیدہ زیب قیمتی فانوس، روشنی کا جدید نظام، اذان کا وقت، ساؤنڈ سسٹم کے ذریعہ آواز رُوح کی گہرائیوں میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایئر کنڈیشنگ کا جدید ترین نظام، خوبصورت چھتیں جن میں سے کچھ حصہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتے ہیں غرضیکہ ہر چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

چودہ سو سال پہلے یہ مسجد سادہ مگر پروقار عبادت گاہ تھی۔جس کی تعمیر میں کھجور کے پتے اور تنے استعمال ہوتے تھے۔ بارش ہوتی تو چھت ٹپکتی تھی۔حضور ﷺ اور دیگر

صحابہؓ اس گیلی زمین پر بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو جاتے۔ دس سال تک سرکارِ دوعالمؐ نے اس مسجد میں نمازیں ادا فرمائیں۔ یہ مسجد اسلام کی تبلیغ و تعلیم کا مرکزِ اولین بن گئی۔ اسی مرکز سے اسلام کو وہ ترقی اور شان و شوکت نصیب ہوئی جو تاریخ عالم کا ایک سنہری باب ہے۔ آفتاب رسالت یہیں سے نصف النہار پر پہنچا اور دور دراز کے علاقے بھی اس کی شان و شوکت سے منور ہوئے۔ یہی وہ اوّلین ادارہ تھا جہاں سے کردار و عمل کی تعمیر ایسی ہوئی کہ دُنیا کو متاثر کر دیا۔ مسجدِ نبوی میں چشم تصور تاریخ اسلام کا ایک ایک باب دہراتی ہے۔ وہاں بیٹھ کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے دن رات آنکھوں کے سامنے گھومتے ہیں۔ بعض دفعہ تو واقعی یونہی لگتا ہے کہ ہم بھی اُس زمانے کا ایک حصہ ہیں۔

موجودہ مسجدِ نبویؐ کا قدیمی حصہ (یعنی حضورؐ کے زمانے کے مسجد کی جگہ) ترکی دورِ حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی طرزِ تعمیر بقیہ مسجد سے بالکل مختلف اور تزئین و آرائش میں لاثانی ہے۔ مسجد نبویؐ میں جب بابِ جبرائیل سے داخل ہوں تو بائیں ہاتھ ایک حجرہ نظر آتا ہے جو کہ حضرت فاطمہؓ کا گھر تھا۔ جب اُس کے سامنے سے گزر جائیں تو فوراً بعد بائیں ہاتھ پر مسجد نبویؐ کا جو حصہ نظر آتا ہے وہ ریاض الجنہ کہلاتا ہے۔

یعنی منبر رسول اور قبر مبارک کے درمیان کا حصہ ریاض الجنہ ہے۔ اس مقام کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ:

''جو جگہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ہے وہ و جنت کے باغوں میں سے ایک ہے۔''

گھر سے مراد حضرت عائشہؓ کا حجرہ ہے جس میں رسول پاک ﷺ کا روضہ مبارک ہے۔ اسی ریاض الجنہ میں حضور سرورِکونینؐ کا مصلیٰ بھی ہے جہاں آپ کھڑے ہوکر امامت فرمایا کرتے تھے۔ اس جگہ آج ایک خوبصورت محراب بنی ہوئی ہے جو محرابِ نبویؐ کہلاتی ہے۔ یہ مقدس محراب 9 فٹ سنگ مرمر کے ایک ہی ٹکڑے کی ہے جس پر سنہرے پانی کی خوبصورت مینا کاری کی گئی ہے۔ دونوں جانب سنگ سُرخ مرمر کے بے مثال ستون بنے ہیں اور محراب کے اوپر وہ آیت لکھی ہے جس میں درود شریف پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضور پاک ﷺ کے مزارِ مبارک کے سامنے تین جالیاں ہیں اور تینوں میں سوراخ ہیں۔ درمیان والی جالی میں ایک گول سوراخ رکھا گیا ہے جو آپ کے چہرہ مبارک کے سامنے ہے۔ روضۂ اقدس کو پیتل کی جالیوں اور دیگر اطراف کو لوہے کی جالی دار دروازوں سے بند رکھا گیا ہے۔ اس عمارت کو مقصورہ شریف کہتے ہیں۔

یوں تو مسجد نبویؐ کا چپہ چپہ نور فشاں ہے مگر ریاض الجنہّ کے وہ سات ستون جنہیں سنگِ مرمر کے کام اور سنہری مینا کاری سے نمایاں کر دیا گیا ہے۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ستون روضۂ انور کی مغربی دیوار کے ساتھ سفید رنگ کے ذریعہ ممتاز کئے ہوئے ہیں اور اُن کے درمیانی جگہ جنت کا ٹکڑا ہے۔ ان ستونوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ستونِ حنانہ

محراب النبی ﷺ کے قریب ہے۔ حضورؐ اس ستون کے پاس کھڑے ہوکر خطبہ

ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ یہیں وہ کھجور کا درخت دفن ہے جو لکڑی کا منبر بن جانے کے بعد آپؐ کے فراق میں بچوں کی طرح رویا تھا۔

ستونِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

ایک مرتبہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری مسجد میں ایک جگہ ایسی ہے کہ اگر لوگوں کو وہاں نماز پڑھنے کی فضیلت کا علم ہو جائے تو وہ قرعہ اندازی کرنے لگیں۔ (طبرانی) اس جگہ کی نشاندہی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمائی تھی۔ اب وہاں ستونِ عائشہ بنا دیا گیا ہے۔

ستون ابوالبابہ

ایک صحابی ابوالبابہؓ کا قصور یہاں معاف ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس ستون کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ ستون توبہ بھی کہلاتا ہے۔

ستونِ وفود

اس جگہ حضورؐ باہر سے آنے والوں سے ملاقات فرماتے تھے۔

ستونِ سریر

اس جگہ نبی اکرمؐ اعتکاف فرماتے تھے اور رات کو یہیں آپ کا بستر بچھا دیا جاتا تھا۔

ستونِ حرَس

اس مقام پر حضرت علیؓ اکثر نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی جگہ بیٹھ کر حضورؐ کی پاسبانی

کیا کرتے تھے اس کو ستونِ علیؓ بھی کہتے ہیں۔

ستونِ تہجد

نبی اکرمؐ اس جگہ تہجد ادا فرماتے تھے۔ یہ تمام ستون اس حصہ مسجد میں ہیں جو حضور اقدسؐ کے زمانہ میں تھی۔

اصحاب صُفہ

صُفہ سائبان اور سایہ دار جگہ کو کہا جاتا ہے۔قدیم مسجد نبویؐ کے شمال مشرقی کنارے پر مسجد سے ملا ہوا ایک چبوترہ ہے۔ یہاں وہ مسلمان رہتے تھے جن کا کوئی گھر بار نہ تھا نہ بیوی بچے اور نہ کوئی۔ یہ لوگ اصحابِ صُفہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ ہمہ وقت رسولِ پاکؐ سے دین کی تعلیم حاصل کرتے اور وقتاً فوقتاً اشاعتِ اسلام کیلئے دوسرے مقامات پر جاتے رہتے تھے۔ اصحابِ صُفہ کی زندگیوں میں فُقر وسادگی اور دنیاوی چیزوں سے بے نیازی اور بےتعلقی پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ دین کی دولت سے مالا مال تھے مگر دنیاوی دنیا میں افلاس و ناداری کی منہ بولتی تصویر تھے۔ اصحابِ صفہ اسلامی تاریخ کے نادار بادشاہ تھے۔ یہ جگہ اس وقت بابِ جبرئیل سے اندر داخل ہوتے وقت مقصورہ شریف کے شمال میں محرابِ تہجد کے بالکل سامنے 2 فٹ اونچے پیتل کے کٹہرے میں گھری ہوئی ہے۔ اور اُس کی لمبائی 40x40 فٹ ہے۔ یہاں لوگ تلاوت قرآن پاک اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں۔

روضۂ اقدس کے اوپر گنبدِ خضرا ہے جس کی زیارت کی تمنا ہر مسلمان کے دل کی تمنا

اور آرزو ہے۔ یہ تو تھی مسجدِ نبویؐ کی عمومی اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی مسجد کی خصوصی تفصیل البتہ میں نے جس طرح یہ مسجد دیکھی یہ مضمون دیگر ہے۔ سعودی عرب میں یہ بات کافی محسوس ہوئی کہ یہاں خواتین واقعی شہری درجہ دوم ہیں۔ کچھ جھلک وہاں کے لوگوں کی عمومی طرزِ زندگی میں دیکھی اور محسوس کی اور کچھ مسجد نبویؐ میں شودروں والے سلوک نے دِل گرفتہ سا کر دیا کہ کاش ہم عورت نہ ہوئے ہوتے۔

جس شوق اور وارفتگی سے ہم حرم شریف میں داخل ہوئے تھے اور سامنے خانہ کعبہ کی جھلک پا کر ایک اور ہی عالم میں پہنچ گئے تھے۔ اُسی جذبے اور شوق وعقیدت کے ساتھ ہم مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے اور دھڑکتے دل اور بے تاب آنکھوں سے چاروں اطراف میں دیوانہ وار دیکھا کہ کسی کونے میں گوہرِ مقصود نظر آ جائے۔ مگر چاروں اطراف سفید چوبی دیواروں کی پارٹیشن کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ بے تاب ہو کر بار بار ہر طرف نظریں گھمائیں حتیٰ کہ آنکھوں میں درد ہونے لگی اور اُن چوبی دیواروں کے اُس پار چھتوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا تو مایوس ہو کر اور کچھ حیران ہو کر ماحول پر نگاہ ڈالی تو ان دیواروں کے ''باڑے'' میں خواتین کو اپنے حال پر صابر وشاکر ومحوِ عبادت پایا۔ مسجد نبویؐ کے ایک حصے کو پارٹیشن سے بند کر کے عورتوں کیلئے علیحدہ جگہ بنا دی گئی ہے اور بقیہ مسجد اور اُس کے تمام مقامات سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔

گو کہ یہ حصہ بھی بہت وسیع وعریض تھا مگر اس عظیم مسجد کے ایک کونے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ بہت حیران ہو کر اور کچھ بددل ہو کر بیٹھ گئی اور روضۂ رسولِ پاکؐ کی پہلی جھلک دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خیر نماز ونوافل وغیرہ ادا کرنے کے بعد قرآن شریف

کا پارہ ختم کیا اور پھر ایک پاکستانی خاتون سے یہاں کا حال پوچھا کہ کیا خواتین کے لئے سبھی کچھ یہی ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ اُس خاتون نے جواب دیا کہ یہ جو دیوار دیکھ رہی ہوں اس کا دروازہ صبح کی نماز کے بعد سات بجے اور دوپہر ڈیڑھ بجے کے بعد کھلتا ہے اور اگر واقعی کچھ دیکھنا چاہتی ہو تو صبح کی نماز کے بعد دیوار کے مغربی کونے والے حصے میں دروازے کے پاس لگ کر بیٹھ جانا، سات بجے دروازہ کھلے گا اور تم پہلے ہی ریلے میں وہاں تک پہنچ جاؤ گی۔ بس جلدی سے وہاں جا کر نوافل ادا کر لینا۔ اگلے دن ہم نے ہدایت پر عمل کیا اور دروازے کے پاس جا کر جگہ سنبھال لی۔ جلد ہی خواتین جمع ہونی شروع ہو گئیں اور دروازے کے سامنے باقاعدہ ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی۔ مجھے صورتحال کا کچھ اندازہ نہ تھا کہ آگے کیا ہونا ہے اور کہاں جانا ہے۔ سات بجے عورتوں کے ''باڑے'' کا دروازہ کھلا اور وہ تمام جلوس جو پیچھے تیار کھڑا تھا، چیختے ہوئے یکا یک بھاگنے لگا۔ میں چونکہ پہلے صفوں میں تھی بلا مبالغہ اس جم غفیر کے زور پر تنکے کی طرح اُڑتی ہوئی تمام فاصلہ طے کر کے اصحابِ صُفّہ والے چبوترے کے پاس سے گذرتی ہوتی روضۂ رسولؐ کے سفید ستونوں والی دیوار کے پاس جا کر رُکی۔ آس پاس عورتوں کا ہجوم ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے نوافل ادا کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے بھی دیکھا دیکھی فوراً نوافل ادا کرنے شروع کئے۔ دو نفلوں کیلئے تو زمین پر سجدہ کیلئے جگہ مل گئی مگر باقی نوافل کھڑے ہو کر ہی ادا کرنے پڑے۔ اس ساری مارا ماری میں مجھے کچھ ادراک نہ تھا کہ میں کہاں پہنچ چکی ہوں اور کہاں نفل پڑھ رہی ہوں۔ لمحہ بہ لمحہ وہاں خواتین کے دھکوں کا پریشر بڑھتا گیا اور میں نے وہاں سے واپسی میں عافیت

سمجھی اور بمشکل تمام واپس اصحاب صُفہ والے چبوترے پر آ کر بیٹھ گئی ۔ ابھی اس چبوترے پر انتارش نہیں تھا کیونکہ اگلی طرف ابھی نفلوں کی ادائیگی کا کافی زور تھا۔ چنانچہ میں نے آرام سے وہاں بھی نوافل ادا کئے اور آس پاس لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا جگہ ہیں ہیں۔تب مجھے بتایا گیا کہ یہ روضۂ مبارکؐ کے پیچھے کا حصہ ہے اور اس وقت تم اصحابِ صُفہ والے چبوترے پر بیٹھی ہو۔ستون تہجد تمہارے سامنے ہے۔ جہاں تم نے پہلے نفل ادا کئے تھے۔ وہ دیوار روضۂ رسولؐ کی تھی اور قدم تمہارے ریاض الجنہ میں تھے۔ مجھے یہ سُن کر انتہائی خوشی ہوئی کہ میں (انجانے میں) دیوارِ روضۂ رسول کے پاس ریاض الجنہ میں نفل ادا کر آئی ہوں اور اب اس مشہور مقدس چبوترے پر بیٹھی ہوں۔ کافی مطمئن ہو کر میں نے آس پاس نظریں گھمائیں تو سامنے وہی لکڑی کی پارٹیشن یہاں بھی نظر آئی اور اس کے پار منبر رسولؐ اور محراب النبیؐ اور کچھ ستونوں کے سنہری حصے تھوڑے تھوڑے جھانکتے نظر آئے لیکن سوائے ریاض الجنہ نے ایک حصے کی باقی حصہ مسجد عورتوں کیلئے علاقہ غیر تھا۔ البتہ صحنِ مسجد کا وہ حصہ جو غیر مُسقف ہے اور جہاں بڑی بڑی بہت خوبصورت چھتریاں بطور چھت کے لگی ہیں اور بوقتِ ضرورت کھولی اور بند کی جاسکتی ہیں ۔ وہ عورتوں کو بخشا گیا تھا کہ چلو کیا یاد کرو گی ۔ یہاں نمازیں نفل ادا کرلو۔ چنانچہ روضۂ رسولؐ کے سامنے کے حصہ کی سنہری جالیاں جو ہم نے تصویروں میں دیکھ رکھی تھیں اور اُن کا دیکھنے کا جسقدر اشتیاق تھا وہ ہمیشہ کیلئے دل ہی میں رہ گیا۔ ہم نے بچپن سے یہ قوالی سن رکھی تھی کہ:

''تیری خیر ہووے، پہریدارا، روضے دی جالی چُم لین دے''

روزے کی جالی چومنا تو ایک طرف ہمیں تو اُدھر پھٹکنے تک نہیں دیا گیا۔حتیٰ کہ اپنے قیام کے دوسرے تیسرے دن ہم نے بابِ جبرائیل کی طرف باہر کی طرف سے روضۂ مبارکؐ کی جالیاں دیکھنے کی جسارت کرنی چاہیئے تو وہاں پر موجود اللہ مارے شرطے نے ہمیں وہاں پر کھڑے ہونے تک کی بھی اجازت نہ دی۔چلیں اُس کے منع کرتے کرتے جو ہم نے جلدی میں ایک جھلک دیکھ لی۔ وہی ہمارے لئے کافی خوش قسمتی ہے۔صبح کے وقت 7 سے گیارہ بجے تک وہاں ٹھہرنے کی اجازت ہے چنانچہ وہ 4 گھنٹے ہم نے جی بھر کے عبادت کر لی اور آس پاس کا نظارہ کرنے کی زیادہ ضرورت نہ سمجھی۔ہم رسولِ پاکؐ کے آس پاس بیٹھے تھے۔ہمیں دنیا میں اور کیا چاہیئے تھا۔ 11 بجے کے قریب حضرت بلالؓ کے دو تین بھائی بڑی قیمتی آف وائٹ اور سفید رنگ کی عبائیں پہنے نمودار ہوئے اور عبادت میں مصروف خواتین کو ہش ہش کرتے نکالنے لگے۔ جہاں جہاں عورتیں نہیں نکل رہی تھیں۔ وہاں فوراً پارٹیشن کا ایک حصہ اُٹھا کر رکھ دیتے اور اس طرح منٹوں میں تمام حصہ مسجد خالی کروا کر واپس خواتین کو اپنے ''باڑے'' کی طرف دھکیل دیا گیا۔تو یہ تھی ہمارے پہلے دن کی زیارت کی روداد۔

اگلے دن تو ہم اب تمام رموز سے آشنا ہو چکے تھے چنانچہ نماز ہی اُس حصہ دیوار کے پاس ادا کی جہاں سے درِ روضۂ رسول نے وا ہونا تھا۔مگر اگلے دن قسمت نے کچھ زیادہ یاوری نہیں کی یا پھر یہ کہ ہم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ دیکھنا چاہا۔ جب ریاض الجنہ میں نفل ادا کر لئے تو باقیوں کیلئے جگہ خالی کرتے ہوئے واپس اصحابِ صُفہ والے چبوترے کے پاس آ کر روضۂ مبارک کی دوسری جانب بابِ جبرائیل والی طرف کو

دیکھنے کیلئے کوشش کی مگر عورتوں کے ہجوم میں پھنس کر گویا حشر ہوگیا۔ بہرحال بمشکل تمام آہنی جنگلے تک پہنچ کر روضۂ شریف کی سبز جالیوں کو دیکھتے ہوئے خوب درود وسلام پڑھا اور دعائیں کیں۔ کچھ دیر اس نورِ مخفی کے تصور میں وہاں گزارا اور پھر واپس پلٹنا چاہا مگر کیسے؟ آنے والیوں اور جانے والیوں کے درمیان جو دھکم پیل ہوئی ہے وہ ہم مسلمانوں کی فطری بدنظمی کی نہایت عمدہ مثال تھی۔ اگرچہ وہاں پر شرطیاں کافی تعداد میں ہش ہش کرنے کو موجود ہوتی ہیں مگر یوں کیوں نہیں کرتیں کہ آنے جانے والوں کی لائنیں لگواتی جائیں اور سب لوگ سہولت سے آتے جاتے رہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ کئی عورتوں کے سانس گھٹ رہے تھے۔ کپڑے پھٹ رہے تھے اور عجب کُشتم پُشتم ہو رہی تھی میں بھی بمشکل تمام اپنے دو عدد پاؤں کے ناخن اکھڑوا کر واپس صحنِ مسجد میں بالآخر پہنچی مگر سخت بددِل اور بدمزہ۔ رہ رہ کر مدینہ کی وزارتِ حج پر غصہ آرہا تھا کہ ایک تو وہ عورتوں کو اسقدر محدود جگہ اور وقت دیتے ہیں اور پھر اگرچہ اسقدر خواتین ''شرطیوں'' کا عملہ وہاں متعین کرتے ہیں تو باقاعدہ باری کیوں نہیں لگواتے یا کوئی اور طریقہ کیوں نہیں وضع کرتے کہ سب لوگ ایک متعین وقت تک اپنی اپنی باری پر زیارت ونوافل ادا کرلیں۔ کم از کم حج کے علاوہ دنوں میں یہ سہولت دی جاسکتی ہے۔ اس محدود جگہ میں اسقدر دھکم پیل اور بدنظمی کہ بس الامان پھر یہی خیال آیا کہ یہاں عورتوں کی کچھ ایسی حیثیت ہی نہیں کہ اُن کی بہتری کے لئے بھی کچھ سوچا جائے۔ اُن کو چار گھنٹے دے دیئے اور کچھ تھوڑی سی جگہ بس کافی ہے۔ اور کیا چاہتی ہیں؟ یہ میں سب اسلئے لکھ رہی ہوں کہ کوئی اور بھی میری طرح یوں بدمزہ نہ ہوجائے۔ ذرا ذہنی طور پر تیار رہے۔ اُس دن تو... واقعی میں حضورؐ سے روٹھ گئی،

بہت روٹھ گئی۔اتنی دور سے ملنے آئے ہیں تو ملنے بھی نہیں دیتے۔جائیں میں نہیں بولتی۔ میرے منہ سے درود شریف ہی نہیں نکل رہا تھا۔بس چپ کر کے صحنِ مسجد میں بیٹھی رہی۔بیٹھی رہی اور پھر کچھ نوافل ادا کر کے واپس چلی آئی۔

تیسرے دن ہر طرف سے بے نیاز ہو کر صحنِ مسجد میں آ کر بیٹھ گئی۔ریاض الجنہ کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ جہاں جگہ ملی وہیں ڈیرا جما دیا اور آرام سکون سے عبادت کی۔چشم تصور میں زمانہ نبوی کے شب و روز میں اسقدر محو ہوئی کہ زمان و مکان کی قید نہ رہی۔ان آہنی جالیوں کے پیچھے جو نور میری آنکھوں سے مخفی تھا۔اُس نور کی کرنوں سے دل و جان کو منور کیا۔درود وسلام دعائیں جی بھر کے کرلیں اور خوش قسمتی سے جب وقت ختم ہونے کے نزدیک ہوا تو ریاض الجنہ کا رش بھی کچھ چھٹنے لگا تو وہاں جا کر آرام سے نوافل بھی اُن سبز قالینوں پر ادا کر لئے جہاں پر رسائی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔میری بے قراری کو آخر کچھ قرار آ ہی گیا۔

حرمین شریفین میں دونوں جگہ دین و دنیا کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے۔مسجدوں سے قدم نکالیں تو بازاروں میں پڑتے ہیں۔ یہاں بھی مسجد نبوی اور بازار کی دیوار ایک ہی تھی۔ بازار کا نام ''سُوق النّبی'' یعنی نبی کا بازار تھا۔اپنے کراچی کے جوہری بازار کی طرح گلیاں در گلیاں اور بھول بھلیاں قسم کا بازار تھا۔عموماً سب مال چائینز تھا۔اچھی کوالٹی کی چیزیں کم بھی تھیں اور مہنگی بھی۔ بہر حال یہاں سے لوگوں نے سوو ینئر ہی لے جانے ہوتے ہیں، لہٰذا وہ بہت تھے۔کھجوریں بھی کچھ زیادہ سستی نہیں تھیں۔مسجد نبویؐ سے تھوڑے فاصلے پر جیولری بازار کے ساتھ جنت البقیع کا قبرستان ہے۔وہاں بھی خواتین کو

اندر جانے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا باہر سے ہی اندازے لگاتی رہی کہ کسی کی قبر کہاں ہے۔ ایک دن تمام زیارتوں کے لئے مخصوص کیا اور غزوہ خندق غزوئے احد اور دیگر تمام مشہور مساجد مثلاً مسجد قبلتین مسجد قبا وغیرہ دیکھیں۔ مگر مساجد کے دیکھنے کا مطلب حسب معمول میرے لئے مختلف تھا، کیونکہ ہر مسجد میں مسجدِ نبویؐ والی روایت تھی اور جب دونوں باپ بیٹے واپس آتے تو بتاتے کہ بڑی خوبصورت مسجد تھی وغیرہ۔ البتہ غزوہ خندق اور اُحد کے مقامات کو جی بھر کے دیکھا۔ ایک ایک جگہ کو نزدیک جا کر دیکھا اور پھر غزوات کے واقعات کو ان جگہوں پر Fit کر کے دیکھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے کنوئیں بھی دیکھے جہاں سے اب بھی مدینہ کو پانی سپلائی ہوتا ہے۔

مسجد نبویؐ باہر سے بھی نہایت خوبصورت ہے اور اُس کے خوبصورت کشادہ مرمریں فرشوں پر رات کو بیٹھنا بہت پرلُطف ہوتا تھا۔ اکثر عرب خواتین شام کو اپنے بال بچوں سمیت کھانا وغیرہ وہیں تناول کرتیں۔ جمعرات کو اکثر خواتین نے روزہ رکھا ہوا تھا اور اپنی افطاریاں ساتھ لائی ہوئی تھیں۔ ہمیں بھی آفر کی گئیں۔ چنانچہ ہم نے مشہور عربی قہوہ اپنی خواتین کے ہاتھوں کا بنا ہوا پیا۔ جو کہ صرف سبز الائچی کو اُبال کر گاڑھا سا مشروب بنایا جاتا ہے۔ خاصا خوشبودار اور لذیز تھا۔

عرب عورتیں بھی میرے لئے کافی دلچسپی کا باعث تھیں۔ اُن کے درمیان بیٹھ کر عبادت کرتے ہوئے جب اسلام پھیرتے ہوئے آس پاس نظر پڑتی تو بہت اچھا لگتا۔ عموماً خوب صحتمند عرب خواتین اور اُن کے سر ڈھانکنے کا مخصوص انداز اور طرز عبادت مہندی سے کالے کئے ہوئے ہاتھ پاؤں اور رنگا رنگ انگوٹھیاں، چوڑیاں، کڑے

اور قیمتی گھڑیاں۔ پھر اُن کی عبائیں اور نقاب اور پس نقاب حلق سے نکلتی ہوئی عربی۔

مہندی عرب خواتین کی ایک نہایت مرغوب چیز تھی۔ تقریباً 80 فیصد خواتین کو میں نے سر ہاتھ پاؤں پر مہندی لگائے دیکھا اور وہ بھی اس قدر رنگین کہ مہندی سے ہاتھ سیاہی مائل سُرخ ہوتے تھے۔ بعض خواتین نے تو کالے رنگ سے آدھی اُنگلیاں اور ہتھیلیاں نہایت خوبصورت ڈیزائنوں میں رنگی ہوئی تھیں۔ عربی خواتین بھی وہاں کئی اقسام کی تھیں۔ کچھ تو روایتی لمبی کالی عباؤں میں ملبوس اور سر پر سکاف ہوتا۔ کئی ایک نے بڑے نقاب پہنے ہوتے جن میں سے صرف آنکھیں جھانک رہی ہوتیں۔ کئی ایک نے عینک نما نقاب ناک پر لگایا ہوا ہوتا تھا... لیکن ایک بات سب میں بہت یقینی تھی کہ سر پر سکارف، ٹوپی، عبا، نقاب جو بھی ہوتا وہ ماتھے تک خوب کس کر بندھا ہوتا کہ بال نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ بھلے ٹانگیں ننگی ہوں تو ہوں، مگر بال نظر نہیں آنے چاہئیں۔ مجھے سب سے زیادہ اس مسئلے نے وہاں پریشان کیا۔ اس عربی طرز کا سکارف شائد مجھے صحیح لینا نہیں آتا تھا یا کیا؟ اکثر جب کہ میں بہت ذوق وشوق سے محوِ عبادت ہوتی تو آس پاس مینائی انگلیاں میری طرف اشارہ کرتیں کہ دیکھو کیا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے بال!! میں گھبرا کر ماتھے پر ہاتھ مارتی کہ مجھ سے کیا غضب ہو گیا ہے تو واقعی چند گستاخ بال کس کر بندھے ہوئے سکارف میں سے بھی جھانک رہے ہوتے۔ آخر تنگ آ کر میں نے ململ کے دوپٹے سے ''ماچھنوں والی بُکل'' مارنی شروع کر دی تو سکون ہوا۔

مصر شام عراق لبنان کی عرب خواتین خوبصورتی میں لاثانی۔ یمنی خواتین گندمی رنگ اور خوبصورت نقوش والی مگر منہ پر ضرور کالے چھوٹے چھوٹے نشان Tatoo قسم کے بنوائے ہوتے۔ ایرانی خواتین بھی اپنی کالی بڑی بڑی عباؤں میں ''دَبکی'' ہوئی

خوبصورت لگتی تھیں۔ انڈونیشیا اور ملائشیا کی خواتین نہایت خوبصورت سفید ریشمی سکارفوں اور عباؤں میں بہت صاف ستھری۔ امیر اور منظم نظر آتی تھیں۔ عبادتوں میں بھی اعلیٰ اور رکھ رکھاؤ میں بھی۔ افریقن خواتین کم کم نظر آئیں۔لیکن اکثر اپنے روایتی لباسوں میں تھیں۔ غرضیکہ اللہ میاں کے گھر میں یہ ملٹی مسلم اجتماع بہت روح پرور پُرلطف رنگا رنگ تھا۔ یہ پندرہ دن میری زندگی کے انتہائی قیمتی پُرلطف اور مصروف دن تھے۔ ایک ایک لمحہ میں نے اس وقت کا بھرپور طور پر گزارا اور روحانی طور پر گویا ایک نئے وجود کے ساتھ واپسی ہوئی۔ حرم شریف کے صحن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کا نظارہ اور مسلسل اُسے دیکھتے رہنے کی حسین یاد تادمِ زندگی ساتھ رہے گی۔ اُس جیسا نظارہ یقیناً دنیا میں اور کہیں نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا بے حد شکر ہے جس نے مجھے وہاں جانے کی توفیق بخشی۔ الحمدللہ رب العلمین۔

(تاریخ عمرہ: ستمبر 1999ء)

(مسجد نبویؐ کے متعلق کچھ حوالے کتاب الحج سے لئے گئے)

○○

چڑھتے سورج کی سرزمین پر

میرے بہت بچپن کی بات ہے کہ میری امی کی ایک سہیلی نے میرا ہاتھ دیکھا تو کہا کہ یہ لڑکی سات سمندر پار جائے گی۔ اس وقت سات سمندر پار کی اصطلاح کو نہ سمجھتے ہوئے بھی میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کوئی گڑبڑ ہے اور میرے اندر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پھر برسوں بعد اس لکیر نے یکدم انگڑائی لی۔

1983ء میں سپین کی مسجد بشارت کے افتتاح کے موقع پر میرے میاں کے جانے کا پروگرام بنا تو میں نے جانے کی صاف معذرت کر دی۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کی زمین تقریباً ہر جگہ ایک جیسی ہی ہے۔ بقیہ چیزوں کے لئے ٹی وی فلمیں اور کتابیں کافی ہیں (یعنی بدذوقی کی انتہا)۔ بہر حال جانا پڑا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سکون رہا اور پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ سات سمندر پار تو ایک طرف ہم تو کوئی دس سمندر پار کرتے ہوئے دنیا کے ایک کونے میں آ کر بیٹھ گئے۔ کینیڈا وطن، ثانی ٹھہرا اور پھر ہماری پروازیں ہمیشہ ہمیش کیلئے سمندروں کے آر پار ہی ہوگئیں۔ ہر دوسرے سال وطن عزیز کے چکر اور دیگر سفر ہماری قسمت میں لکھے گئے۔ لوگ ہمیں رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے اور ہم ایک ٹھنڈی سانس لے کے رہ جاتے کہ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔

سو اسی طرح زندگی گزر رہی تھی کہ اچانک ایک دن یہ مژدہ سنایا گیا کہ ہم جاپان جا رہے ہیں... اوہ خدایا... میں چیخی۔ ہرگز نہیں۔ میں نے بحر اوقیانوس تو پار کر لیا ہے

اب بحرالکاہل بھی پار کروں؟ ہرگز نہیں۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... بتایا گیا کہ ٹکٹ Non-refundable ہیں۔ واپس نہیں ہوسکتے۔مگر میرا احتجاج جاری رہا۔ کہا گیا ڈاکٹروں سے بات کر کے دیکھ لواگر میڈیکل Reason بنتا ہےتو بنالوورنہ نہیں۔ چنانچہ اب اپنی بیماریوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ کون کون سی ''خطرناک'' بیماریاں مجھے لگی ہوئی ہیں۔

(۱) شوگر؟مشکل ہے۔یہ تو عام بیماری ہے۔

(۲) کمر کی درد۔ ہاں یہ ایک Reason بن سکتا ہے کیونکہ اُنہی دنوں میں نے Chiropracter سے کچھ علاج کروایا تھا۔ چنانچہ پہلے اُسی کے پاس گئی اور وجہ بتائی کہ لمبا سفر نہیں کرسکتی۔ اس لئے ایئرلائن والوں کو کچھ لکھ دو۔ اُس نے دوبارہ تفصیلی معائنہ کیا اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا کہ جانا کہاں ہے؟ کہا جاپان ۔مسکراتے ہوئے بولا کہ کاش ہم بھی جاسکتے۔مگر کمر کی اس درد کا جاپان جانے سے کیا تعلق ہے؟ بے فکری سے جاؤ۔

اب ناچارا اپنی پولش فیملی لیڈی ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا کہ شاید اُسے مجھ پر ترس آجائے۔اسے بھی یہی وجہ بتائی تو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے اپنے پولش لہجے میں بولی:

''ساؤنڈز گوڈ ٹومی (Sounds good to me) وہاں سے میرے لئے بھی کوئی تحفہ لے کر آنا۔''

چلیں...جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دے گئے۔جھنجھلاہٹ، غصہ، پریشانی سبھی کچھ طاری تھا مگر کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ پھر عازم پرواز ہونا پڑا۔ٹورانٹو سے وینکوور

6 گھنٹے اور پھر وہاں سے 12 گھنٹے کی فلائیٹ نگو یا کیلئے ۔ اس دفعہ ہومیوپیتھی کی کچھ دوائیاں مجھے دی گئیں کہ رستے میں بحرالکاہل کی گہرائیوں کا خوف دور رکھنے میں مدد دیں گی۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے بہت کرم نوازی کی اور طبیعت میں جو جھنجھلاہٹ اور خوف سا تھا وہ وینکوور سے چلنے کے کچھ عرصے بعد دور سا ہو گیا اور اب کچھ Positive بھی سوچنا شروع کیا۔ پھر یکا یک خیال آیا کہ وہاں اگر کچھ بولنا پڑ گیا تو... کچھ لکھ ہی لوں۔ چنانچہ لکھنے میں اس قدر محو ہوئی کہ نیچے بحرالکاہل کی لہروں کا خوف یاد ہی نہ رہا۔ اچانک جب کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو سمندر کا پانی جہاز کے پروں سے چند فٹ ہی نیچے تھا۔ خوف کی ایک لہر اُٹھی مگر جلد ہی اطمینان میں بدل گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے جہاز کے پہیے نگویا ایئرپورٹ پر دوڑ رہے تھے۔

تو صاحبو! ہم جاپان پہنچ ہی گئے... بادل نخواستہ۔ جانے کی وجہ جاپان کا 25واں جلسہ سالانہ تھا جہاں میرے میاں کو بطور مہمان خصوصی شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ نگویا میں احمدیہ مشن اور سنٹر ہے۔ چنانچہ اُس وقت کے امیر سید طاہر احمد صاحب اپنی عاملہ کے کچھ ممبروں کے ساتھ ہمیں ریسو کرنے آئے ہوئے تھے۔ مشن ہاؤس پہنچے تو امیر صاحب کی بیگم اور دیگر لجنہ کی خواتین سے ملاقات ہوئی اور پھر اُن کے ساتھ کچھ اس طرح باتیں شروع ہو گئیں جیسے ہم تو رہتے ہی جاپان میں ہیں۔ کوئی اجنبیت، کوئی دوری کوئی فاصلہ یاد ہی نہ رہا۔ ہم سب گھل مل کر گپیں لگا رہے تھے۔ یہ احمدیت بھی عجب رشتہ ہے۔ دنیا کے کسی بھی کنارے پر جاؤ، اللہ کے فضل سے یہ برادری ہر جگہ دستیاب ہے۔ الحمدللہ۔

اگلے دن جلسہ تھا۔ جلسہ کیلئے نگویا کے نواح میں اوکازا کی کے مقام پر ایک یوتھ ہوسٹل کو جلسہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ جس میں رہائشی کمروں کے علاوہ بڑے بڑے ہالز اور ایک کیفے ٹیریا بھی تھا۔ یہ جگہ جاپان کی چھوٹی سی جماعت کیلئے نہایت مناسب جگہ تھی جہاں جلسہ گاہ، رہائش اور ضیافت کے لوازم ایک ہی جگہ پر مل جاتے تھے۔ اور ہمارے لئے یہ جگہ جاپان کی ثقافت، کلچر اور اصول وضوابط کی ایک انوکھی تجربہ گاہ تھی۔ جہاں ہمیں جاپانی قوم اور اُس کے کلچر کے بارے میں باقاعدہ پریکٹیکل قسم کی معلومات حاصل ہوئیں۔ یعنی ہم خود ایک طرح سے اس تہذیب کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ وہ جگہ دراصل جاپانی نوجوانوں کیلئے ایک تربیت گاہ بھی تھی جہاں پہلے سے ہی تربیت شدہ بچوں کو مزید ڈسپلن اور مشقت سے صیقل کیا جاتا تھا۔

وہاں دن کا آغاز صبح سویرے باہر ورزش کے لئے ڈرل سے ہوتا تھا۔ جہاں ہوسٹل کے ہر چھوٹے بڑے کو لازمی شامل ہونا ہوتا تھا۔ کسی ایک شخص کی غیر حاضری بھی ایک بہت بڑا جرم تھا (اس لحاظ سے ہم سب احمدی خواتین وہاں مجرمین کے زمرے میں تھیں) اس اجتماعی ورزش کے بعد ہی دن کی باقی سرگرمیاں شروع ہو سکتی تھیں۔ ہوسٹل میں ہر کام ایک باقاعدہ اصول کے تحت انجام پاتا تھا۔ جس میں سب سے زیادہ وہاں کی ''شو پریڈ'' نے ہمیں ''متاثر'' کیا ایک تو یہ کہ چلنے پھرنے اور آنے جانے میں کسقدر ''دشواریاں'' ہیں۔ دوسرا یہ کہ واہ کیا بات اصول وضوابط کی ہے۔ اگر صرف جوتوں کیلئے اس قدر قواعد وضوابط ہیں تو دنیا کے باقی کاموں کیلئے کیا حال ہوگا۔ چنانچہ پہلے دن اندر داخل ہوئے تو لابی میں بہت سے شوریک پڑے ہوئے دیکھے جہاں کئی قسم کے سلیپر

وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ حکم ہوا کہ:

(۱) اندر آ کر اپنے جوتے اُتار کر خاص جگہوں پر رکھیں اور وہاں پر موجود سبز رنگ کے سلیپر پہنیں۔

(۲) اگر کچھ دیر کیلئے باہر جانا ہوتو دوسری طرز کے جوتے پہنیں۔

(۳) اگر بالکل ہی باہر تشریف لے جانی ہوتو پھر اپنے شوز پہنیں۔

(۴) بچوں کو اندر جانے کیلئے خاص قسم کے کینوس کے جوتے پہننے ہوں گے۔

(۵) باتھ روم جانا ہوتو سبز سلیپر اُتاریئے اور خاص جگہ پر خاص سمت میں رکھے ہوئے میرون کلر کے چپل پہنئے۔

(۶) جب واپس آنے لگیں تو ان سلیپرز کو اسی خاص سمت میں رکھیں تا کہ دوسرا آنے والا آتے ہی سلیپرز کو فوراً پہن سکے۔

(۷) اگر واپسی پر سلیپرز کو صحیح سمت میں نہیں رکھا تو... نتائج بھگتئے۔

چنانچہ ہم تین دن وہاں پر رہے اور ہر طرف ''سبز قدموں'' کی بہار لگی ہوئی تھی۔ مردوں نے اوپر سوٹ پہنا ہوا اور نیچے وہی سبز سلیپرز۔ خواتین کے پیروں میں کوئی نفیس سینڈل نہیں صرف سبز سلیپر۔ تصویریں کھنچ رہی ہیں۔ احباب قطاروں میں کرسیوں پر براجمان ہیں۔ نیچے دیکھو تو سب کے سبز سلیپر۔

ہم نے بھی ناچاراان سلیپرز کی ''اہمیت'' کو سمجھا اور واپسی پر بطور خاص نشانی خرید کر ساتھ لائے۔

میرے لئے دوسری بڑی دلچسپی کا باعث وہاں کا کیفے ٹیریا تھا جہاں دن میں تین

مرتبہ حاضری دینی پڑتی۔ کچن اور کیفے ٹیریا کے درمیان ایک لمبے کاؤنٹر پر لوگوں کی تعداد کے مطابق ناشتے یا کھانے کے سجے سجائے ٹرے رکھ دیئے جاتے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی یہ رنگ برنگ کھانے والے ٹرے مجموعی طور پر پھلوں کی ایک رنگین کیاری کا سا تاثر دیتے۔ پھر جب ٹرے سامنے آتے تو کافی غور کرنا پڑتا کہ کون سی چیز کیا ہے۔ مثلاً ایک گلابی پھول کی پنکھڑیاں اچار کی قاشیں ہوسکتی ہیں اور سفید پھول ایک انڈا اور یہ جو سبز، سرخ اور سنہری پھول کھلے ہیں یہ سوشی کی صورت میں سلاد کے ساتھ ساتھ مچھلیوں کی کئی اقسام ہوسکتی ہیں۔ اور یہ جو لمبی سی سنہری ٹہنی پڑی ہے ہوسکتا ہے یہ بھنڈی کا پکوڑا ہو۔ یعنی کھانا بنانے کے علاوہ کھانے کو ایک آرٹ کے طور پر پیش کرنا جاپانیوں کی حسِ لطیف کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اسی طرح گروسری سٹورز میں سلاد کے پیکٹ اس طرح سجائے ہوتے کہ وہ خوبصورت نظاروں والی پینٹنگز کی نمائش لگتی۔

سی ویڈ اور بھات چاول کھانوں کا بنیادی جز ہیں۔ بھات چاول دیکھنے میں بیچارے بھات مگر کھانے میں انتہائی لذیذ اور میٹھے۔ جب سے وہ چاول کھائے ہیں دوبارہ کھانے کی حسرت ہے اور دنیا کا کوئی چاول پسند ہی نہیں آتا۔ اعلیٰ باسمتی چاول کا اس چاول کے مقابلے میں کچھ ذائقہ نہیں ہے۔ یہاں ٹورانٹو میں آکر بہت ڈھونڈے مگر فی الحال تو نہیں مل سکے۔ اس کے علاوہ ہر کھانے میں مچھلی اور سی ویڈ (Sea Weed) کا سوپ لازمی ہے۔ ہر کھانے سائنٹیفک اصول کے تحت کلیوریز، پروٹین اور وٹامنز کے حساب سے انتہائی متناسب ومتوازن بنایا جاتا ہے جو کہ تمام دن آپ کو چاق و چوبند رکھتا ہے۔

اس کی اہمیت تب پتہ چل سکی جب جلسہ کے بعد ہم واپس نگویا مشن ہاؤس آ گئے۔ آتے ہی کیا حیرت انگیز نظارہ دیکھا کہ مشن ہاؤس کے باہر ڈرائیوروے پر ایک پگڑی والے سردار صاحب کھڑے ہوئے میدے کے پیڑے بنا رہے ہیں اور سامنے مٹی کا خالص پنجابی طرز کا تنور لگا ہوا ہے اور دھڑا دھڑ تندوری نان لگ رہے ہیں۔ ساتھ ہی تندوری تکوں اور کبابوں کی خوشبوئیں اُٹھ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ سیکرٹری ضیافت صاحب نے خوب مزیدار کڑھائی گوشت اور دودھ ملائی والی گاڑی کھیر بنائی ہوئی تھی۔ کھانا سب احباب کو گرم نانوں اور تکوں کے ساتھ کھلایا جارہا تھا۔ بتایا گیا کہ چونکہ آپ تین دن جاپانی کھانے کھاتے رہے ہیں اس لئے آپ سے معذرت کرتے ہوئے اب خالص پاکستانی کھانا خصوصی طور پر بنایا گیا ہے۔جس کیلئے خاص طور پر ایک دیسی ہوٹل سے یہ تنور اور سردار صاحب حاصل کئے گئے ہیں تاکہ بالکل اپنے دیسی انداز میں آپ کو کھلایا جا سکے۔

ظاہر ہے پاکستان سے آنے کے ایک عرصے بعد ایک اصلی مٹی کے تنور کو گھر کے صحن میں یوں کھلے بندوں ''کھڑا'' دیکھ کر بہت خوشگوار حیرت ہوئی اور پھر کھانا بھی خوب مزیدار کڑھائی چکن، تکوں اور کبابوں والا۔ سب نے ہی بہت مزے لے لے کر کھایا اور خوب کھایا۔نتیجہ...وہی جو ہونا چاہئے تھا۔اُس کے بعد خوب نیند آئی اور بقیہ دنوں کیلئے معدہ باقاعدہ طور پر ناراض ہوگیا۔تب ان صحت مند کھانوں کی افادیت سمجھ میں آئی کہ کھانوں میں کوئی ایسے قابل اعتراض لوازمات ڈالے ہی نہیں جاتے جو آپ کو سُلا بھی دیں اور رُلا بھی دیں۔

وہاں کی تیسری خاص چیز جو ہم نے سن رکھی تھی وہ اُن کا رات کا غسل اور پھر چٹائیاں بچھا کر سونا تھا۔ ہر جاپانی چھوٹے بڑے کیلئے رات سونے سے پہلے نہانا لازمی ہے۔اور چونکہ زلزلوں سے لرزتی زمین سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے گھروں میں فرنیچر وغیرہ کا زیادہ بکھیڑا نہیں رکھتے۔ رات کو چٹائیوں پر گدّے بچھا کر سو جاتے ہیں اور صبح اُن کو تہہ کر کے الماریوں میں رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کیلئے خاص طور پر پلنگوں والے کمرے لئے گئے تھے مگر کچھ جاپانی فیملیز جو جلسہ پر آئی ہوئی تھیں انہوں نے ویسے ہی زمینی بستروں پر سونا پسند کیا۔

چونکہ یہ جاپان والوں کا سلور جوبلی جلسہ تھا اس کیلئے خاص اہمیت کا حامل تھا۔ انڈونیشیا، دوبئی، ناروے اور کینیڈا سے بھی لوگ اس جلسے میں شمولیت کیلئے پہنچے ہوئے تھے۔ جاپانی جماعت کی اکثریت ربوہ سے تعلق رکھتی ہے۔اس لئے جلسہ میں ربوہ والی خصوصیات نمایاں نظر آئیں۔

اپنے روایتی انداز میں تینوں دن اچھے پروگرام ہوئے۔نظموں کیلئے تو جاپانی جماعت بین الاقوامی شہرت رکھتی ہے کیونکہ مکرم عصمت اللہ صاحب وہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُن سے اور اُن کے بھائی مکرم عبد اللہ صاحب سے خوب صورت نظمیں سننے کا موقع ملا۔ دونوں بھائی خوب لحن رکھتے ہیں۔مکرم عصمت اللہ صاحب تو ویسے بھی اُن دنوں اِدھر اُدھر چلتے پھرتے کام کرتے اور خصوصاً کھانے کے وقت کھانا Serve کرتے تو بہت خوشگوار سی حیرت ہوتی۔ اُن کی بیگم ایک پر وقار جاپانی خاتون ہیں جو اپنے بچوں کے ساتھ ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔

خواتین کی طرف بھی اچھے پروگرام ہوئے۔منصورہ سیگی گوچی صاحبہ جواس وقت سیکرٹری تبلیغ تھیں اور بعد میں صدر منتخب ہوئیں، نے بھی بہت اچھی باتیں کیں۔ باقی تقاریر بھی اچھی تھیں۔ مجھے بھی کچھ بولنے کیلئے کہا گیا تو میرا جہاز میں لکھا ہوا کام آیا۔ میں نے انہیں کینیڈا جماعت کے پیس ویلج اور ابوڈ آف پیس کے متعلق بتایا جوان کیلئے اچنبھے کا باعث تھا کہ اتنے لوگ اکٹھے ایک جگہ مل کر رہتے ہیں،لہٰذا اُنہیں کافی پسند آیا۔

جلسہ ختم ہونے کے تیسرے دن بعد واپسی پر ٹویوٹا کاروں کا پلانٹ اور اُس کا میوزیم دیکھا۔ جہاں دنیا کی پہلی کار سے لیکر تازہ ترین ٹیکنالوجی والی کاریں نمائش میں رکھی ہوئی تھیں۔ان میں روز ویلٹ کی کار کو خاص اہمیت حاصل تھی۔لوگ اس کے پاس کھڑے ہو کر تصویریں بنوا رہے تھے۔

جاپان میں ہمارے پاس صرف سات دن تھے جو تین دن جلسے میں گزرے اور باقی چار دن مختلف شہروں کو گھومنے میں۔ ہیروشیما جانے کا وقت ہی نہیں ملا۔ پہلے تو خیال آیا کہ چھوڑو اتنی بربادی والی جگہ دیکھنے کیا جانا۔مگر بعد میں اس فیصلے پر افسوس ہوا مگر پھر وقت نہیں ملا۔ چنانچہ صرف ٹوکیو، اوکلاہاما، کیوٹو اور اوسا کا ہی دیکھ سکے۔ بہرحال چار دنوں میں سڑکوں کے آس پاس کا لینڈ سکیپ دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔

چلیں اب بارے جاپان کا کچھ بیان ہو جائے۔

ہزاروں سال پہلے چینیوں نے سورج کو اس سرزمین سے ابھرتے دیکھا تو اُسے JihPen کا نام دیا جس کا مطلب ہے سورج کا منبع۔یہی نام دنیا میں جاپان کے نام سے مشہور ہوا جبکہ اصلی جاپانی ابھی بھی اسے Nippon کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

سورج جاپانیوں کا خاص نشان ہے۔ جوکہ ان کے جھنڈے کے درمیان میں نظر آتا ہے۔

ابتدائی جاپانی جوکہ آس پاس کے جزائر اور ملکوں سے ہجرت کرکے یہاں آباد ہوئے ان کیلئے یہاں کے خوبصورت نظارے زرخیز زمین اور معتدل موسم ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ بانس کے جنگل، بہتے دریا اور خوبصورت ساحلی علاقے اُن کیلئے قدرت کا حسین تحفہ ہیں۔ اس لئے نیچر جاپانی کلچر کا ایک بنیادی جزو ہے۔ اگرچہ اب 121 ملین آبادی کے لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں مگر ابھی تک اُن کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح قدرت کے حسین نظاروں سے بہت پیار ہے اور اُسے اپنی زندگی کے ہر شعبے میں شامل رکھتے ہیں۔ اُن کے تمام باغوں کی اتنے احتیاط سے منصوبہ بندی کی جاتی ہے کہ قدرت کی ہر خوبصورتی اور ہر رنگ مربوط طریقے سے نظر آئے۔ چیری بلاسم اُن کا قومی پھول ہے جو اپریل میں اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اُن کو دیکھنے کیلئے ٹی وی پر اعلان کیا جاتا ہے کہ ان دنوں فلاں فلاں جگہ پر پھولوں کی بہار ہے وہاں جایئے۔ ہم چونکہ مئی میں وہاں گئے تھے اس لئے کچھ بچی کھچی چیری بلاسم کی بہار ہم نے بھی دیکھ لی۔

بیچارہ چھوٹا سا تو جاپان ہے۔ چوڑائی صرف اتنی کہ ٹوکیو سے واپسی پر ایک پہاڑی مقام دیکھنے کیلئے جہاں خلیفہ رابع رحمہ اللہ بھی تشریف لے گئے تھے، تین چار گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد پہنچے تو جاپان کا دوسرا کنارہ تھا۔ سڑکیں عموماً شہروں کے درمیان سے ہی گزر رہی تھیں مگر ان کی سائڈوں پر ہماری ہائی ویز کی طرح اُونچی دیواریں بنانے کیلئے پلاسٹک کی ٹرانسپیرنٹ شیٹس لگائی گئی تھیں تا کہ شہر نظر آتے رہیں۔ یہ بہت اچھا لگا کہ اس

طرح ہمارے ''باپردہ'' شہروں کی طرح ساتھ گزرتے ہوئے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا بلکہ شہر کا نظارہ اچھا لگتا تھا۔

جاپان سب کا سب ہی آباد نہیں بلکہ گہرے سبز جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں بہتی ندیوں، ڈھلانوں پر بنے سیڑھی نما کھیتوں اور ساتھ چھوٹے چھوٹے گاؤں بذاتِ خود خوبصورت نظارے تھے۔ جہاں خاموشی بھی اس خوبصورتی کا وجدانی احساس دلاتی تھی۔ اگرچہ پچھلی صدی تک جاپانی ایک زراعتی قوم ہی تھی مگر اب جدید مشینوں نے اکثر کسان آبادی کوشہروں میں دوسرے کاموں کیلئے بھیج دیا ہے اور بوڑھے لوگ اور عورتیں ہی زراعتی کلچر کا زیادہ تر حصہ ہیں۔ بہت سے کسان نزدیکی شہروں میں دوسرے کاموں کیلئے چلے جاتے ہیں اور بقیہ وقت میں اپنے کھیتوں پر کام کر لیتے ہیں۔ مگر بھلا ہو جدید مشینری اور ٹیکنالوجی کا کہ کم سے کم وقت اور جگہ میں بھی تمام ملک کی زراعتی ضروریات اپنے ملک سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی جگہ کو بھی استعمال کر کے خوب چاول، چائے اور سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ شہروں کے درمیان بھی کسی جگہ پر آپ کو چاول کا کھیت نظر آ جائے گا۔ جاپانی کھیت اتنے ننھے منے ہوتے ہیں کہ ایک درمیانہ سائز کا امریکی کھیت ایک جاپانی کھیت سے سو گنا بڑا ہوتا ہے۔ مگر اس کو اس خوبی سے اگایا جاتا ہے کہ اپنی ملکی ضروریات کا 4/3 حصہ خود پورا کر لیا جاتا ہے۔ ان سیڑھی نما کھیتوں پر چائے کے باغات بہت خوبصورت لگتے تھے۔ چائے کو غالباً گرمی زیادہ لگتی ہے اس لئے ان کو ٹھنڈا رکھنے کیلئے کھیتوں میں بڑے بڑے پنکھے اور فوارے بھی لگائے ہوئے تھے۔

راستوں پر ہائی ویز اکثر پہاڑی ٹنلز میں سے گزرتی ہیں جہاں سفید خاص قسم کی روشنیاں اندر دِن جیسا اُجالا کئے رکھتی ہیں۔اس طرح سمندر کے نیچے واٹر پروف ٹنلز بنا کر تین جزائر کو آپس میں مربوط کیا گیا ہے جو کہ 54 میٹر لمبا ہے۔

ٹرینیں کچھ سطح زمین سے اُوپر چلتی ہیں جبکہ اکثر زیر زمین چلتی ہیں۔ بلٹ ٹرین دنیا کی تیز ترین ریلوے سروس ہے۔ پلیٹ فارم پر دروازوں کے کھلنے کی جگہ پر نشان لگائے گئے تا کہ سب کو پتہ ہو کہ کس خاص جگہ پر دروازے کھلیں گے اور ہر پندرہ سیکنڈ کے بعد ٹرین سٹیشن میں داخل ہوتی ہے۔لوگ اندر گھستے ہیں اور اگلے منٹ یہ 2 سوکلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہی ہوتی ہے۔ٹوکیو میں ایک بڑا کمپیوٹر ان تمام 150 ٹرینوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ بلٹ ٹرین جسے Shinkansen بھی کہا جاتا ہے دنیا کی سب سے زیادہ تیز اور پر اعتماد ٹرین ہے۔

ماؤنٹ فیوجی اُن کا Heritage Symbol یعنی قومی ورثہ اور نشان ہے۔اُن کی کہاوت ہے کہ ہر ایک کو اپنی زندگی میں ایک دفعہ ضرور ماؤنٹ فیوجی پر چڑھنا چاہئے۔ اس کو سر کرنے کیلئے پانچ سے نو گھنٹے کا عرصہ درکار ہے۔ظاہر ہے یہ ایک تھکا دینے والا کام ہے مگر راستے میں ہوٹل اور آرام گاہیں بنادی گئی ہیں۔اس کو دیکھنے کیلئے وقت کی پلاننگ بہت احتیاط سے کرنا پڑتی ہے۔یعنی اگر آپ رات کو چڑھنا شروع کریں اور ساری رات چڑھائی کرتے رہیں تو پھر صبح سورج کے طلوع ہونے سے پہلے آپ چوٹی پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے آپ طلوع آفتاب کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ یہ خالص جاپانی تجربہ آپ کو جاپان کے اصلی نام ''چڑھتے سورج کی سرزمین'' کا نظارہ کرواتا ہے۔چینیوں

نے اسے یہ نام JehPin اسی لئے دیا تھا۔

میرے اندر جو جاپان جانے کی اڑچن ہنوز اٹکی ہوئی تھی وہ ٹوکیو کی جانب سفر کرتے ہوئے اچانک ماؤنٹ فوجی کو سامنے دیکھ کر یکلخت غائب ہوگئی۔ اور میں بالکل مبہوت ہو کر خدا تعالیٰ کی اس خوبصورت تخلیق کو دیکھتی رہ گئی۔ واقعی اصلی ماؤنٹ فیوجی تصویروں کے مقابلے میں کہیں خوبصورت تھا۔ وہاں پہاڑ کے سامنے ایک بڑے سے ہوٹل میں ماؤنٹ فیوجی کو دیکھنے کیلئے جگہیں بنی ہوئی تھیں جہاں سے ہم نے اس خوبصورت مشہور و معروف پہاڑ کو جی بھر کے دیکھا۔ اور پھر پہاڑ کے ساتھ ہی اتفاقاً اسی وقت بلٹ ٹرین بھی شوں کر کے اُونچائی میں بنے ٹریک پر سے گزری تو گویا ایک خاص نظارہ تخلیق ہوا۔ بلٹ ٹرین بذات خود بھی بہت خوبصورت چیز ہے۔ ماؤنٹ فیوجی کی ڈھلانوں اور دامن کو خوبصورت پارکوں اور آرام گاہوں سے سجایا گیا ہے۔ ہماری جماعت کے خدام اور انصار کے اجتماع عموماً ماؤنٹ فیوجی پر ہی منعقد کئے جاتے ہیں۔

ٹوکیو The Huge Capital City یعنی جاپان کا سب سے بڑا اور دُنیا میں سب سے زیادہ آباد شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ 26 چھوٹے شہروں اور پندرہ چھوٹے گاؤں سے مل کر بنا ہے اور جاپان کی آبادی کے 1/10 حصے یعنی 12 ملین لوگوں کا گھر ہے۔ گنزا اور اکی بارا مشہور شاپنگ سنٹر ہیں۔ اکی بارائی اور تازہ ترین جاپانی مصنوعات اور بجلی کے سامان کیلئے مشہور ہے۔

نگویا سے مکرم مقبول احمد صاحب اور مکرم طلعت محمود صاحب ہمیں ٹوکیو کی سیر کیلئے لے کر گئے۔ راستے میں ایک جھیل پر رُکے اور پھر وہاں سے ماؤنٹ فیوجی کو دیکھتے

ہوئے ٹوکیو پہنچے۔ٹوکیو مشن ہاؤس میں ہمارا قیام تھا۔اگلے دن ٹوکیو کی سیر کو نکلے۔ٹوکیو ڈاؤن ٹاؤن میں بڑی بڑی بلڈنگز کے اردگرد اونچائی میں بھی ٹرینیں چل رہی تھیں۔ہم نے خاص طور پر وہاں کا ریلوے اسٹیشن دیکھا جو کہ دنیا کے بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک تھا۔وہاں تمام کام کمپیوٹرائزڈ تھا۔ٹکٹ لینے دینے اور دکھانے کیلئے کوئی انسانی وجود نہیں تھا۔یوں لگتا ہے وہاں انسان بھی روبوٹ کی طرح ہی ہیں۔ ہر کام مشینی طریقے اور ڈسپلن سے کرنا ان کا قومی کردار بن چکا ہے۔جاپان کی زیادہ آبادی شہروں میں رہتی ہے، جہاں لوگوں کے ہجوم میں زندگی گزارنا بذاتِ خود ایک فن ہے۔لیکن اُن کی زندگی کا نظم وضبط اور اعلیٰ اخلاق ہی ان کو اس سے نبرد آزما ہونے میں مدد دیتے ہیں۔وہ ریلوے اسٹیشن پر خاموشی اور صبر کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں اور کہیں کوئی دھکم پیل دکھائی نہیں دیتی۔ہم بھی مشینوں سے ہی ٹکٹ لیتے، اسکیلیٹرز پر چڑھتے نہ جانے کون سے لیول کے پلیٹ فارم پر آ گئے اور وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر ٹوکیو ڈاؤن ٹاؤن کے مشہور بازار اَ کی بارا پہنچے۔اَ کی بارا تازہ ترین جاپانی مصنوعات اور بجلی کے سامان کیلئے مشہور ہے۔ہم نے سوچا اب جبکہ واقعی ہم جاپان میں موجود ہیں اور پھر اس مشہور زمانہ صنعتی بازار میں گھوم رہے ہیں تو چلو یہاں سے کچھ خرید ہی لیتے ہیں تاکہ سند رہے۔مگر جب قیمتیں پوچھیں اور Yens کو ڈالروں سے ضرب تقسیم دی تو ٹورنٹو ٹوکیو سے کہیں سستا نکلا۔

اسی طرح مجھے جاپان سے کپڑا خریدنے کا بھی بہت شوق تھا کیونکہ مدتوں ہم نے جاپانی کپڑوں کے نہایت اعلی سوٹ پہنے۔اب یہاں آ کر کپڑا نہ خریدنا بھی بدذوقی تھی۔

چنانچہ میں بہت شوق سے کپڑوں کے ایک بہت بڑے سٹور میں گئی۔تمام سٹور گھوم ڈالا مگر کوئی ڈھنگ کا کپڑا، ڈیزائن یا پرنٹ نظر نہیں آیا۔ جو کچھ قابل ذکر پرنٹ تھے وہ 20 ڈالر فی گز سے شروع ہوتے تھے۔ چنانچہ عجب مایوسی اور بے زاری سے ارادہ ترک کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید جاپانی ہر اچھی چیز باہر ایکسپورٹ کر دیتے ہیں اور گھر والوں کو مہنگائی کے ذریعہ سادہ زندگی گزارنے کا درس دیتے ہیں۔

ویسے ہم نے سنا بھی ہوا تھا کہ جاپان میں مہنگائی بہت ہے۔ان دو وارداتوں کے بعد ہم نے ونڈ وِشاپنگ میں ہی عافیت سمجھی اور اکثر مشہور بازار دیکھ ڈالے۔مگر بھلا ہو اپنے ڈالر سٹورز کا۔ جاپان میں بھی Hundred Yen Stores بہت تھے۔ہم نے جاپانی سوغاتوں کیلئے انہیں غنیمت جانا۔مگر ایک بات تھی وہاں کی چیزوں کا سٹینڈرڈ یہاں کے ڈالر سٹورز کی نسبت بہت اُونچا تھا۔

ٹوکیو میں بادشاہ کا محل اور اُس کے آس پاس کا علاقہ خواص کا علاقہ تھا۔ بادشاہ کے محل کے آس پاس خندق تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور جا بجا خوبصورت پل بنے ہوئے تھے۔اس علاقے میں پاکستان سمیت دوسرے ملکوں کے سفارت خانے بھی تھے اور مشہور زمانہ بازار گنزا بھی اسی علاقے میں واقع تھا۔ہم نے خاص طور پر گنزا میں تصاویر بنوائیں۔ بازار تو ویسا ہی تھا۔ جیسے کہ دُنیا کے مشہور بازار ہوتے ہیں۔صرف ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ اُس دن بازار میں ٹریفک ممنوع تھی اور لوگ سڑک کے درمیان کرسیاں وغیرہ بچھا کر بیٹھے بازار کی گہما گہمی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ہمارے لئے یہ خصوصیت تھی کہ ہم گنزا میں کھڑے ہیں۔ارے واہ!...اور بس!!

ٹوکیو میں ایفل ٹاور کی شکل کا سرخ رنگ کا ٹوکیو ٹاور بھی دیکھنے گئے۔ وہاں سے ڈزنی لینڈ اور ٹوکیو کے آس پاس کے علاقے اور جزیرے نظر آتے تھے۔ وہیں پر نیو یارک کے Statue of Liberty کا چھوٹا ماڈل بھی رکھا ہوا تھا جو کہ بذاتِ خود خاصہ بڑا تھا۔ ٹوکیو کے ساتھ ایک جزیرے Okado کی سیر کیلئے بھی گئے۔ جزیرے کو ٹوکیو سے ایک بہت لمبے پل سے جوڑا گیا تھا۔ وہاں پر ساحل کے ساتھ ساتھ ہوٹلوں کی قطاریں تھیں جہاں ہر ملک کے کھانے دستیاب تھے۔ وہاں مکرم طلعت محمود صاحب نے ہمیں پاکستانی کھانا کھلایا۔ ساحل پر ہر وہ رنگا رنگی مہیا کی گئی تھی جو ان ساحلوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

ٹوکیو کا ڈزنی لینڈ فلوریڈا کے ڈزنی لینڈ کا جڑواں بھائی ہے۔ ہو بہو وہی کاپی۔ اور ایک طرح سے فار ایسٹ کے اس علاقے کیلئے واحد ڈزنی لینڈ ہے اس لئے آس پاس کے ملکوں کے لوگوں کیلئے بھی کشش کا باعث ہے۔ ہمارے ساتھ جلسہ میں جو انڈونیشیا سے لوگ آئے ہوئے تھے وہ خاص طور پر اُسے دیکھنے گئے۔

ٹوکیو میں ایک بازار جاپانی کلچر اور روایتوں کا امین بھی ہے جہاں آپ کو پرانے جاپان کے تمام لوازات مل جاتے ہیں۔ بتایا گیا کہ حضرت خلیفہ رابع رحمہ اللہ نے اپنی فیملی کیلئے کمونو لباس یہاں سے منگوائے تھے۔ کمونو پہنے ہوئے عورتیں اِکا دُکا کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔ مجھے جونہی نظر آتیں میں کھٹ سے اُن کے پاس جا کھڑی ہوتی اور تصویر بنوا لیتی۔ وہ بھی مسکرا کر اجازت دے دیتیں۔

ہمارا اگلا سفر کیوٹو کی طرف تھا۔ کیوٹو وہ مشہور شہر ہے جہاں یو این او نے گلوبل

وارمنگ روکنے کیلئے کیوٹو پروٹوکول نامی معاہدہ کیا تھا۔ کیوٹو جاپانیوں اور سیاحوں کیلئے ایک پسندیدہ شہر ہے جہاں قدیم وجدید جاپان نظر آتا ہے۔ کمونو پہنے ہوئے عورتیں، باغوں کے کسی کنج میں بنے ہوئے ٹی ہاؤسز اور بڑے بڑے پگوڈوں سے سجا ہوا یہ شہر سیاحوں کیلئے پرکشش جگہ ہے۔ جدید بازاروں کے پیچھے قدیم لکڑی کے بنے ہوئے گھر، تنگ گلیاں اور بازار جن میں جاپانی کاغذ کے بنے ہوئے فانوس اور لالٹین قدیم جاپان کی جھلک بھی دکھاتے ہیں۔ گہرے سبز درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ شہر 2 ہزار سے زیادہ مندروں اور پگوڈوں سے بھرپور ہے۔

جاپان میں دو بڑے مذہب شانہ بشانہ چلتے ہیں: شنٹو ازم اور بدھ ازم۔ دونوں مذاہب کا جاپان کے کلچر پر نمایاں اثر ہے۔ مذہبی یا غیر مذہبی دونوں طرح کے لوگ ان مذاہب کے رسم ورواج سے متاثر ہو کر انہیں عمومی طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔ شنٹو ازم میں قدرت اور نیچر سے محبت سکھائی جاتی ہے اور آباؤ اجداد کا قومی ورثہ اپنانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اسلئے شنٹو پگوڈے عموماً خوبصورت نظاروں کے نزدیک بنائے جاتے ہیں۔ شنٹو ازم میں جاپان کے مخصوص طرز کے چوکور محرابی دروازے جو کہ Torigate کہلاتے ہیں، روحانی دنیا میں داخل ہونے کیلئے ضروری خیال کئے جاتے ہیں جبکہ ہمارے لئے یہ چوکور دروازے جاپان کی طرز تعمیر کا ایک نمایاں قومی نشان ہیں۔ بدھ ازم کا بنیادی فلسفہ گیان و دھیان ہے یعنی بدھ کی طرح آلتی پالتی مار کر Mediate کرنا یعنی اپنی توجہ ایک جگہ مرکوز کر کے روحانی اور جسمانی سکون حاصل کرنا۔ یہ عمل Zazen کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ تناسخ بھی بدھ مت کا بنیادی

جزو ہے۔

ہم نے وقت کی کمی کے باعث کیوٹو میں دو پگوڈوں کی زیارت کی ۔ جاپان کی اکثریت بدھ مذہب کی پیروکار ہے۔اس لئے ہر پگوڈا میں حضرت گوتم بدھ کے بڑے بڑے سنہری مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ یہ مجسمے 14 میٹر تک بلند ہو سکتے ہیں۔سینٹرل کیوٹو میں ٹوجی پگوڈا سب سے قدیم ہے۔اس میں 15 گوتم بدھ کے مجسمے ساتویں اور آٹھویں صدی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ پانچ منزلہ 57 میٹر بلند پگوڈا جاپان میں سب سے اُونچا لکڑی کا بنا ہوا ٹمپل ہے۔اس ٹمپل کا بنیادی فلسفہ ''یاکوشی نیوری'' یعنی شفا بخش بدھا ہے۔ جب آپ کسی بدھ مندر میں جائیں تو داخل ہونے سے پہلے ایک خوشبودار لکڑی جلا کر چھت پر لٹکتے ہوئے بڑے سے گجر کی گھنٹی بجائیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کورنش بجا لائیں۔عبادت کیلئے مخصوص اوقات ہیں۔اندر کی سجاوٹ بھی بھرپور جاپانی طرز آرائش کا نہایت خوبصورت منظر پیش کرتی ہے۔

شنٹو پگوڈا جو خوبصورت نظاروں سے مزین ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، ہم بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اسے دیکھنے گئے۔اوپر پہنچے تو ایک چھوٹے سے حوض کے آس پاس لوگوں کو دیکھا جو لکڑی کے چمچوں سے پانی لے کر اپنا منہ اور ہاتھ بھگو رہے تھے۔اُدھر صحن میں ایک تھال نما چبوترے کے درمیان میں آگ جل رہی تھی اور آس پاس بہت سی راکھ تھی۔ یہ مقدس آگ تھی اور اس کی راکھ شفا بخش سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر آنے والا پہلے پانی سے اپنا ہاتھ منہ پاک کرتا اور پھر راکھ چکھتا تا کہ اُسے روحانی شفا حاصل ہو۔اسی طرح پگوڈے کے بڑے ہال میں سنہری دیوہیکل مجسمے رکھے ہوئے تھے۔(دونوں

مذہبوں کے پگوڈوں کا بنیادی رنگ سنہری تھا) وہاں ایک طرف بھکشو یعنی Monks کے بیٹھنے کیلئے جگہیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بالکل ہمارے پیروں فقیروں کی طرح لوگوں کی تکالیف سن کر تعویز وغیرہ بنا کر دے رہے تھے اور اس کا ہدیہ وصول کر رہے تھے۔ ان عبادت گاہوں کی زیارت سے ایک بات سامنے آئی کہ مذہب کوئی بھی ہو، مُلّا کی اجارہ داری ہر جگہ قائم ہے۔ انسان کی جبلی روحانیت کی پیاس اُسے مولوی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہی رکھتی ہے۔

ایک پگوڈا میں گھومتی ہوئی میں ایک طرف نکل گئی۔ وہاں ایک کمرے میں جاپانی پھولوں کی آرائش وسجاوٹ ''اکی بانا'' کا شعبہ تھا۔ ایک زمانہ میں اکی بانا ہم نے بھی بہت شوق سے سیکھا تھا چنانچہ جاپان میں یوں اچانک عورتوں کو پھول سجاتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

جاپان میں ایک پرانی کہاوت ہے کہ تمام جزیرہ جاپان ایک بڑے Dragon کی پشت پر بنا ہوا ہے۔ جب بھی یہ اژدھا سوتے میں روٹ بدلتا ہے تو جاپان میں زلزلہ آجاتا ہے بہرحال اس اژدھے کی کروٹوں سے سمجھوتا کرتے ہوئے انہوں نے زلزلے سے بچنے کی بھرپور طریقے استعمال کئے ہوئے ہیں۔ جن میں بلڈنگز اور گھروں کی بنیادوں کو اس طرح استوار کیا جاتا ہے کہ وہ زلزلہ کے دوران جھولیں ضرور مگر گریں نہیں۔ بڑی بلڈنگز کی بنیادوں میں لوہے کے اسپرنگ لگائے جاتے ہیں جو جھولنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہر سکول میں زلزلہ سے بچنے کی ڈرل ہوتی رہتی ہے اور گھروں میں بھی آگیں بجھا کر میزوں کے نیچے یا دروازوں کے پیچھے چھپنے کی ریہرسل کی جاتی ہے اور ہر

گھر میں زلزلہ کِٹ ہر وقت موجود رہتی ہے۔سونامی بھی اسی زلزلہ کا ایک نہایت خوفناک By Product ہے جو پلک جھپکنے میں لاکھوں لوگوں کا صفایا کر دیتی ہے۔ ہماری جماعت میں ہیومینیٹی فرسٹ والے ہر آفت زدہ علاقے میں جا کر بہت امدادی کاروائیاں کرتے ہیں۔کوبے کے زلزلہ میں ہماری ٹیم نے بہت جانفشانی سے کام کیا اور اس کے علاوہ لوگوں کو دال چاول بھی پکا کر کھلائے جو انہیں بہت پسند آئے۔اس جلسے میں کوبے کے نمائندوں نے شرکت کی اور جماعت کی بہت تعریف کی۔

ہندوؤں کی برہمن کلاس کی طرح ساموارئی بھی جاپانیوں کے اشرف المخلوقات تصور کئے جاتے ہیں اور انہیں بھی تمام وہی مراعات حاصل ہیں جو برہمنوں کو ہیں۔لیکن یہ طبقہ زیادہ نہیں۔باقی لوگوں میں تاجر، ورکنگ کلاس، پادری اور مولوی حضرات شامل ہیں۔اگرچہ اعلیٰ حیثیت سوانہیں ہی حاصل ہے مگر یہ چھوٹے لوگ اکثر ان ساموارئیوں سے زیادہ امیر ہوتے ہیں۔سات سو سال تک جاپان پر شوگن اور سومرائی مسلط رہے اور انہوں نے جاپان کا باہر کی دنیا سے قطع تعلق کا حکم صادر کئے رکھا۔ان کے مطابق ایک خالص جاپانی ہدایات و افکار والا ہی اصلی جاپانی ہے۔لہٰذا باہر سے کسی کو مخل ہونے کی اجازت نہیں لیکن قرآنی پیشگوئی کے مطابق جب یاجوج ماجوج سمندر کی ہر لہر کو پھلانگتے ہوئے جاپانی ساحلوں پر بھی وارد ہو گئے اور 1853ء میں کموڈور پیری نے اپنے سٹیم شپ کے ساتھ ان کے دروازے کھٹکھٹائے اور شوگنوں کو امریکہ سے تجارت کرنے کا حکم صادر کیا۔ادھر شوگنوں میں اتنا دم خم باقی نہیں رہا تھا کہ مقابلہ کرتے۔چنانچہ اس طرح بیرونی دنیا کی تازہ ہوا اُن تک پہنچی اور پھر ترقی اور تبدیلی کا ایک نیا دور شروع ہوا جن میں

ریلوے فیکٹریاں، سٹیم پاور، بجلی اور سینکڑوں دوسری ایجادات شامل ہیں۔قوم ذہین تھی۔ جب سیکھا تو سب کو مات دے دی۔شوگن گئے تو میجی آ گئے۔لیکن اس کے سو سال بعد جنگِ عظیم کے اختتام پر جاپان میں ایک جمہوریت بنی اور بادشاہ سلامت برطانیہ کے بادشاہ کی طرح بطور تبرک ابھی تک رکھے گئے ہیں جو ٹوکیو میں اپنے ''بکنگھم پیلس'' میں رہتے ہیں۔

جاپان کو مطالعہ کرنے والوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔تقریباً ہر شخص یہاں پڑھ سکتا ہے اور پڑھتا ہے اور ہر روز ایک سو سے زیادہ اخباریں جاپانیوں کو دنیا کی ہر نئی چیز سے باخبر رکھتی ہیں۔ ہزاروں Comicbooks شائع کی جاتی ہیں جو کہ ہر عمر کے شخص کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ بک سٹورز ہر وقت پڑھنے والوں سے بھرے رہتے ہیں اور وہاں کا ایک اصول یہ ہے کہ آپ کھڑے ہیں تو جتنی چاہیں کتابیں رسالے پڑھ لیں لیکن اگر آپ بیٹھ گئے تو پھر آپ کو یہ کتاب خریدنا ہوگی۔

جاپان میں ہر آنے والا اُن کی مہمان نوازی اور خوش خلقی سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ ہر ایک کو جھک جھک کر کورنش بجالانا اور بہت محبت سے پیش آنا اُن کی ہر طرح مدد کرنا جاپانی ثقافت کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔مگر یہی جاپانی کسی باہر سے آنے والے کی مستقل رہائش کو ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ ہی دل سے قبول کرتے ہیں۔ امریکہ کے ریڈ انڈینز کی طرح Ainn جو کہ یہاں کے اصلی باشندے ہیں انہیں شمالی علاقوں میں دھکیل دیا گیا ہے اور اُن سے ویسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے سرے اقلیتی گروپس کو بھی اسی طرح تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔خصوصاً وہ لوگ جن

کے آباؤاجداد ورکنگ کلاس سے تعلق رکھتے تھے یا جو لوگ سبزی خور تھے۔ابھی تک اُن کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔نہ اُن کو ڈھنگ کی جاب دی جاتی ہے نہ اُن سے شادیاں کی جاتی ہیں۔اسی طرح کوریا سے کسی زمانے میں کام کے سلسلہ میں لائے جانے والے افراد کی نسلیں ابھی تک جاپانی سٹیزن نہیں بن سکیں اور باہر سے آنے والے افراد چاہے جس قدر بھی محنت اور کوشش کرلیں وہ جاپانی سوسائٹی میں جگہ نہیں پا سکتے۔

جاپانی والدین خاص طور پر جاپانی مائیں اپنی بھرپور کوشش کرتی ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے سکول اور ہوم ورک پر پوری توجہ دے سکیں۔اس لئے اُن کو ایجوکیشن مامز یا تعلیمی مائیں کہا جاتا ہے۔بعض دفعہ صرف اپنے بچوں کو بہتر طور پر پڑھانے کیلئے کورسز لیتی ہیں تاکہ صحیح طور پر ان کے ہوم ورک میں مدد کرسکیں اور بعض دفعہ تو بچے بیمار ہوجائیں تو اُن کی جگہ سکول جانے میں بھی عار نہیں سمجھتیں اور سالانہ امتحانوں کے دنوں میں مائیں اپنے بچوں کا نام رجسٹر کروانے کیلئے گھنٹوں قطاروں میں کھڑی رہتی ہیں تاکہ بچوں کا قیمتی پڑھائی کا وقت ضائع نہ ہو۔جاپانی مردوں کو عام طور پر ''اجنبی باپ'' کا خطاب دیا جاتا ہے۔وہ رات گئے واپس آتے ہیں اور صبح اُن کے جاگنے سے پہلے بچے جاچکے ہوتے ہیں۔دراصل جاپان میں کام کو اوّلین اہمیت دی جاتی ہے۔کمپنی کے مالکان ٹیم ورک کو پسند کرتے ہیں۔اس لئے کمپنیوں کے مینجر اپنے ورکرز کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر کام کرتے ہیں اور دوپہر اور شام کا کھانا مل کر کھانے کو اہمیت دیتے ہیں تاکہ ایک مشترکہ ٹیم کی روح پیدا ہو اور مل کر کام کو بہترین طریقے پر سرانجام دیا جائے۔

کسی جاپانی کو انگلش نہ آنے کی بڑی وجہ اُن کے اپنے جاپانی کلچر سے محبت ہے۔

ان کے ذہن ہی میں یہ نہیں کہ ہم نے باہر جانا ہے۔

اُن کا سکولنگ سسٹم کسی برٹش یا امریکن سکولنگ سسٹم کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ ان کا اپنا نصاب ہے جس کا بنیادی نکتہ ڈسپلن ہے۔ ہر کلاس میں بچوں کے مختلف گروپس بنائے جاتے ہیں جن کو مختلف ڈیوٹیاں ازقسم صفائی، کھانا اور دیگر کام بانٹے جاتے ہیں۔ اس سے ڈسپلن اور عاجزی دونوں آجاتے ہیں۔ جاپانی گھروں کا بھی ایک خاص ہی سٹائل اور طریقہ ہے جو کہ شاید دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے ہاں مہمانداری کا خانہ عموماً خالی رہتا ہے۔ اس لئے گھر بالکل پرائیویٹ لائف سٹائل کے حامل ہوتے ہیں۔ گھروں میں داخل ہونے پر وہی جوتوں کی ڈرل، فرنیچر وغیرہ کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہر گھر کے فرش پر چٹائیاں جنہیں Matami کہا جاتا ہے، بچھی رہتی ہیں اور جو کہ پلنگ صوفے کرسیاں میزیں غرضیکہ ہر قسم کے فرنیچر کا مکمل رول ادا کرتی ہیں۔ کچن میں ایک چوکی نما میز کے اردگرد چھوٹی چھوٹی پیڑھیاں، کچن کے تمام کام مل بانٹ کر کر لئے جاتے ہیں۔ گھر کے ہر فرد کے ذمہ کوئی نہ کوئی ڈیوٹی ضرور ہوتی ہے۔

یہاں جامعہ کینیڈا میں جاپان سے آئے ہوئے طالبعلم عزیزم حزقیل احمد جو مقبول احمد صاحب آف جاپان کے بیٹے ہیں، ہمیں کبھی کبھی ملنے کیلئے آتے ہیں۔ جب میں کچن میں کام کر رہی ہوتی ہوں تو حزقیل باقاعدہ ذمہ داری سے میرے پاس آکر کام کرنے لگتے ہیں۔ میز لگانی، برتن اُٹھانے، برتن دھو کر خشک کر کے الماری میں رکھنے غرضیکہ جب تک میں وہاں رہوں، ساتھ دیتے ہیں۔ میرے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ یہی کہتے ہیں آنٹی یہ کام تو کرنے ہوتے ہیں اس میں منع کرنے کی کونسی بات ہے۔ ان کے بقول

یہ تو جاپان کا گھریلو کلچر ہے۔(کیا بات ہے) یہاں کے فرشی لائف سٹائل کی بدولت اگر دن کو ایک جاپانی گھر ایک بڑے ہال کمرے کی مانند نظر آتا ہے تو رات کو سلائیڈنگ دیواریں اُسے مختلف کمروں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ جہاں یہ چٹائیوں پر گدے بچھا کر تکیہ چادر لگا کر بیڈروم مکمل ہو جاتے ہیں۔صبح یہی گدے تہہ کر کے واپس الماریوں میں چلے جاتے ہیں اور دیواریں فولڈ ہو کر اپنے اپنے کونوں میں۔ اللّٰہ اللّٰہ اور خیر سلاّ ...گھر پھر وہی کھلا میدان ہے...عجب درویشی ہے!...عجب بے نفسی ہے!

صاحبو! جاپان بھی عجیب دو متضاد دنیاؤں کا مرکب ہے۔ ماڈرن جاپان دنیا کا سب سے بڑا صنعتی اور جدید ترین ٹیکنالوجی کا خالق ، اونچی بلڈنگز ،مصروف شاہراہیں، لوگ جدید ترین ملبوسات اور سٹائلز کو پسند کرنے والے ماڈرن دنیا کے شیدائی اور دوسرا جاپان جس کی جڑیں ماضی میں بہت گہری ہیں اور جو اپنی صدیوں پرانی ثقافت روایات رسوم ورواج اور اصولوں پر پوری طرح کاربند ہے۔ ایک پُرسکون خاموش دنیا میں جو قدرت کے حسن، خوبصورتی اور آرٹ کو اپنے دلوں میں بسائے ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ اُس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے اپنی روزمرہ زندگی میں شامل رکھتا ہے۔

ہم بہت سے ملکوں میں گھومے اور رہن سہن تقریباً اکثر مما لک کا ایک جیسا ہی پایا۔ مگر جاپان ہمیں کچھ منفرد سا لگا۔ کچھ سادگی و پُرکاری بے خودی و ہوشیاری والا معاملہ تھا۔ گھر اتنے سادے مگر باہر گھروں کا باغیچہ کلاسیکل ،فرنیچر کا بکھیڑا نہیں مگر باتھ روم سے لیکر گھر کے ہر کونے میں جدید ٹیکنالوجی اور ذہانت کا بھرپور استعمال۔ زندگی کے ہر لمحے کو طریقے سلیقے محنت اور لگن سے گزارنا اور ہر شعبے میں نظم وضبط ،اعلیٰ اخلاق ،خلوص اور

دیانت سے کام کرنا بقول خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کہ:

''جاپانی تو آدھے مسلمان ہیں صرف ان کو توحید کی طرف لانا ہے۔''

جماعت احمدیہ جاپان کے افراد نے ہماری میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ان کی محبت، ان کا خلوص ہمیشہ یاد رہے گا۔ان چند دنوں میں ہم سب یوں گھل مل گئے کہ آج تک وہاں کی جماعت کے افراد ہمیں اپنے خاندان کے افراد کی مانند نزدیکی اور پیارے ہیں۔ وہاں کی خواتین نے بہنوں کی طرح محبت دی۔اللہ تعالیٰ تمام افراد جماعت کو بہترین اجر سے نوازے۔آمین۔

میں اب بھی سوچتی ہوں کہ اگر جاپان نہ جاتی تو شاید زندگی میں کچھ ادھوراپن رہ جاتا۔

○○

قادیان سے واپسی پر چند تأثرات

رَبّ کی رحمت کا اِک نشاں دیکھا — میں نے امسال قادیان دیکھا
ایک مدت کے بعد جلسہ پر — پاک مہدی کا آستاں دیکھا
آسماں سے ملائکہ کا نزول — میں نے خود اس جگہ یہاں دیکھا
جوق در جوق لوگ آئے تھے — ارض پر پڑ گئے نشاں دیکھا
کتنی رنگوں کا کتنی نسلوں کا — بن گیا کارواں دیکھا
ایسی دیکھی فضائے روحانی — جیسے نورِ خدا عیاں دیکھا
وردِ صلی علی کا کرتے ہوئے — واللہ ہر پیرو نوجواں دیکھا
مسکراہٹ نہ چھِن سکی اپنی — میں نے ہر چہرہ شادماں دیکھا

(عبدالغفور عبدل)

میری خوش نصیبی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور اُس کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ 114 ویں تاریخی جلسہ سالانہ قادیان میں خاکسار کو شامل ہونے کا موقع ملا۔ اس جلسہ کی اہمیت و انفرادیت اس لحاظ سے غیر معمولی تھی کہ خلیفہ وقت نے بنفسِ نفیس شرکت فرما کر روح پرور خطابات سے نوازا اور نظام وصیت اور قمری سال کے حساب سے خلافت کے سو سال پورے ہونے کا اعلان فرمایا۔ اس کے علاوہ قادیان میں منعقد

ہونے والے جلسوں میں شرکاء کی سب سے بڑی تعداد یعنی 70 ہزار افراد نے اس میں شرکت کی۔اس لحاظ سے بھی یہ ایک تاریخی جلسہ تھا۔

ہمارا جانے کا پروگرام کچھ آناً فاناً ویزے کے حصول کے بعد بن گیا۔ بھاگم بھاگ تیاری کی اور 18 دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوئے۔20 دسمبر کو لاہور پہنچے 21 کو تھوڑا سانس لیا اور پھر 22 کو عازمِ قادیان ہوئے تاکہ 23 دسمبر کو حضور کے ساتھ جمعہ پڑھ سکیں۔ لاہور میں اُن دنوں دھند کا سیزن چل رہا تھا۔ چنانچہ صبح 9 بجے واہگہ بارڈر پر پہنچنا گویا بادلوں میں آنکھیں بند کر کے سفر کرنا تھا۔اللہ توکل انچ انچ آگے بڑھتے ہوئے واہگہ پہنچے۔ پاکستان کی امیگریشن کی کاروائی پوری ہوئی اور انڈیا میں قدم رکھا۔ جہاں کافی چھان پھٹک کے بعد ہمیں فارغ کیا گیا۔اٹاری سے ٹیکسی لیکر عازمِ قادیان ہوئے مگر رستہ ہنوز دھند میں روپوش تھا۔آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انڈیا کی سرزمین دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔دوپہر کو فضا قدرے صاف ہوئی اور ہم امرتسر کے نزدیک آ کر ہندوستان کی زمین دیکھنے کے قابل ہوئے۔کوئی خاص فرق نہیں تھا۔سوائے اس کے کہ ان کی سڑکیں اور فصلیں ہماری سڑکوں اور فصلوں سے بہتر تھیں۔باقی گردوغبار گندگی کے ڈھیر لوگوں کے رہن سہن، لباس اور مکانات تقریباً ہمارے جیسے تھے۔ البتہ گندگی کے ڈھیروں پر سوٴر مٹرگشت کرتے نظر آئے جو ہمارے لئے عجیب تھے۔اسی طرح بے ہنگم ٹریفک ریڑھوں، ٹانگوں سائیکل ،رکشوں اور کاروں کے درمیان کبھی کبھی کوئی رنگین دوپٹہ لہراتی ہوئی لڑکی سائیکل یا سکوٹر چلاتے ہوئے گذرتی تو وہ بے ہنگم ٹریفک تھوڑا رنگین ہو جاتا ۔ میرا مطلب ہے سائیکل یا سکوٹر چلاتی ہوئی لڑکیاں ہمارے ہاں

عنقا ہیں۔ امرتسر سے گزرے وہ ہمارے لاہور جیسا لگا۔ خاص طور پر گولڈن ٹیمپل کا علاقہ پرانے لاہور کی طرح چھوٹی اینٹوں کی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ وہاں نزدیک ہی جلیانوالہ باغ تھا جہاں اب پارک بنا کر یادگاری کتبے لگا دیئے گئے ہیں۔ بٹالہ کے نزدیک پہنچے تو پٹرول لینے کیلئے ایک جگہ رُکے جہاں راجپوتانے کی عورتیں اپنے مخصوص لباس، زیورات اور میک اپ کے ساتھ سڑک بنانے کی مزدوری کر رہی تھیں۔ (ہمیں کچھ ہندوستانی فلموں کا سا سین لگا) ہم نے اُتر کر ان سے بات چیت کی تو کہنے لگیں:

''کیا آپ تیرتھ یاترا کیلئے جا رہے ہیں؟''

ان دنوں اس سارے علاقے میں قادیان کے جلسے کی کافی مشہوری تھی۔

بٹالے سے گزرے تو تاریخ احمدیت کی کھٹی میٹھی یادیں ذہن میں تازہ ہوئیں۔ محمد حسین بٹالوی کی بدمزدگیوں کا مرکز اور حضور علیہ السلام کے تمام سفروں کا نقطہ آغاز رستے میں وہ نہر بھی آئی جہاں حضور کبھی کبھی اپنے دوستوں کو الوداع کہنے آتے تھے۔

بٹالہ سے آگے کا سفر تو گویا چشم تصور کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں گزرنے کا سفر تھا قادیان کے نزدیک پہنچ کر تسبیح و تحمید کے ساتھ دل کی بے تابی عروج پر تھی۔ جونہی منارۃ المسیح پر نظر پڑی سب کے چہرے کھل اُٹھے کہ یہی تو ہمارے قادیان کی پہچان ہے۔ یہی تو ہمارا قادیان ہے جس کے رُوحانی انوار کی کرنیں تمام دنیا میں ہمارے وجودوں کو منور رکھتی ہیں۔ اُس وقت جو دل کی کیفیت تھی اُس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ بس دل اللہ کی حمد اور شکر سے لبریز تھا جس نے یہ دن دکھایا کہ ہم دارالامان

کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرر ہے تھے۔ ہماری ٹیکسی کا سکھ ڈرائیور کہنے لگا کہ میں آپ کو اُسی کالے گیٹ والے محلہ احمد یہ میں لے چلتا ہوں ۔ چنانچہ اُس نے ہمیں دارالمسیح کے باہر اُتارا۔

قادیان کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی اصلاح میں واقعی غریب دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔گلی کوچوں میں رنگ برنگی جھنڈیاں اور بینر لگے ہوئے تھے۔تمام راستے محرابی دروازوں سے مزین اورخوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ اھلاً و سھلاً خوش آمدید۔انی معك یا مسرور اور دیگر دعائیہ کلمات کے بینرز مختلف زبانوں میں بھی لگائے گئے تھے۔محلہ احمد یہ تو خاص طور پر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔اور پھر ہم سب کی توجہ اور محبت وعشق کا محور ''الدار'' یعنی دارالمسیح تھا جس کی زیارت قلب وجان کو گرماتی تھی۔جس کی اوپر والی منزل کی بیرونی دیوار پر لکھا ہوا یہ شعر اس قدر پُرحقیقت اور ہر دل کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا تھا:

ہوتی نہ اگر روشن وہ شمع رُخِ انور
کیوں جمع یہاں ہوتے سب دنیا کے پروانے

واقعی یہ تمام دنیا کے پروانے ہمہ وقت اُس مسجد مبارک، دارالمسیح اور تمام گلی کوچوں میں دیوانہ وار زیارتوں سے مشرف ہوتے رہے۔وہ تمام مقاماتِ مقدسہ جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بودو باش اختیار کی ۔حضور اقدسؑ نے عبادتیں اور دعائیں کیں۔ جہاں حضرت مسیح موعودؑ کو الہامات ہوئے۔ وہ کمرے جہاں حضرت مسیح موعودؑ

اور مصلح موعودؓ کی پیدائش ہوئی۔ وہ کنواں جو دُشمنوں کے پانی بند کرنے پر آپ نے اپنے گھر کے آنگن میں کھدوایا تھا۔ وہ مسجد مبارک جس کے اندر لمبی قطاروں میں لوگ بیت الفکر اور حضرت اماں جانؓ کے دالان سے گذر کر بیت الدعا میں جاتے تھے۔ وہ کھڑکی جہاں سے حضورؑ بیت الفکر سے نکل کر مسجد مبارک میں داخل ہوتے تھے۔ ان گلی کوچوں کی اینٹیں جو ان مقدس مقامات کی تعمیر میں استعمال ہوئیں۔ وہ دالان اور حجرہ جہاں حضورؑ اپنے آخری دنوں میں تشریف فرما رہے۔ غرض بقول نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ کہ:

''بظاہر یہ سال خوردہ مکان ہے ایک دولت ہے۔ ایک برکتوں کا خزانہ ہے۔ جس کی ہر اینٹ پر دعائے مسیح الزماں ہو چکی ہے۔ اس کے در و دیوار پر آپکی آواز نقش ہے۔ وہ درد بھری پکار جو آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ ضرور اس کا نشان ان دیواروں پر ہے۔''

قادیان پہنچنے پر بہشتی مقبرہ کی حاضری سرِ فہرست ہوتی ہے چنانچہ بہشتی مقبرہ جا کر حضور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مزار مبارک پر حاضری دی اور دعائیں کیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی قبر بھی حضور کے ساتھ ہے۔ ایک طرف حضرت اماں جانؓ کیلئے جگہ خالی رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ باقی اکابرینِ جماعت کی قبروں پر بھی جا کر دعا کی۔ گویا تاریخ احمدیت وہاں بکھری پڑی تھی۔ اکثر اکابرین جماعت کے مزارات اور اُن کی زندگیوں کے حالات آنکھوں کے سامنے تھے۔ حضرت مولانا عبد الکریم سیالکوٹی صاحبؓ، حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ، حضرت سیدہ امِّ طاہر صاحبہؓ

یعنی:

روش روش پر تو زندگی ہے
مگر محیط ایک خامشی ہے
ہر اِک لوحِ مزار پر اِک
سُنی ہوئی داستان لکھی ہے

(عبدالمنان ناہید)

بہشتی مقبرہ کی ایک دیوار پر درویشان قادیان کی طرف سے یہ شعر نہایت پُر درد حقیقت کی ترجمانی کررہا تھا کہ:

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

واقعی اُن دنوں قادیان کے گلی کوچوں میں بہار آئی ہوئی تھی۔ ہر طرف عشاقانِ احمدیت سے سڑکیں بھری ہوئی تھیں جس گلی کوچوں، مسجدوں، بہشتی مقبرہ اور دارالمسیح کی حفاظت انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے کی۔ وہ درویشانِ قادیان یقیناً ہم سب کی اوّلین دُعاؤں کے مستحق ہیں۔ خدا تعالیٰ اُنہیں غریق رحمت کرے اور اُن کی نسلوں کو اپنی رحمتوں اور فضلوں سے نوازتا چلا جائے۔

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ روزانہ عصر کی نماز کے بعد بہشتی مقبرہ دعا کیلئے جاتے تھے۔ اُس وقت سڑکوں کے دونوں طرف دور دور تک لوگوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ لوگ

حضور کی زیارت کرتے اور والہانہ ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کرتے۔

جلسہ سے قبل اور بعد قادیان میں دھند چھائی رہتی تھی۔ مگر جلسہ کے تینوں دن خدا تعالیٰ کے فضل سے معجزانہ طور پر دھوپ نکلی رہی۔ جس کی وجہ سے MTA کی سروس میں آسانی ہوئی۔ ورنہ تمام دُنیا میں لوگ جلسہ کی کاروائی سے مستفیض نہ ہو سکتے۔ جلسہ کا پنڈال نہایت خوبصورت سے سجایا گیا تھا۔ سبز قالینوں سے میدان میں بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی جبکہ سٹیج کے دائیں بائیں سُرخ پلاسٹک کی کرسیاں تھیں۔ صفائی اور دیگر انتظامات نہایت اعلیٰ تھے۔ ٹی وی پر جلسہ کی کاروائی دکھائی جاتی رہی۔ تینوں دن لوگ تقریروں کے روحانی مائدے سے فیضیاب ہوئے اور نہایت اعلیٰ اخلاقی اور روحانی موضوعات پر ایمان افروز تقاریر سے ایمان تازہ ہوا۔ تقریب انعامات کا انعقاد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہام کا زندہ ثبوت تھا کہ:

''ہماری جماعت کے لوگ علم میں بہت ترقی کریں گے۔''

جلسے کے دنوں میں شام وعشاء کی نمازیں جلسہ گاہ میں ہوتی رہیں۔ مسجد مبارک اور مسجد اقصیٰ میں ان دنوں میں عموماً جلسے کے دنوں میں خصوصاً نمازِ تہجد اور باقی نمازوں میں بھرپور حاضری ہوتی تھی۔ مگر نمازِ تہجد کا سماں کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ مردوں سے بھی زیادہ عورتیں نہایت جوش وخروش سے مسجد مبارک میں رات اڑھائی بجے ہی آنا شروع ہو جاتیں اور پھر مختلف مربیان کی امامت میں نماز تہجد ہوتی اور خصوصاً محترم حافظ مظفر احمد صاحب کی امامت میں نمازِ تہجد کی کیفیت کا اظہار لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اُن کی خوبصورت قرأت میں رقت آمیز قرآنی دُعائیں اُس وقت سیدھی عرش پر جاتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ لوگ آنسوؤں کی لڑیوں میں آمین کہتے چلے جاتے تھے۔ مسجدوں میں لوگوں کی تڑپ اور بلبلاہٹ ایک روحانی طوفان بپا کئے دیتی تھی۔ پھر صبح کی نماز حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی امامت میں ادا کر کے دل میں عجب طمانیت اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ بعد میں درسِ قرآن ہوتا اور اس کے بعد بیت الدعا میں جانے کیلئے قطاریں لگ جاتیں۔ اس کے علاوہ بیت الفکر، بیت الدعا اور سُرخ چھینٹوں کے نشان والے کمرے میں نوافل کا سرور کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیروی میں دعا کیلئے بیت الدعا میں جانے کیلئے گھنٹوں صبر اور استقلال کے ساتھ زیرلب تسبیح کرتے ہوئے کھڑے رہنے کا بھی عجب ایک نظارہ ہوتا تھا۔ مسجد اقصیٰ میں مینارۃ المسیح اور خطبہ الہامیہ کے محراب میں جا کر نفل پڑھنے اور تصویریں کھچوانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ غرضیکہ جن سڑکوں اور گھروں میں حضور علیہ السلام اور ان کے رفقاء گزرے اور بود و باش اختیار کی اُن تمام گلی کوچوں میں تمام دنیا سے آئے ہوئے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

کینیڈا کی جماعت کے رہنے کا انتظام کینیڈا گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤسز 1991ء میں بنوانے شروع کئے گئے۔ ان میں جرمنی، یوکے، یو ایس اے اور کینیڈا کے گیسٹ ہاؤسز ہیں جو ایک ہی قطار میں بنے ہوئے ایک حاطہ میں ہیں۔ اس دو منزلہ عمارت میں نیچے بڑے ہال اور اوپر چھوٹے فیملی کمرے ہیں۔ ہماری جماعت کیلئے عورتوں اور مردوں کیلئے مخصوص دو ہال تھے۔ جن میں زمین پر دو رویہ نئے بستر

لگے ہوئے تھے اور درمیان میں گزرنے کا رستہ تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی ہیلتھ کلینک بنایا گیا تھا جہاں 24 گھنٹے طبی امداد مہیا کی جاتی۔ نہایت قابل ڈاکٹرز صبح و شام آتے تھے۔ ہر وقت ایک کمپونڈر یا نرس موجود ہوتے۔ ہومیوپیتھی کا انتظام بھی ساتھ ہی تھا۔ باہر خدام ہر وقت ڈیوٹی پر موجود ہوتے اور ہر ضرورت پوری کرتے۔ ایک طرف استری کروانے کیلئے سٹال قائم تھا اسی احاطے میں ہی کیفے ٹیریا بھی موجود تھا۔ بڑے بڑے جنریٹر بھی لگائے گئے تھے تاکہ بجلی کا نظام فیل نہ ہوسکے۔ احاطے کے باہر 24 گھنٹے سائیکل رکشے والے کھڑے ہوتے تھے اور کسی وقت بھی سواری کیلئے دقت نہیں ہوتی تھی۔

ہمارے کمرے میں 26 خواتین تھیں۔ شام کو آہستہ آہستہ لوگ واپس آنے لگتے اور خوب محفل آراستہ ہوجاتی۔ ہمارے ساتھ ڈرہم جماعت کی مسز مسرت اقبال بھی تھیں جو آتے ہی سب کی خدمت کیلئے کمربستہ ہوگئیں۔ کمرے میں سردی بہت تھی۔ شام کو واپس آئیں تو گیس کا ہیٹر لے آئیں۔ ساتھ ہی الیکٹرک کیٹل ، پتی ، چینی ، بسکٹ یعنی چائے کے پورے لوازمات اور ساتھ ہی گنے بھی۔ لہٰذا شام کو خوب محفل سجتی۔ ہیٹر کے اردگرد چائے اور بسکٹ کا دور چلتا یا پھر گنے چوسے جاتے۔ گنوں کی خوب رونق ہوتی۔ ساتھ باتیں ، لطیفے اور چٹکلے اور شام کو اکثر خواتین اپنے ساتھ قادیان کے بازاروں سے قادیان کے تبرک کے طور پر خوب ڈھیروں شاپنگ کرکے لاتیں اور پھر سب ان تحائف کو بڑے شوق سے دیکھتے اور اگلے دن خود لانے کا ''عزم'' کرتے۔ زیادہ زور سلک اور پشمینے کی شالوں پر تھا۔

اُن دنوں قادیان کی سڑکوں کے کنارے عارضی بازار قائم تھے۔ جہاں چار پائیوں پر کپڑے، شالیں اور دیگر اشیاء بچھا کر دکھائی جاتی تھیں۔ انہیں میں نے ''منجی بازار'' کا نام دیا۔لہٰذا منجی بازار سے سستے سوٹوں کی نمائش بھی اس شام کی محفل کا حصہ تھی۔رات دس بجے تک باتوں اور تبصروں کا زور ٹوٹتا تو سونے کی تیاری ہونے لگتی۔ صبح اڑھائی بجے تہجد کی تیاری شروع ہو جاتی۔آپ ہماری آپا فرحت وڑائچ صاحبہ (ہماری ایک بزرگ خاتون) کے سفید بالوں اور بزرگی پر نہ جایئے گا۔یہ وہ واحد خاتون تھیں جو ہر روز اڑھائی بجے اُٹھ کر تیار ہوتیں اور مسجد مبارک میں نفل پڑھنے کیلئے نکل جاتیں۔اگرچہ ہم میں سے بھی اکثر لوگ مسجد مبارک جا کر تہجد ادا کرتے مگر ان کے معمول میں فرق نہیں آیا۔اورتو اور ایک دن ٹھنڈے پانی سے نہا کر مسجد چل دیں جبکہ عام لوگ کوٹوں اور گرم کپڑوں میں ملفوف ہونے کے باوجود ٹھنڈ سے کانپ رہے ہوتے۔

قادیان کا ذکر نامکمل رہے گا اگر میں وہاں کے سائیکل رکشوں کا ذکر نہ کروں یہ رکشے کسی گیس یا پٹرول کی بجائے انسانی انرجی سے چلتے تھے۔یہ وہ سواری تھی جسے دیکھ کر پہلے پہل اس پر سوار ہونا ''گناہِ کبیرہ'' لگا۔جب دو دن کوئی اور سواری نہ ملنے کی وجہ سے پیدل چل چل کر حالت غیر ہونے لگی۔تو پھر ان پر سوار ہونا ''گناہِ صغیرہ'' لگا۔اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اگر ہم لوگ نہیں بیٹھیں گے تو ان کے رزق پر لات ہی ماریں گے تو چلو بیٹھ ہی جاتے ہیں۔پہلی ایک دو Rides پر نہایت شرمندگی اور Guilty Feel کیا۔مگر پھر ایسے ڈھیٹ ہوئے کہ اگر وہ اپنے کے مقرر کردہ ریٹ سے زیادہ پیسے

مانگ لیتے تو تھوڑا غصہ آجاتا کہ لوز یادہ مانگ رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کام کے اس قدر ماہر تھے کہ سڑکوں پر بے تحاشہ رش اور ہجوم کے باوجود اپنا راستہ ''سائڈ اے'' کہتے ہوئے نکال لیتے۔ چنانچہ ان پُرہجوم سڑکوں پر آنے جانے والوں دونوں طرف کے سائیکل رکشوں کی ''سیڈ اے سیڈ اے'' آوازیں قادیان کی رونق کا ایک حصہ تھیں۔ ہمارے گیسٹ ہاؤس کے باہر 24 گھنٹے اس شدید سردی میں صرف چادر یا کھیس لپیٹ کر کھڑے رہتے۔ جونہی ہم گیٹ سے قدم باہر رکھتے فوراً ایک رکشہ آگے آجاتا اور ہم اُس وقت سوار ہو کر مسجد مبارک کی طرف روانہ ہو جاتے۔ یقیناً اتنی مستعد، سستی اور باافراط سواری ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔

میرے میاں دلدار احمد کا بچپن قادیان میں گزرا ہوا تھا، چنانچہ اُنہیں اپنا گھر، جو محلہ دارالفضل میں تھا، دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔ چنانچہ ایک دن ہم نے ''Rent a Tanga'' کیا اور تقریباً سارا قادیان دیکھ چھوڑا۔ کالج، سکول ریلوے اسٹیشن، نواب محمد علی خاں صاحب کی کوٹھی۔ میاں شریف احمد صاحب کی کوٹھی۔ نور ہسپتال وغیرہ۔ اور پھر محلہ دارالفضل کا رُخ کیا اور کھوج لگاتے ہوئے مسجد فضل تک پہنچے جو کہ اب گوردوارہ بن چکی ہے۔ وہاں سے اندازہ لگا کر اپنے گھر کے پاس پہنچ کر پھر سے گم ہو گئے کہ اب وہ نقشے نہیں رہ گئے تھے۔ بہر حال ایک کونے سے گھر کی پہچان ہوئی اور صاحب خانہ سے اجازت لیکر اندر گئے۔ البتہ گھر کے اندر بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی چنانچہ پرانی یادیں تازہ کیں اور ڈھیروں تصویریں بنائیں۔ چھت پر چڑھ کر میرے میاں نے بہت سے لوگوں کے گھروں مثلاً بی ٹی صاحب، خواجہ عبدالقیوم صاحب اور ہدایت اللہ ہادی

صاحب کے گھر کی نشاندہی کی۔

قادیان ان دنوں لوگوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہاں سڑکوں پر لوگ چلتے پھرتے یوں نظر آتے تھے جیسے کوئی جلوس نکلا ہوا ہو۔ سڑکوں کے کنارے انڈے گرم اور چائے گرم کے عارضی ہوٹل ہر قدم پر قائم تھے اور خوب چلتے تھے۔ اس کے علاوہ قسما قسم کی ہندوستانی کھانوں کے ہوٹل تھے جن میں سب سے زیادہ نئی چیز ہمارے لئے رومالی روٹی تھی۔ میدے کے ایک پیڑے کو تقریباً 2 فٹ کی گولائی میں بیل کر اور پھیلا کر اُلٹے توے پر پکایا جاتا۔ بیلنے کے بعد وہ اسقدر باریک گول نرم رومال کی صورت اختیار کر لیتی کہ حیرت ہوتی۔ اُسے طے کر کے ایک مٹھی میں پکڑا جا سکتا تھا یہ روٹی ہر طرح کے کھانے کے ساتھ خوب مزا دیتی۔

صاحبو! قادیان اُن دنوں کتنی رنگوں اور نسلوں کا کارواں بنا ہوا تھا۔ ہر طرح کے اور نسل کے لوگ اکٹھے تھے۔ جن میں زیادہ تر کرناٹک، مدراس، حیدرآباد، کیرالہ، بنگلہ دیشی اور مالدیپ سے ہفتوں کا سفر کر کے پہنچے تھے۔ کشمیری لوگ بھی بہت تعداد میں تھے۔ انہوں نے گرم کپڑے بڑے کرتے کڑھائی والے پہنے ہوتے۔ اس کے علاوہ دنیا کے ہر کونے سے لوگ موجود تھے۔ ہم جاپان کے جلسے پر جن لوگوں سے ملے تھے انہی سے قادیان میں بھی ملاقات ہوگئی۔ یعنی خوب انٹرنیشنل اجتماع تھا اور خوب ملاقاتوں کا موقع تھا۔ وہاں کے ایک اخبار نے لکھا کہ اس جلسہ میں ہزاروں کی تعداد میں 45 سے زیادہ ملکوں کے احمدی نمائندوں نے شرکت کی اور یہ اجتماع مختلف رنگوں اور نسلوں کا ایک حقیقی امتزاج تھا۔ (دی ٹربیون دہلی 27 دسمبر 2005)

یہاں جانے سے پہلے کافی لوگوں نے ہمیں قادیان کی سردی کے متعلق خبردار کیا تھا کہ گرم کپڑے ضرور لے جانا۔ہم نے زیادہ پرواہ نہیں کی کہ بھلا کینیڈا سے زیادہ کیا ہوگی۔مگر صاحبو! کینیڈا میں سردی کہاں اصل سردی تو قادیان میں ہی ہوتی ہے۔ وہاں جوسردی ہم نے مسجد انوار میں صبح تہجد کی نماز میں کھائی ہے اُس کے مقابلے میں کینیڈا کوئی چیز نہیں۔مسجد انوار یقیناًArctic کا کوئی حصہ تھی۔ جہاں صبح تہجد کی نماز میں ہماری ہڈیاں بھی سردی سے چٹخنے لگتیں اور صحیح معنوں میں قلفی جم جاتی۔آپ سب کو ہم بھی خبردار کئے دیتے ہیں کہ جب بھی دسمبر میں جلسے پر جاؤ تو وہی سامان لیکر جانا جوالاسکا کے ٹرپ کیلئے ضروری ہوتا ہے ورنہ وہی حشر ہوگا جو ہمارا ہوا۔ابھی یہ سوچ کر ہی کپکپی ہونے لگی ہے۔لہٰذا خدا حافظ۔

○○

سوار و کیکٹس (Cactus) کی سرزمین پر

صدیوں کے تجربے کے بعد جو محاورے وجود میں آئے وہ اپنے اندر ایک عالمگیر اور ابدی سچائی رکھتے ہیں۔ ''مول سے بیاج پیارا'' والے محاورے میں یہی بیاج یعنی اپنی دونوں پوتیوں سے ملنے کی خواہش ہی ہمیں اریزونا لے جانے کی محرک ہوئی۔ کیونکہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے بیک گراؤنڈ میں ان چہچہاتی بلبلوں کی خوبصورت آوازیں اور کلکاریاں ہمیں تڑپا کے رکھ دیتی تھیں اور یہی جی چاہتا کہ فوراً انہیں باہوں میں بھر لیں اور بوسوں کی بارش کر دیں۔ آخر ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہوا اور پہلی فرصت میں ہم ان خوبصورت تتلیوں سے کھیلنے کیلئے نکل پڑے۔

انٹرنیٹ سے ٹکٹ لئے اور دو جگہ جہاز بدلنے کی مصیبت کو خاطر میں لاتے ہوئے ٹورانٹو سے Denver کی فلائیٹ لی۔ یونائیڈ ایئر لائن کا چھوٹا جہاز تھا جو کہ سب کا سب اصلی و نسلی قسم کے امریکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ امریکی جو ہم نے فلموں میں دیکھے اور کتابوں میں پڑھ رکھے تھے یعنی کہ Lankees خوبصورت لمبے چوڑے جوان جن کے سر جہاز کی چھت تک ٹکرا رہے تھے۔ فضاؤں میں محوِ پرواز ہوتے ہی خواتین و حضرات نے اپنے لیپ ٹاپ کمپیوٹرز کھولے اور اس زمانے کے چلن کے مطابق کمپیوٹر کی سکرینوں میں صم بکم ہو گئے۔ جہاز میں ہمارے سوا اور کئی ایتھنک یا بالفاظ دیگر

عجمی نہیں تھا۔ جب سے عالمی کساد بازاری نے پاؤں پھیلائے ہیں جہازوں کی کمپنیاں بھی بہت کنجوس بلکہ مکھی چوس ہوگئی ہیں۔ کھانا دینا تو دور کی بات ہے، منرل واٹر (پانی) کی بوتل یا کوک بھی غالباً دل پر پتھر رکھ کر اور بہت بادلِ نخواستہ قسم کے رویے سے دیا۔ اس سے اور کی جسارت کرنی ہوتو چھ ڈالر نکالیئے! ڈینور میں ڈیڑھ گھنٹے کا پڑاؤ تھا جو کہ پیٹ پوجا کی نظر ہوا اور پھر ایک بالکل ٹڈے قسم کے ننھے منے سے جہاز میں بیٹھ کر ڈھائی گھنٹے بعد اپنی منزل مقصود یعنی ٹوسان (ایری زونا) پہنچے۔

خدا تعالیٰ کا بے حد شکر اور احسان ہے کہ اُس نے ہمیں اس جنت ارضی میں لا کر بسا دیا ہے جس کا ہر گوشہ زمین کے فطری حُسن سے بھرپور ہے۔ اور ہم ان شمالی علاقوں کے رہنے والے، سرسبز و شاداب اور خوبصورت نظاروں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے شروع میں اچانک ایری زونا کے صحرائی خطے کی نباتات کو دیکھ کر ہم تھوڑا ٹھٹھکے اور گڑبڑائے۔ دراصل بات یہ ہے کہ دُنیا میں پائی جانے والی ہر حسین چیز کی تعریف کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ دنیا میں ایک سے ایک خوبصورت اور حسین نظارہ ملتا ہے اور لوگ اُس کی تعریف کرتے ہوئے تھکتے نہیں۔ لیکن مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی... معمولی نظارے کو بھی ایک خاص زاویہ نگاہ اور انداز سے دیکھا جائے تو اُس میں بھی انفرادیت خوبصورتی اور جاذبِ نظری کے کئی پہلو اجاگر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ساؤتھ ویسٹ امریکہ کے اسی علاقے کو دیکھ کر (بادلِ نخواستہ) کچھ اچھا اچھا سوچنا شروع کیا تو واقعی سب کچھ اچھا لگنے لگا۔

ٹوسانؔ کے علاقے کینیڈا ایوینو کی ایک پہاڑی پر واقع اس خوبصورت گھر کی

نمایاں خصوصیت یہاں کا قلب ونظر کو لُبھانے والا نظارہ تھا۔ ہم رات کو پہنچے تھے۔ صبح ہوئی تو ہمیں ڈرائنگ روم کی ایک مکمل شیشے کی بنی ہوئی دیوار سے باہر کا نظارہ کرنے کیلئے کہا گیا کہ اب یہاں سے بیرونی منظر دیکھئے اور قدرت کی صناعی کی داد دیجئے۔ حدِ نظر تک کالے پہاڑوں کی اس وادی میں جھاڑ جھنکار کے علاوہ کچھ خاص نظر نہیں آیا تو پوچھا بھئی کونسا منظر؟ گھر والوں نے تھوڑا مایوسی کا اظہار کیا تو ان کا دل رکھنے کیلئے مزید غور کیا کہ شاید ہم سے غلطی ہوئی ہے، اب ذرا دھیان سے دیکھیں گے۔ سامنے کیکٹس اور اُس کے خاندان کے بے شمار باغات تاحدِّ نظر پھیلے ہوئے تھے اور اُونچی نیچی پہاڑیوں کے لینڈ سکیپ پر اسی نسل کے درخت، ایلو ویرا اور دیگر جھاڑ جھاڑیاں بمع اپنی ریتلی اور پتھریلی زمین کے ہمارے سامنے تھے۔ ہمارے تاثرات سے عاری چہرے دیکھ کر گھر والوں نے پھر کہا کہ بھئی اس علاقے کی خاص چیز یہی منظر نامہ ہی تو ہے جسے دیکھنے لوگ دُور سے آتے ہیں اور اسی وجہ سے اس علاقے میں گھر بھی مہنگے ہیں۔ ہم نے دل میں سورت رحمٰن کی مشہور آیت ''تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' پڑھی اور ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا مگر پھر مسکراتے ہوئے کہا ہاں کیوں نہیں واقعی خوبصورت ہے! بہرحال پھر اسی وسیع وعریض شیشے سے ایک نئے زاویہ نگاہ کے ساتھ باہر نظر ڈالی۔

سامنے کھلا نیلگوں آسمان اور تاحدّ نظارہ ایک منفرد قسم کا وسیع علاقہ، کالے پہاڑ، گھوڑوں کے Ranches (مویشی پال کھیت) سڑکیں، گالف کورس، سوارو کیکٹس کے انواع واقسام کے درخت، فضاؤں میں اُڑتے پھرتے خوبصورت پرندے، آسمان پر

کچھ تیرتے بادل، الغرض وسعتِ نظری کی بدولت ہمیں یہ تبدیل شدہ منظر نامہ اچھا لگنے لگا۔ آسمان کی مستقل شفاف نیلاہٹ ہم ٹورانٹو والوں کیلئے خوشکن اور استعجاب انگیز تھی۔ شام کو افق پر شفق کی جامنی، سرخ، نارنگی اور سلیٹی رنگت ایک بے حد خوبصورت نظارہ پیش کرتی۔ ہمارے بیٹے نے بتلایا کہ یہی شفاف آسمان اور صحت بخش گرم اور خشک موسم یہاں کی اہم ترین خصوصیت بلکہ سوغات ہے جس کی وجہ سے لوگ ریٹائر ہو کر یہاں آباد ہو جاتے ہیں۔

ایریزونا امریکہ کے جنوب میں میکسیکو کے اوپر ساؤتھ ویسٹ کی ایک صحرائی ریاست ہے۔ یوں تو امریکہ کا ساؤتھ ویسٹ کا سارا علاقہ ہی صحرائی خطے پر مشتمل ہے مگر اریزونا خصوصاً اب بھی Wild Wild West کا منظر پیش کرتا ہے جو کہ کاؤبوائز اور Yankees (امریکی شہریوں کی مخصوص نسل) کی خاص سرزمین ہے۔ کاؤبوائز کی فلموں میں اکثر کیکٹس اور جھاڑیاں وغیرہ نظر آتی ہیں۔ وہی جھاڑیاں اور کیکٹس یہاں کی سوغاتِ خاص ہیں۔ شجرۃ الزقوم کی ہر اعلیٰ اور ادنی قسم سے مزین یہ علاقہ اپنی ہی طرز کا باغ و بہار علاقہ ہے۔

مٹی کے بنے ہوئے گھر اور خار و مغیلاں سے سجی ریتیلی اور خشک زمین میں سے ظاہری امریکہ کو ڈھونڈنا ذرا مشکل تھا۔ مگر انہی خاردار جھاڑیوں کے اندر سے جھانک کر دیکھو تو واقعی اچھا خاصہ امریکہ نکل آتا ہے۔ یعنی وہی مالز، دوکانیں، عالیشان گھر اور عمارات۔

ٹوسان، ایریزونا سٹیٹ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ کالے پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ لالہ

صحرائی کچھ کچھ کوئٹہ، کچھ کراچی اور کچھ ربوہ کی یاد دلاتا ہے۔میکسیکو کے بارڈر سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔لہٰذا عوام کے رہن سہن اور فن تعمیر میں میکسیکو ثقافت غالب ہے۔اس علاقے میں شدید گرمی پڑتی ہے اس لئے گھروں کا میکسیکن طرزِ تعمیر ہمارے مٹی کے گھروندوں سے مماثلت رکھتا ہے۔یا یوں کہئے کہ گھروں کا ٹھنڈا تاثر دینے کیلئے گھروں کے رنگ عموماً مٹیالے ہوتے ہیں۔کئی گھروں کی چھتوں کے شہتیر دیواروں سے باہر نکلے ہوتے ہیں۔اسے سانٹافی طرزِ تعمیر کہتے ہیں۔ویسے گھروں، بازاروں اور دیگر عمارات کے باہر بنے ہوئے برآمدے بھی اپنے پاکستانی گھروں کی یاد دلاتے ہیں۔اسی طرح آبادی میں گورے امریکی اقلیت میں نظر آتے ہیں جبکہ ہمارے طرح کے رنگ اور نقوش والے میکسیکن اور ریڈ انڈین زیادہ نمایاں تھے۔

تین ثقافتی (انڈین، ہسپینک اور اینگلو) کلچر سے مزین اس شہر میں بہترین گالف کورس، آرٹ میوزیم، آرٹ گیلریز اور بہترین ریسٹورینٹس ہیں۔اس کے علاوہ اس شہر میں سونورن ڈیزرٹ کی تمام خصوصیات یعنی دو سوارو نیشنل پارک Sabino Canyon اور Sonoron Art میوزیم وغیرہ ہیں جو کہ شہری حدود میں ہونے کی وجہ سے سیاحوں کیلئے بہت پرکشش جگہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ٹوسان کا غروبِ آفتاب کا منظر منفرد ہے۔شام کو سُرخ، جامنی، کرمزی، روپہلی روشنیاں دیر تک آسمان کو روشن رکھتی ہیں۔ یہاں کا گالف کورس بہت مشہور ہے۔ کیوں نہ ہو صحرا میں سبزے کا بچھا ہوا قالین ایک دلفریب نظارہ ہے۔موسم سرما میں عموماً یہاں گالف کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔

ماضی کی ہالی وڈ کی فلموں کی ایک نمایاں خصوصیت وائلڈ ویسٹ کے کاؤبوائز کا کلچر تھا چنانچہ ٹوسان میں اسی خصوصیت کو یاد رکھنے کیلئے جگہ جگہ ایسے ہوٹل بنائے گئے ہیں جہاں پرانا کلچر ڈراموں اور گن فائٹ کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ اکثر ہوٹل ان کی بار، کھانے اور میوزک بھی فلموں والا سین پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح اس زمانے کا ایک گاؤں بھی ہم دیکھنے گئے جسے Old Dust Trail کہتے ہیں۔ وہاں پرانے زمانے کا پورا ماحول بنایا گیا تھا۔ یعنی پرانی گاڑیاں، چھکڑے، لوہار کی دوکان، اسلحے کی دوکان، شیرف (Sheriff) کا دفتر، پن چکی اور سونا چھاننے والی چھاننیاں، ایک جنرل سٹور اور ہوٹل۔ اسی طرح وہاں باقاعدہ ایک اوپن ایئر سٹیج ڈرامے کی طرز پر کاؤبوائز کی لوٹ مار اُن کی آپس کی لڑائی اور پھر پولیس مقابلہ بھی دکھایا گیا۔

ایک لحاظ سے آج کل ٹوسان اور اُس کے نواحی شہروں Tomb Stone اور بزبی Bisbe وغیرہ کی معیشت کا انحصار ان لڑائیوں اور پرانے زمانے کی Mining کی وجہ سے ہے۔ اُس زمانے میں سونا نکالنے کی وجہ سے کچھ شہر معرضِ وجود میں آئے تھے۔ اگرچہ اب یہ صنعت بند ہو چکی ہے۔ مگر سیاحوں کی آمد اب ان علاقوں کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اسی طرح ٹومب سٹون میں کاؤبوائز کی ایک مشہور لڑائی ہوئی تھی جس پر تین فلمیں بنیں۔ ان میں سے ٹومب سٹوں ایریزونا بہت مشہور ہوئی۔ اس لڑائی کے پسِ منظر میں آجکل اس شہر کی معیشت چل رہی ہے۔ کیونکہ ٹورسٹ یہ جگہ دیکھنے ضرور آتے ہیں۔ اسی

طرح کاؤبوائز بُوٹ، نیلی جینز اور بولا ٹائی وجہ افتخار سمجھی جانے کی وجہ سے عموماً ہر وقت پہنی جاتی ہے۔ رینچز میں گھوڑے ابھی بھی ثقافتی اور معاشی فائدے کیلئے پالے جاتے ہیں اور پھر بہت مہنگے داموں فروخت کئے جاتے ہیں۔ گھوڑوں کی کھیلوں کے مقابلے یہاں کا مشہور ترین سالانہ فنکشن ہے جو روڈیو کے نام سے جانا جاتا ہے۔

امریکہ میں ریڈ انڈین لوگوں کا سب سے بڑا مرکز ایریزونا میں ہے جہاں الکحل اور غربت بہت بڑا مسئلہ ہے۔ مگر اب وہاں کچھ نئے کسینو کھل گئے ہیں جہاں دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے ریٹائرڈ لوگ چھٹیاں منانے آتے ہیں اور یہاں کی معیشت کو سنبھالا دیتے ہیں۔ یہ ریٹائرڈ لوگ اب ایریزونا کی آبادی کا بڑا حصہ بنتے جارہے ہیں کیونکہ یہاں کا موسم بوڑھے لوگوں کیلئے صحت مند ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ٹھنڈے علاقوں کے رہنے والے یہاں موسم سرما گزارنے آتے ہیں۔

سبینو کینین Sabino Canyon جو ایریزونا کے مشہور گرینڈ کینین کا چھوٹا ماڈل ہے، ٹوسان کی سب سے بڑی اور مقبول سیرگاہ ہے۔ پانچ میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے اس تفریحی علاقے کے دونوں اطراف میں اُونچے پہاڑ کے درمیان ٹھنڈے پانی کی ایک ندی بہہ رہی ہے جو سات جگہ چھوٹی آبشاریں بناتی ہیں اور کسی کسی جگہ پر پانی ایک جگہ جمع ہوکر چھوٹے چھوٹے سویمنگ پول بھی بناتا ہے جو کہ ان صحرائی لوگوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ چالیس ڈگری ٹمپریچر میں یہاں آکر نہانا واقعی فرحت بخش لگتا ہے۔

ایک شٹل ان پہاڑوں کے درمیان چلتی ہے جو اس علاقے کی مکمل سیر کرواتی ہے۔

سوارو کیکٹس ایریزونا کی سوغات نمبرایک ہے۔ان پہاڑوں پراسی کیکٹس کے ایستادہ جنگل ایک انتہائی منفرد قسم کے جنگل ہیں۔یعنی بغیر بازوں کے سبز ڈنڈے ہی ڈنڈے پہاڑوں پر ہر طرف ایستادہ عجیب قسم کا تاثر دیتے ہیں۔ پہاڑوں کی چھوٹی چھوٹی غاروں میں پہاڑی شیراور دیگر جانور رہتے ہیں۔شٹل چلنے سے پہلے خبردار کردیا جاتا ہے کہ آپ لوگ اپنی ذمہ داری پراس جنگل میں داخل ہورہے ہیں۔اگر کسی جانور نے حملہ کردیا تو ہمارا ذمہ نہیں۔ ہمارے ایک جاننے والے اپنے بچوں کے ساتھ اس ندی پر نہانے کیلئے گئے تو ندی کے دوسری طرف ایک شیر (اصلی والا) چندگز کے فاصلے پر کھڑا انہیں گھوررہا تھا۔قسمت اچھی تھی کہ شیر نے صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیا ورنہ اگر چھیڑ چھاڑ کرتا تو گورنمنٹ نے بالکل شیر کا ہی ساتھ دینا تھا کیونکہ ایریزونا کو اپنے صحرائی سپوت بہت ہی پیارے ہیں۔

اریزونا کے اس علاقے کی بہت سی مخصوص چیزیں ہیں جن کو یہ صحرائی لوگ اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ ان میں سوارو کیکٹس کو بہت نمایاں حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ ساؤتھ ویسٹ علاقے کی پہچان ہے۔ یہ لحیم شحیم کیکٹس اپنی ابتداء نہایت چھوٹے ایک نقطہ نما بیج سے کرتا ہے اور پھر بہت سست الوجودی سے اپنی اُٹھان اُٹھتا ہے۔یعنی اُسے چندفٹ بلند ہونے اور اپنے پہلے پھول نکالنے کیلئے صرف 30 سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔اس کے پہلے بازو کو نکلنے کیلئے 75 سال کا عرصہ چاہئے اب جس کیکٹس کے تین چار بازو ہوں اُس کی عمر کا اندازہ آپ آسانی سے کرسکتے ہیں۔سب سے بڑے کیکٹس کے آدھی درجن تک بازو اور وزن آٹھ ٹن اور قد 50 فٹ تک ہوسکتا

ہے اور عمر ماشااللہ دو صدیوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ چونکہ یہ علاقے کی پہچان ہے اسی لئے اس کی بے حد اہمیت ہے۔اس کو محفوظ رکھنے کیلئے دو بڑے سوار و نیشنل پارک ٹوسان کے ایسٹ اور ویسٹ میں بنائے گئے ہیں اور ایک کیکٹس میوزیم بھی ہے۔ویسے بھی اس کو جڑ سے اکھیڑنا یا ختم کرنا ایریزونا میں غیر قانونی ہے کیونکہ یہ یہاں کے Echo System کا بہت اہم جز ہے۔کسی بھی گھر یا سڑک کو بنانا ہو تو ان ''بزرگ حضرات'' کو ہاتھ لگانے سے پہلے باقاعدہ گورنمنٹ سے اجازت لینی پڑتی ہے۔

بڑے کیکٹس بہت سے پرندوں کو اپنے اندر گھونسلے بنا کر رہنے کی اجازت دیتے ہیں جبکہ کچھ پرندے اس کے جوس کو بطور غذا استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے گھر کی سامنے والی پہاڑی پر تین بازوؤں والے دو کیکٹس کھڑے ہوتے تھے۔ہم ہر روز صبح اُٹھ کر ان بزرگوں کو پرنام کرتے کہ بازوؤں کے حساب سے تو تین سو سال قدیمی ہیں لٰہذا پرنام واجب بنتا ہے۔

یہاں کی دوسری بڑی خصوصیت یہاں کا ریٹل سانپ ہے۔ڈائمنڈ ریٹل سانپ سب سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔اس کی دُم ایک خاص قسم کی سخت جلد سے بنی ہوتی ہے جسے وہ حملہ کرتے وقت ہلا کر شور مچاتا ہے جس کی وجہ اُسے Rattle کا نام دیا گیا ہے۔اس سانپ کو بھی مارنے اور نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں سوائے اس کے کہ یہ آپکو کاٹ لے!!! اگر آپ کو نظر آئے تو فوراً محکمہ 911 کو کال کریں وہ خود اسے اُٹھا کر جنگل میں پھینک دے گا۔

اس سانپ کو بھی قابل فخر گردانا جاتا ہے اور ٹوسان ڈاؤن ٹاؤن میں ایک اوور ہیڈ

برج اس کی شکل پر بنایا گیا ہے۔ اس کے بڑے سے منہ میں (ہمت کر کے) گھس جایئے اور دم کی طرف سے باہر نکل آیئے۔ عمومی طور پر یہ سانپ برج کافی ڈراؤنا سا منظر پیش کرتا ہے کہ ایک بڑا سانپ ہوا میں معلق ہے اور اندر لوگ آ جا رہے ہوں۔ اس کے علاوہ بھی تمام زہریلے جانور از قسم ٹرینٹولا مکڑی، بچھو اور جیلا مونسٹر وغیرہ بھی ان کے بہت پیارے سپوت ہیں۔

ہمیں یہاں کی وائلڈ لائف میں سب سے زیادہ یہاں کے پرندے پسند آئے۔ پرندوں کی بہت خوبصورت قسمیں اِدھر اُدھر اڑتی نظر آتی تھیں۔ مثلاً ہمارے گھر کے سامنے عقابوں کے نشیمن تھے اور اکثر اُڑتے نظر آتے تھے جبکہ بٹیر، ووڈ پیکر، سرخ کارڈینل، ہمنگ برڈ اور دیگر خوبصورت اور نایاب پرندے گھر کے آس پاس چلتے اور اُڑتے رہتے۔ ہمنگ برڈ تو ہر وقت ہمارے لان کے پھولوں سے چمٹی ہوئی ایک نہایت خوبصورت نظارہ پیش کرتی تھی۔

ٹوسان میں جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ وہاں کی احمدیہ جماعت ہے۔ بلکہ اس مضمون کو لکھنے کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ دُنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دین و دنیا کی خدمت کیلئے ہر طرح پیش پیش رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر احمد بریلوی صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے یہاں آ کر احمدیہ جماعت کی تشکیل دی۔ انہوں نے احمدیہ مسجد بنائی اور اس کے آس پاس اپنی فیملی کے افراد کو سپانسر کر کے آباد کیا۔ آجکل یہاں ان کی بنائی ہوئی دو جڑواں مساجد اور ان کے ساتھ تین عدد گھر جماعت کیلئے وقف ہیں۔ مساجد میں تنظیموں کے دفاتر بھی قائم ہیں۔

کینیڈا کے پیس ویلیج کی طرح ٹوسان میں بھی ایک چھوٹا سا پیس ویلیج آباد ہے۔ یعنی مسجد کے آس پاس اپنے گھر اور اپنی طرز کا ماحول ہے۔ ہم لوگ وہاں جمعہ پڑھنے گئے تو عورتیں جلد ہی نماز پڑھ کر چلی گئیں۔ اس پر تعجب ہوا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ سب لوگ آس پاس ہی رہتے ہیں اور اکثر نمازیں یہاں ہی پڑھتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں اس طرح ایک جگہ اکٹھے ہو کر رہنا ایک نعمت سے کم نہیں۔ ویسے بھی ایریزونا کی آب و ہوا اور علاقہ ربوہ سے مماثلت رکھتا ہے اس طرح یہ جگہ بھی ایک طرح سے ربوہ کی یاد دلاتی ہے۔

وہاں پر ایک امریکن سفید فام خاتون نصرت صاحبہ سے ملاقات ہوئی جنہوں نے خود احمدیت قبول کی تھی۔ انہوں نے دہلی انڈیا سے ایم اے ہندی کیا ہوا تھا۔ لہٰذا نہایت شستہ اُردو میں گفتگو کرتی تھیں مگر اُردو لکھ اور پڑھ نہیں سکتی تھیں۔ نہایت مخلص احمدی خاتون ہیں جو عموماً جماعت میں سائق کے فرائض انجام دیتی ہیں اور انتہائی شستہ اُردو میں جماعی کی سرگرمیوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ باقی احباب جماعت بھی بہت مخلص اور جماعت کو وقت دینے والے افراد ہیں اور نہایت تن دہی سے خدمتِ دین میں مصروف ہیں۔

شمع احمدیت کے پروانوں سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں اور زمین کے کناروں پر امام کامگار کا پیغام پھیلا ہوا ہے۔ دُنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں ضرور اپنے احمدی احباب سے ملاقات ہو جاتی ہے اور تنہائی اور دوری کا احساس کافور ہو جاتا ہے۔ الحمدللہ۔

اس موقع پر پاکستان میں بسنے والے احمدیوں کے حالات وواقعات اور حاسدین

احمدیت کی طرف سے پہنچائی جانے والی ایذاء رسانیوں کو سن سن کر اور ایریزونا کی جماعت دیکھ کر نہ جانے کیوں ہونٹوں پر صابر ظفرؔ کا یہ شعر آیا ہے ۔

حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہلِ عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں

○○

سفرِ گریہ

خورشید مثال شخص کل شام
مٹی کے سپرد کردیا ہے
اندر بھی اس زمیں کے روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

19/اپریل2003ء کی غمگین صبح کا آغاز صبح ساڑھے سات بجے مشن ہاؤس کے ایک فون سے ہوا۔ جس میں کسی نے چیخوں اور سسکیوں کے درمیان بمشکل تمام یہ بتایا کہ ہمارے پیارے آقا سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع ؒ یعنی کہ ہمارے پیارے حضور وفات پا گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اچانک صدمے اور اس عظیم غم کی خبر نے حواس پر بجلی سی گرا دی اور بے ساختہ منہ سے نہیں... نہیں! یہ نہیں ہوسکتا کہ الفاظ نکلے۔ میرے والدین تھوڑا عرصہ پہلے ہی فوت ہوئے تھے مگر مجھے ان کی وفات نے اتنا غم نہیں دیا جتنا کہ حضور کی وفات کی خبر نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ بے اختیار گیلری میں چکر کاٹنے لگی کہ ہائے حضور چلے گئے۔ یہ کیسے ہوگیا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ یہی خبر ہم نے اپنی بیٹی سعدیہ کو بتائی تو وہ کہنے لگی اچھا آج صبح ہی تو میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضور کہہ رہے ہیں کہ میں نے نسیم مہدی صاحب کو

فون کیا ہے کہ کرنل صاحب کو میرا سلام دیں۔

دو پہر کو میرے میاں کا مشن ہاؤس سے فون آیا کہ سعدیہ کی خواب پوری ہوئی۔ مجھے لندن سے تبشیر والوں کا فون آیا ہے کہ آپ کو انتخاب کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا ہے اور آپ فوراً لنڈن پہنچ جائیں اور جنازہ اور انتخاب میں حصہ لیں۔ چنانچہ وہ تو پہلی ملنے والی فلائٹ سے لندن چلے گئے اور ہم اگلے دن اس غم کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کچھ اسطرح کی خوابیں مجھے بھی کچھ دنوں سے مسلسل آ رہی تھیں کہ ہم بہت بڑے غم سے دو چار ہونے والے ہیں اور سب ایک جگہ اس غم کیلئے اکٹھے ہوں گے۔ چنانچہ 30 ہزار غم نصیبوں کے قافلے اس عظیم الشان شخصیت کا الوداعی دیدار کرنے اور رخصت کرنے کیلئے بے اختیار دنیا کے کونے کونے سے آن جمع ہوئے اور ترستی آنکھوں اور رنجیدہ وحزیں دلوں کے ساتھ بے بسی سے اپنے آقا کو الوداع کہنے کی تیاری کرنے لگے۔

اگرچہ حضورؒ نے منزل بہ منزل اپنے سفرِ آخرت کا انتظام ہم سب کیلئے ایم ٹی اے کی تشکیل کے ذریعہ پہلے ہی کر دیا تھا اور اس دوران حضور کا کلام پڑھا جاتا رہا وہ بھی گویا حضورؒ اسی دن کی خاطر ہی تیار کروا کر گئے تھے۔ ایک ایک لفظ اُن نظموں کا یوں حسبِ حال تھا کہ ہر دل پر کچوکے لگ رہے تھے۔ اُس وقت لاکھوں لوگ ایم ٹی اے پر اس اہم ترین واقعہ کی تمام تفصیل اور جزئیات کے ساتھ گویا خود اس میں شامل تھے لیکن یہاں تو میں صرف اپنی روداد سفر بیان کرنے لگی ہوں جو ہم نے ان کو الوداع کہنے کیلئے اختیار کیا۔

لندن پہنچنے پر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے کے بعد ہر ایک کی فوری خواہش یہی تھی

کہ حضور کا دیدار ہو۔ عورتوں اور مردوں کیلئے زیارت کے علیحدہ علیحدہ اوقات مقرر تھے۔ خواتین کیلئے مسجد فضل اور محمود ہال کے درمیان پردہ لگا کر علیحدہ انتظام تھا۔ محمود ہال کے ساتھ والے چبوترے پر عورتوں کیلئے مارکی لگا دی گئی تھی۔ جہاں ایم ٹی اے کی سروس جاری تھی۔ سامنے سڑک پر مردوں کا جم غفیر کونے کونے سے آیا ہوا اپنے پیارے آقا کی آخری ملاقات کیلئے اکٹھا رہتا۔ باری باری تمام لوگ حضور کا دیدار کرنے آتے اور غم کی شدت کے ساتھ باہر چلے جاتے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ جتنا بھی ہو سکے یہ مقدس وجود بار بار دیکھ لیا جائے۔

حضورؒ کے گھر جانے کی بہت خواہش تھی جو اُن کی زندگی میں تو پوری نہ ہو سکی مگر ان کی وفات پر خواتین مبارکہ سے تعزیت کیلئے اُوپر جانا ہوا تو حضور کا گھر دیکھنے کا موقع ملا۔ تمام خواتین غم کے مجسمے بنی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ حضورؒ کی چاروں بیٹیاں صبر و ضبط کا پیکر بنی سب کو مل رہی تھیں اور تعزیت لے رہی تھیں۔ بی بی شوکت اور بی بی فائزہ کا کردار ان میں نمایاں تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً لوگوں کے ساتھ حضور کی باتیں کرتیں۔ خصوصاً نیچے مارکی میں جا کر سب سے مائیک پر بات کرتیں اور غم میں شریک ہوتیں۔

بزرگ خواتین میں بی بی باچھی صاحبہ، بی بی قیوم صاحبہ، بی بی باری صاحبہ اور بی بی جمیل صاحبہ نمایاں تھیں۔ سب سے فرداً فرداً گلے مل کر کچھ دیر کیلئے وہاں بیٹھ گئے اور پھر ان سب کے ساتھ ہی محمود ہال کی سیڑھیوں سے جہاں سے حضورؒ اُتر کر مسجد فضل خطبہ دینے جاتے تھے، آ کر محمود ہال میں حضورؒ کے چہرہ مبارک کی زیارت کی۔ وہ فیض کا شجرِ سایہ دار، وہ حسین و دلربا وجود جس کی باتیں میٹھا دریا تھیں، خاموشی سے آرام کر رہا تھا

جبکہ تمام عمر اُس نے آرام کے لفظ کو اپنی زندگی سے نکال رکھا تھا۔ وہ دل جو کہ سراپا شفقت والفت تھا اُس وقت تھم چکا تھا اور لوگ محبت وعقیدت کے ساتھ آخری زیارت کر رہے تھے۔ چہرہ کھلتے گلاب کی طرح خوبصورت اور مسکراہٹ لیئے ہوئے تھا۔

منگل کی دوپہر جب سب خواتین نے آخری بار زیارت کر لی تو پھر بعد میں حضورؒ کے سارے افرادِ خاندان کے ساتھ ویڈیو اور تصاویر ہوئیں اور اُس کے بعد صرف بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ۔ اُس کے بعد یہ احمدیت کا درخشاں آفتاب دوسرے تابوت میں منتقل ہو کر ہمیشہ کیلئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے سینے سے انساں نکلتا ہے

ظہر وعصر کی نمازیں امام صاحب نے پڑھائیں جو کہ حضور کے گھر میں ہی ادا کیں۔ کھانا بھی حضور کے ڈرائنگ روم میں ہی کھایا۔ وہاں پر حضور کی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ بہت خوبصورت تصویر رکھی تھی جو اس کمرے میں ہی لی گئی تھی۔ حضور بیگم صاحبہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔ دونوں ہی مسکراتے ہوئے چاند سورج کی جوڑی لگ رہے تھے۔ اُدھر کچن میں فائزہ بی بی بہت سی خواتین کو حضور کی شگفتگی باتیں سنا رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ حضور کے ٹی وی روم میں حضور صوفہ کی جس مخصوص کرسی پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرتے تھے، بی بی جمیل تشریف فرما تھیں۔ میں کافی دیر اس صوفہ کی پشت پر ہاتھ رکھے حضورؒ کی یاد میں گم رہی۔ ساتھ ہی حضورؒ کا کمرہ تھا جس میں وفات ہوئی۔ اُس وقت وہ بند تھا۔ اس گھر میں ہر

طرف ان کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

حضور کی ایک بہت بڑے فریم میں دیوار پر لگی ان کی جوانی کی ایک تصویر ہمیشہ اُن یادوں کے ساتھ میرے دل پر نقش رہے گی۔ جس میں آپ گھوڑے پر سوار رائیڈنگ کیلئے تیار کھڑے ہیں اور نیچے تصویر پر ہی آپ کا ایک فقرہ لکھا تھا:

Faiza, In the memory of those days which are galloped away.

اس کے بعد انتخاب کا اہم مرحلہ تھا۔ انتخاب کیلئے سرِ شام ہی محمود ہال اور مسجد فضل کے گرد (سیکورٹی) انتہائی سخت کر دی گئی۔ خدام ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بالکل فولادی دیوار بنے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ اور اس کے بعد اِدھر اُدھر آنا جانا بالکل ناممکن ہو گیا۔ خواتین مارکی کے علاوہ جہاں جہاں جگہ ملتی بیٹھتی گئیں حتیٰ کہ تمام صحن کے بعد گیٹ

کے ساتھ سڑک پر بھی عورتیں بمع بچگان بیٹھ گئیں۔ مرد بھی باہر سڑک پر کھڑے تھے۔

شام کے بعد فضا میں خنکی بہت بڑھ گئی۔ خلافت کا انتخاب رات 9 بجے سے گیارہ بجکر 40 منٹ تک جاری رہا۔ تمام ممبران نے حلف کے بعد چوہدری حمید اللہ صاحب کی صدارت میں انتخاب میں حصہ لیا۔ یہ دو گھنٹے پوری جماعت کیلئے قیامت کے تھے۔ ایک طرف محبوب ترین خلیفہ کا جسدِ خاکی موجود تھا اور دوسری طرف نئے خلیفہ کے انتخاب کا نازک اور اہم ترین مرحلہ۔ اس وقت کا عالم دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شدید سردی میں زمین پر اور سڑک پر بیٹھی ہوئی خواتین، باہر تمام احباب خاموشی سے کھڑے مصروفِ دُعا، اندر مارکی میں خواتین کا نظم وضبط دیکھنے کے قابل تھا۔ کوئی چپ کروانے والا نہیں مگر Pindrop Silence تھا۔ حتیٰ کہ بچے بھی خاموش تھے۔ کسی بچے کے رونے یا بولنے تک کی آواز نہیں آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس وقت خدا تعالیٰ اور اُس کے فرشتے بھی یہ عجیب نظارہ دیکھ رہے ہیں اور اس میں شامل ہیں۔ ایک الٰہی تصرف تھا جو اس وقت تمام مجمع کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ سب کے سب مصروفِ دعا تھے اور غمگین دلوں کے ساتھ جماعت کی بہتری اور خیر خواہی کے لئے گریہ کناں تھے۔ غم فکر اور Suspence ٹھنڈ اور انتظار۔ ایک ایک لمحہ انتخاب خلیفہ کا تمام جماعت کے لئے ایک خاص ہی وقت تھا جس میں سبھی کے دلوں کی حالت وکیفیت نقطۂ اضطرار تک پہنچی ہوئی تھی۔

اُس وقت میری اضطراری دعاؤں نے مجھے ایک خوشکن نظارہ دکھایا۔ میں نے دیکھا کہ دو بہت بڑے مارکی نما خیمے ایک سڑک کے دائیں اور بائیں لگے ہوئے ہیں اور

درمیانی راستہ سے سفید کپڑوں میں ملبوس گھوڑے پر ایک شاہسوار جماعت کا سفید اور سیاہ دھاری والا جھنڈا اُٹھائے آ رہا ہے۔ساتھ ہی آواز آئی صلاح الدین ایوبی،اس پر مجھے بہت اطمینان ہو گیا کہ کوئی اسلام کا شہسوار آ رہا ہے۔

آخر کار مائیک میں جنبش ہوئی اور امام صاحب نے حضرت مرزا مسرور احمد صاحب کا نام نئے خلیفہ کیلئے منتخب ہونے کا اعلان کیا۔سب دلوں میں خوشی اور اطمینان اور سکینت کی ہر دوڑ گئی۔غم یکدم خوشی میں بدل گیا اور قرآن کریم کی آیت کے مطابق خدا تعالیٰ نے خوف اور فکر کی جگہ اطمینان عطا فرمایا۔الحمدللہ! جماعت کا نظم وضبط دیکھنے کے قابل تھا۔اندر حضور نے بیٹھنے کیلئے کہا تو باہر تمام لوگ جہاں جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔اس سے بہتر اطاعت کا نظارہ کیا ہوگا۔

اس کے بعد تمام لوگ گویا ایک بڑا بوجھ ہٹ جانے پر ہلکے پھلکے راضی برضا ہوتے گھروں کو چلے۔ہم رات 2 بجے گھر آئے اور دیر تک انتخاب اور حضور کی زندگی کے بارے میں باتیں اور اس واقعے اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کے تقرر کے بارے میں خوابیں لوگوں سے سنتے اور سناتے رہے۔

اگلے دن یعنی بدھ کو صبح گیارہ بجے ہم گھر سے اسلام آباد کیلئے روانہ ہوئے۔جنازہ کا وقت دو بجے دوپہر تھا۔خیال تھا کہ پہنچ جائیں گے مگر ٹلفورڈ میں دو میل لمبی کاروں کی قطار لگی تھی اور انچ انچ کرکے ٹریفک آگے بڑھ رہی تھی۔ایک بجے کے قریب دلوں میں بے چینی ہونے لگی۔کچھ دیر اس طرح گزری۔اتنے میں باہر دیکھا تو لوگ بے قرار و بے اختیار ہو کر کاروں سے نکل کر پیدل ہی سڑک پر چلنے لگے۔اگرچہ اس وقت کافی

فاصلہ باقی تھا مگر نماز جنازہ سے محروم رہنے کی پریشانی میں لوگ دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ وہ بھی ایک نظارہ تھا۔ ایک والہانہ نظارہ جو کہ حضور خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کیلئے لوگوں کے بے پناہ پیار کا اظہار تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون جو چلتے چلتے تھک چکی تھیں مگر ہنوز دور دور تک اسلام آباد کا پتہ نہ تھا۔ اُنہیں ہم نے رُک کر بٹھا لیا کہ آپ کچھ دیر آرام کریں مگر جونہی انہیں اسلام آباد کی سڑک نظر آئی وہ فوراً اُتر گئیں۔ ہماری کار کو پارکنگ کیلئے مزید آگے بھیج دیا گیا جو کہ بہت ہی ناگوار گزرا مگر کیا کرتے۔ آخر ہم سب نے ہمت کی اور گرتے پڑتے اس شہر غمزدہ کی طرف چل نکلے۔ خدا کا شکر ہے کہ نماز جنازہ کا وقت بڑھا دیا گیا تھا اس طرح سب لوگ اس میں شریک ہو گئے۔

عورتوں کی مارکی اس قدر لبالب بھری تھی کہ کھڑا ہونے کیلئے بھی جگہ نہ تھی۔ چنانچہ باہر کپڑے بچھا کر نماز اور عالمی بیعت میں شرکت کی۔ دعا کے وقت بے حد شور و گریہ بپا تھا۔ لوگوں کا ہجوم ہر طرف جمع تھا۔ جلسہ سالانہ سے کہیں زیادہ لوگ تھے۔ ہمارے بالکل سامنے تھوڑے سے فاصلے پر ایم ٹی اے کا کیمرہ بہت بلند ٹاور پر پل پل کا نظارہ تمام دنیا کو دکھا رہا تھا مگر ہم بالکل قریب ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ صرف حضور کے تابوت کی اوپر کی جھلک ہم نے دیکھی، جب تدفین کے لئے لے جارہے تھے مگر تدفین کہاں ہورہی ہے یہ ہمیں معلوم نہ تھا کیونکہ سامنے انسانی دیواروں کی کئی لائنیں لگی تھیں بلکہ ایک لطیفہ سا ہو گیا کہ میں اور خالدہ وقار کینیڈا کی جماعت کی ملاقات کے بعد باہر نکلے تو سوچا حضور کی قبر مبارک دیکھتے جائیں کہ پھر کبھی آنا ہو نہ ہو۔ چنانچہ ہم کافی چکر کاٹ کر دور تک پھرتے رہے مگر کچھ بھی ایسے آثار نظر نہ آئے۔ آخر

ایک خادم سے پوچھا کہ حضور کی قبر کہاں ہے پلیز ہمیں وہاں لے چلو۔ وہ ہمیں کافی دیر کے بعد عین اُس جگہ لے آیا جہاں ہم بوقت تدفین چند گز کے فاصلے پر کھڑے تھے ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔

بعد میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے کینیڈا اور امریکہ کی جماعتوں سے یکے بعد دیگرے ملاقات کی۔ حضور کچھ دیر کیلئے آئے سب سے دعا سلام اور دعا کیلئے کہہ کر بی بی جمیل سے ملے اور چلے گئے۔ اس طرح ہم نے نئے حضور سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا اور اسلام آباد کے وسیع مرغزاروں اور اُداس فضاؤں کو الوداع کہا۔ باقی دن تو حضور کی باتوں، مختلف خوابوں اور مختلف ذاتی واقعات کو سنتے سناتے اور یاد کرتے ہوئے گزر گئے۔ مگر یہ حضور تو زندہ جاوید ہیں۔ ایم ٹی اے کی بدولت بھی اور اپنے کارہائے نمایاں کیلئے بھی۔ وہ کیسے بھول سکتے ہیں۔

حق وحکمت کے خزائن لُٹانے والے، علم وعرفان کے موتی بکھیرنے والے اس جلیل القدر انسان اور عظیم الشان خلیفہ کی ذات ان تمام صفات کی حامل تھی، جن کا ایک مجذوب نے حضرت جنید بغدادی کی وفات پر ان اشعار میں اظہار کیا تھا۔

ترجمہ: ''ہائے افسوس ان لوگوں کی جدائی پر جو دنیا کیلئے سورج کا کام دیتے تھے اور قلعوں کا رنگ رکھتے تھے۔ اور ان کی وجہ سے دنیا کو عذابوں اور مصیبتوں سے نجات ملتی تھی۔ اور وہ شہر تھے جس سے دنیا آباد تھی۔ وہ بادل تھے جو سوکھی کھیتوں کو سرسبز کر دیتے تھے۔ وہ پہاڑ تھے جن سے دنیا کو استحکام تھا۔ وہ تمام بھلائیوں کے جامع تھے اور دنیا اُن سے امن اور سکون

حاصل کرتی تھی۔

ہمارے لئے زمانہ تبدیل نہیں ہوا اور دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں نے ہمیں گھبراہٹ میں نہ ڈالا۔مگر جب وہ فوت ہو گئے تو ہمارے سکھ تکلیفیں بن گئے اور ہمارے آرام دُکھ بن گئے۔پس اب ہمیں کسی پانی کی ضرورت نہیں کہ ہماری آنکھوں سے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔''

اور اب جبکہ ہم ایم ٹی اے پر موجود خلیفہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے خطبات اور دیگر تربیتی امور کا فیضان حاصل کرتے ہیں تو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کا جاری کردہ روحانی چشمہ ایم ٹی اے ہمیں پیاسا نہیں ہونے دیتا اور آپ کی تقاریر اور مجالس عرفان ہمیں اُن کی یاد بھولنے نہیں دیتی۔

بلھے شاہ اسی مرنا ناہیں، گور پیا رکوئی ہور

19/اپریل 2003ء کو ہمارے پیارے امام حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے اچانک انتقال نے تمام جماعت احمدیہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔آپ کا دور تاریخِ احمدیت کا ایک ایسا درخشندہ و تابندہ دور ہے جس میں جماعتِ احمدیہ صحیح معنوں میں عالمگیر جماعت بنی۔ایم ٹی اے کی بدولت احمدیت کا پیغام دنیا کے کناروں تک پہنچا اور اعلائے کلمۃ اللہ کا چرچا ہوا۔

حضور کی بیماری کا علم ہونے کے باوجود اُن کی اچانک رحلت تمام جماعت کی زندگیوں میں کچھ ایسا غم کا طوفان بپا کر گئی ہے کہ جو سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ہر فردِ جماعت کو

یہ مقدس وجود اپنی ذات اپنے عزیز واقارب سے بڑھ کر پیارا تھا۔ ایم ٹی اے کی بدولت آپ ہر گھر کے افرادِ خاندان کا حصہ تھے اور سب کی آنکھ کا تارا تھے۔آپ کے روحانی وجود کی کشش بے اختیار سب کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں آپ کی رہنمائی ہمیشہ سب کے لئے باعثِ تقویتِ ایمان بنتی تھی اور قلبی ایمان سکون کا باعث بنتی تھی زندگی میں جب بھی بُرے حالات ہوتے آپ کو ایک خط لکھ کر ہم سے آزاد ہو جاتے۔ ہماری خوشی ان کی خوشی اور ہمارا غم اُن کا غم تھا۔اچانک اسی قیمتی سائے کے یوں اُٹھ جانے پر پوری احمدیت ہی اپنے آپ کو یتیم تصور کرنے لگی اور کچھ دیر کیلئے تو حضرت عمرؓ کی جو کیفیت رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کی خبر پر ہوئی ویسے ہی محسوس ہونے لگی کہ نہیں حضور نہیں جا سکتے۔نہیں ہرگز نہیں مگر پھر یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ نہیں واقعی ایسا ہو چکا ہے۔

ہمارے دل غم سے حزیں اور آنکھیں اشکبار تھے۔اُن کی چاروں غمزدہ بیٹیوں کے ساتھ پوری احمدیہ جماعت بھی ان کی جدائی پر اسی طرح گریہ کناں تھی۔ دنیا کے سب کام یونہی رواں دواں رہیں گے مگر حضور تو واپس نہیں مل سکتے ۔ یہ تصور ہی مارے ڈالتا تھا۔ حضور کی محبت ہر فردِ جماعت کے دل میں اسقدر مضبوطی سے پیوست ہے کہ اس کی شدت کبھی بھی ختم نہ ہو سکے گی۔

اے خدا کے پیارے بندے اور جلیل القدر خلیفہ آپ پر ہزاروں ہزار رحمتیں اور سلام ہو۔اے گلشنِ احمد کے گلِ رعنا۔ہم سب گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے وہ چمکتا ہوا چمن چھوڑا ہے جس کی خوشبو چاردانگ عالم میں پھیل چکی ہے اور ہم سب گواہی دیتے

ہیں کہ بے شک آپ نے حضرت مسیح الزمانؑ کے مشن کو جس عظیم الشان طریقے پر آگے بڑھایا اور پھیلایا ہے، اس کیلئے بے شک آپ اپنی خواہش کے مطابق راضیۃً مرضیۃً کے مقام پر فائز ہوئے ہوں گے اور یقیناً فرشتوں نے آپ کو وقتِ رخصت ادخلی فی عبادی و ادخلی فی جنتی کی بشارت دی ہوگی۔

تیرا وصال، تیرا وصلِ یار ہے جاناں
وگر نہ وقتِ وداع یوں مسکرایا نہیں کرتے

○○

متفرق مضامین

شغل صوتِ سرمدی

(ہمیشہ قائم رہنے والی آواز کا شغل)

یہ مضمون سیرت النبیؐ کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔
ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت ﷺ کا وجودِ باوجود ایسا شجر طیبہ ہے کہ اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور جڑیں انسانی فطرت میں پیوست ہیں۔ آپؐ کی سیرت نوروں کا ایسا مجموعہ ہے کہ اس میں سے رنگارنگ شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ ایک ایسا سدا بہار درخت ہے جو ہر موسم میں، ہر زمانہ میں اپنے رب کے اذن سے پھل دیتا ہے۔ آپؐ کی ہستی وہ کامل ہستی ہے جو کسی کو مایوس نہیں کرتی۔ مبارک وہ جو اس چاند سورج کو اپنے سینے میں اُتار لے اور دل میں بسا لے۔ آج سیرت النبیؐ کا مبارک جلسہ ہے۔ آج کا ماحول اتنا روح پرور ہے کہ ہر دل سے درود شریف کے نغمے پھوٹتے ہیں۔ اتنے پُرتقدس ماحول میں اگر اس موضوع سے ہٹ کر زرا بھی بات کی جائے تو اس کے تقدس کو خراب کرنے والی بات ہے۔ لیکن میں آج ایک نئے زاویے سے مدح رسولؐ کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی ڈرتے ڈرتے جسارت کر رہی ہوں۔ جو شروع میں آپ کو عجیب سا تأثر دے گی مگر آخر میں وہ میری زندگی کو سنوارنے کی بہترین چیز ثابت ہوئی۔ یہ میری اپنی زندگی کی سٹوری ہے جو میں آپ سے شیئر کرنے لگی ہوں۔

مجھے اپنا بچپن ایک ہنستی گاتی بلبل کے طور پر یاد ہے۔ چلتے پھرتے گنگنانا میری عادت تھی اور اُونچی تانیں اُڑانا میرا شغل، موسیقی جیسے میرے رگ و پے میں بھری تھی۔

جو بات بھی کرنی ہے وہ سُر میں کرنی۔ سبق بھی لے اور سُر میں زیادہ اچھا یاد ہوتا تھا اور پہاڑے تو اس زمانے میں سب ہی اُونچے سُروں میں یاد کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ آزادی شائد چوتھی یا پانچویں جماعت تک ہی رہی ہوگی۔ دراصل وہ زمانے اور تھے اُن وقتوں میں ایسی آزادیاں فضولیات میں شمار کی جاتی تھیں۔ لہٰذا جب شعور ذرا پختہ ہونے لگا تو معلوم ہوا کہ ہم تو نہایت فضول شوق میں مبتلا ہیں اور ہمیں اُس سے فوراً تائب ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ ہم بظاہر تائب سے ہو گئے۔ اس زمانے میں ابا جان کے گھر میں گھریلو ملازمین کی ریل پیل رہتی تھی اور اُن کے سامنے اب بڑی باجی کا رول بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ ایک تو ہمارے ساتھ یہ زیادتی ہمیشہ ہوتی رہی کہ شروع سے ہی بڑے عہدوں پر ترقی بہت جلد اور زبردستی دے دی جاتی تھی۔ ہم شروع سے ہی بڑی باجی تھے۔ پندرہ سال کے ہوئے تو بڑی بہو بن گئے۔ خیر ادھر سے کوئی اُونچی آواز نکالنی تو اُدھر سے شاہ محمد ماشکی برآمد، ادھر کوئی تان اُڑائی تو اُدھر سے کوئی اور نوکر نمودار ہو جانا اور ہمارے منہ کا سوئچ آف شعر و شاعری شروع سے ہی اچھی لگتی تھی۔ اب کوئی نظم کوئی غزل اچھی لگے تو اُسے گنگنائے میں کوئی قباحت تو نہ تھی۔ مگر جونہی موڈ بنتا۔ گھر والوں کی گُھرکیاں سُننی پڑتیں۔ جب آٹھویں جماعت سے ہمیں اپنا کمرہ الگ مل گیا تو ہم نے دل کے ارمان کافی پورے کر لئے مگر پھر بھی ایک طرح کی دہشت ہمارے سر پر ہمیشہ سوار رہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ آناً فاناً ہم شادی شدہ ہو گئے اور ایک فوجی کے گھر آن وارد ہوئے۔ ابا جان کے گھر میں نوکروں کی افراط تھی۔ یہاں کچھ کمی تھی لہٰذا ہمیں حالات کچھ بہتر لگے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد محسوس ہوا کہ یہاں تو ہم اب مزید اعلیٰ عہدے پر پرموٹ

ہو گئے ہیں اور اب تو ہمیں با قاعدہ بیگم صاحبہ کا رول ادا کرنا ہے۔اور اس سلسلے میں ہمیں خاصا محتاط ہونا ہوگا۔

تو صاحب ہم خاصے محتاط تھے۔مگر ایک دن صبح نو دس بجے جب ہم اپنے گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر بیٹھے تو نہ جانے کس وقت غالب کی ایک غزل ہمارے ہونٹوں پر مچلنے لگی:

''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا''

ہم عالمِ وجد میں خوب لہک رہے تھے اور اُونچی آواز میں گا نا گا رہے تھے اور ابھی شاید غزل ختم ہی کی تھی کہ ہمارے فوجی اردلی نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے دروازے میں سے جھانکی لگائی اور پوچھا:

''بیگم صاحب کیا سودا لانا ہے۔''

کچھ نہ پوچھیئے وہ لمحہ!! ہمیں کس قدر خفت ہوئی۔ہم بتا نہیں سکتے۔جلدی سے اُسے کچھ بتا کر وہاں سے دفعان کیا اور پھر اپنے اوپر ہزار لعنت بھیجی اور اس ''شغلِ خبیث'' سے ہمیشہ کیلئے توبہ کرنے کا عہد دل میں کیا۔خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد یہ وعدہ نبھا یا بھی۔(گویا توبۃ النصوح کی)

اب میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ زمانے کس قدر سادہ تھے۔گھروں کے ماحول اسقدر پاکیزہ اور رکھ رکھاؤ والے ہوا کرتے تھے کہ ان میں اس قسم کی تمام باتیں لغویات میں شمار کی جاتی تھیں۔گھروں میں ریڈیو کا وجود امرِ مکروہ تھا۔عام گھریلو ناول افسانے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔گانا بجانا خود تو کیا سننا بھی معیوب تھا۔مجھے یاد ہے کہ

ریڈیو ایران زاہدان کے گانے رات کو اسقدر میٹھے اور رسیلے لگتے تھے۔مگر سننا منع تھے۔ اب ہمارے دیکھتے دیکھتے دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔اور زمانہ درمیانی چال چلتے چلتے یکا یک قیامت کی چال چلنے لگا ہے۔اب نئی نسل تو یقیناً یہ تمام تمہید پڑھ کر ہی مسکرا رہی ہو گی۔

اسوقت پر میرا یہ شوق کوئی اتنا برا تو نہیں تھا مگر اتنا پسندیدہ بھی نہیں تھا۔اگرچہ میں نے دبا تو دیا مگر فطرت کہاں بدلتی ہے۔میری اکثر عادات اپنے والد مرحوم و مغفور پر ہیں۔ابا جان نہایت اعلیٰ شعری ذوق رکھتے تھے اور اُنہیں کام کرتے ہوئے گنگنانے کی بھی بہت عادت تھی۔کوئی بھی توجہ کا کام کرنا ہوتا تو کوئی اچھا سا شعر اُن کی زبان کی ٹیپ پر چڑھ جاتا اور اُس کو بار بار گنگناتے ہوئے اُن کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچتا تھا۔ایک دن میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔میں نے اُن کو اسی طرح گنگناتے دیکھا تو ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا کہ اس عادت سے فائدہ کیوں نہ اُٹھایا جائے اور کسی بہتر کام میں کیوں نہ لگایا جائے۔ہم کیوں نہ اس گنگناہٹ کو تسبیح میں بدل دیں اور ہر وقت کوئی نہ کوئی وِردنوکِ زبان رکھیں تا کہ دونوں شوق پورے ہوتے رہیں۔اس سلسلے میں مجھے کلمتانِ حبیبا تان والی حدیث یاد آئی کہ یہ دو کلمات تو خدا تعالیٰ کو بہت پسند ہیں تو کیوں نہ میں ان کو ہی حرزِ جاں بناؤں! بس وہ دن اور یہ دن۔ میں نے اپنے مادی موسیقی کے شوق کو آسمانی موسیقی میں بدل دیا اور جو سکون و اطمینان و سرور مجھے اس سے نصیب ہوا ہے۔وہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔دنیا کی کوئی بھی موسیقی اس سرور و طمانیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔مجھے اب کسی گانے، کسی غزل، کسی نظم کسی بھی میوزک میں کوئی بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔کوئی سُر میرے دل کو نہیں لگتا۔کوئی دُھن مجھے انسپائر نہیں

کرتی۔ میں ہر وقت ہر دم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس الہام کو وردِ زبان رکھتی ہوں۔ سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم ۔ اللھم صلی علی محمد و آلِ محمد۔

میں دست با کار اور دل با یار کی عملی تفسیر بن گئی۔ میرے جلوت وخلوت اسی ورد سے رنگین رہنے لگی۔ لاکھوں کا مجمع ہو یا عالمِ تنہائی۔ بازار یا تفریح گاہیں ہوں یا کسی صحرا کا سا سکوت۔ میرے لئے یکساں ہیں کہ میرے لب اسی ذِکر میں مصروف رہنے لگے۔ گھر کے کام کاج چلتے پھرتے۔ لمبے سفر، لمبی واک، غرضیکہ کوئی بھی لمحہ اس ذکر سے خالی نہیں۔ اس آسمانی موسیقی سے میرا رواں رواں سرشار رہتا ہے۔ اور ایک گونہ بے خودی خودبخود طاری رہتی ہے۔

اب یہاں کینیڈا میں آ کر کچھ حالات بدل گئے ہیں اور وہ پہلے والی یکسوئی اور اطمینان نصیب نہیں رہا۔ ورنہ پہلے دور میں تو (میں اب کینیڈا آنے کے بعد کی زندگی کو دوسرا دور کہتی ہوں) یوں لگتا تھا کہ اللہ کے فضل کے سائے میں چلتی پھرتی ہوں۔ خدا تعالیٰ کے انوار کی بارش ہر وقت آنکھوں میں رہتی تھی اور عالمِ روحانیت کے عجب نظاروں سے شناسائی ہوتی تھی۔ وہ بھی ایک عجیب عالم تھا۔ اِدھر سوال کرنا۔ اُدھر جواب پالینا۔ نور کے سیلاب کو آنکھ بند کرتے ہی رواں پانا۔

یہ نور عجب خوبصورت شکلوں اور ڈیزائنوں میں ڈھلتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔ بعض اوقات کھلی آنکھیں بھی بہت کچھ دیکھ سکتی تھیں۔ غرضیکہ وہ زمانہ میری زندگی کا ایک بہت ہی ''نورانی'' باب ہے۔ جیسے یہاں آ کر ایک طرح سے میں نے کھو

دیااوراُس کی تشنگی اب بہت محسوس ہوتی ہے۔

اگر چہ اب بھی میرے معمول اکثر و بیشتر وہی ہیں مگر شاید اب مجھے زیادہ وقت دنیاوی معاملات میں لگانا پڑتا ہے ۔اس لئے اب وہ بات نہیں رہی۔مگر پھر بھی عالمِ سرشاری وہی رہتا ہےجن دنوں زیادہ مصروفیت ہواور ذکرالٰہی کم ہوتو یوں لگتا ہے کٹی پتنگ ہوں۔ اُلجھی اُلجھی ۔ کاموں میں بے دلی نماز میں کم توجہ۔ بے زاری اور بےقراری سی طبیعت میں آجاتی ہے۔جیسے سیدھے رستے سے ہٹ گئی ہوں۔ جونہی یہ ذکر وردِ زباں ہوتا ہے لگتا ہے زندگی در آئی ہے۔ کچھ عرصہ سے دورانِ سر کی وجہ سے زیادہ بولنے کی طاقت نہیں رہی تو یہ ذکر میں نے اپنی سانسوں میں بسالیا ہے۔یوں سمجھیں کہ ہر سانس میں تسبیح ہے۔قرآن شریف میں ہے کہ دُنیا کی ہر چیز خدا تعالیٰ کی تسبیح کررہی ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ یاخدا مجھے بھی اُن سب میں شامل کرنااور مجھے اپنی عبادت،ذکراورشکراحسن رنگ میں اداکرنے کی توفیق عطافرمانا۔آمین۔

یہاں اکثر خواتین کی محفلوں میں مجھ سے بھی کبھی کچھ سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے تو اچانک مجھے وہ بھولی بسری یاد آجاتی ہے کہ:

''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا''

صاحبو!وہ قصہ تو اب پارینہ ہوا۔اب تو ہم اسی شغلِ صوتِ سرمدی میں بہت خوش ہیں۔ سبحان اللّٰہ وابحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم ۔ اللھم صلی علی محمد وعلی آلِ محمد۔

○○

ایک جائزہ -ایک نظریہ

احمدیہ دارالسلام-ٹورنٹو

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا عمدہ پناہ عطا فرمائی ہے۔ یہ ہے اپنی طرز کی انوکھی بستی ، جہاں تمام عشاق مسیح محمدی دن رات اس کے سکھلائے ہوئے صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس فسق و فجور کے ماحول میں ایسی بلدۃ طیبہ جہاں ہر وقت خدائے واحد کا نام بلند ہوتا ہے۔ تہجد سے لیکر نماز عشاء تک یہ بستی خدا تعالیٰ کے ذکر سے مامور ہوتی رہتی ہے۔ خلیفۂ وقت کے ارشادات ہر گھر میں مواصلاتی سیارے کی مدد سے ٹی وی پر سنے اور دیکھے جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ اس کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔

ہجرت کے زخموں کو مندمل کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اس اجنبی دیس میں ہمیں اپنا دیس بخشا ہے، جہاں ہر طرف امن وسکون ہے۔ اپنائیت ہے، خوشی ہے اور اطمینان ہے۔ اپنے ہی لوگ ہیں اور ہر ایک سے اپنی زبان میں بات چیت ہو سکتی ہے۔ اپنا لباس، کوئی تکلف اور کوئی اجنبیت نہیں۔ ایک تحفظ کا احساس سب کے دلوں میں جاگزیں رہتا ہے۔ کیا خوبصورت ملک ہے اور کیا دیدہ زیب عمارت ہے۔

پاکستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے لہجوں میں باتیں کرتے ہوئے ، اِدھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں تو کینیڈا میں پاکستان لگتا ہے۔

یہاں بھی پنجابی زبان اور کلچر دکھائی دیتا ہے۔ پنجابی زبان کے بھی مختلف لب و لہجے ہیں اس لئے یہاں ہر قسم کی پنجابی بولنے والے مل جاتے ہیں اور اسی طرح اردو زبان بولنے والے بھی چلتے پھرتے سنائی دیتے ہیں۔

ہمارے ضلع سرگودھا کی سرائیکی نما پنجابی پاکستان میں بھی کم ہی سننے میں آتی ہے۔ جبکہ یہاں اس کے بولنے والوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ اپنے ان ملنے والوں سے جب ٹھیٹھ سرگودھوی لہجے میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ بھلا کینیڈا کہاں اور کدھر ہے؟

بچوں کے پارک میں ایک بڑے میاں تہبند باندھے، سر پر پگڑی رکھے اکثر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ان کے سامنے بس ایک عدد حقہ بھی پڑا ہو تو پنجاب کی تصویر مکمل ہو جائے۔ باہر عورتوں کا چلنا پھرنا بھی اوپر کی منزل سے ایک طرفہ تماشہ ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ بہت سارے Penguin ادھر اُدھر چہل قدمی میں مصروف ہیں۔

یہ تو تھی ایک عمومی تصویر...! اب ذرا اس خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت کے اندرونی حصہ کا بھی نظارہ ہو جائے۔ لوگوں نے نئے نویلے (Brand New) اپارٹمنٹس کے گھونگھٹ کھولے اور سب نئی چیزوں کے Tags اتار کر افتتاح کئے۔ خوب گورے چٹے اپارٹمنٹس ہیں۔ پردے، فرج، اوون، کچن، Closets، Cabinets، دروازے ہر چیز صاف و شفاف ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ان Brand New گھروں میں سامان بھی Brand New ہی رکھا جائے۔ مگر اکثریت یہ مصرعہ پڑھ کر الحمدللہ کہہ لیتی ہے کہ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

مگر یقین کریں اپارٹمنٹس نے پرانی چیزوں کو بھی اپنے اندر یوں سجایا ہے کہ پرانی چیزوں کا مان بھی بڑھ گیا۔ ہمارا پرانا سا سیکنڈ ہینڈ ڈائننگ سیٹ جسے ہم غلطی سے اِدھر لے آئے، یوں فٹ ہوا ہے کہ اب ہم سوچتے ہیں کہ بھلا اس میں خرابی ہی کیا ہے۔ اچھا بھلا تو ہے! کچن بے حد آرام دہ، خوبصورت اور ماڈرن مگر ان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے

من اپنا پرانا ''دیسی'' ہے
برسوں میں ''ولائیتی'' بن نہ سکا

ہم لاکھ ماڈرن اور ولائیتی بن جائیں مگر کچن کے معاملے میں ویسے کے ویسے ہی رہیں گے۔ پراٹھے، گرم روٹی اور بھنے ہوئے سالن ہمارے مردوں کی کمزوری ہیں۔ مگر اس کمزوری کے یہ کچن متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ کچن تو مائیکرو کوکنگ اور Can کھول کر کھانے کیلئے زیادہ موزوں ہیں۔ ہمارے بھاری بھرکم کھانے کی خوشبوئیں ان کے اوپر بہت گراں گزرتی ہیں۔ اور پھر دوسری بڑی بیخ جو ان کے ساتھ لگی ہے وہ ان کی ڈرائنگ روم کے ساتھ رشتہ داری ہے۔ ایک احمدی خاتون، ڈرائنگ روم اور کچن... ایک ایسی تکون ہے جس کے یوں تو تینوں زاویے برابر ہوتے ہیں لیکن اس کا خاتون والا زاویہ برابر نہیں بلکہ وہ کونہ ہمیشہ ہی ناخوش رہتا ہے۔ ایک احمدی خاتون اس خیال سے لرزہ براندام رہتی ہے کہ اگر کوئی مہمان آگیا تو چائے کیسے دی جائے گی اور اگر کوئی دعوت کرنا پڑ گئی تو کچن کو ڈرائنگ روم کا رشتہ دار بنا کر کیسے پیش کیا جائے گا اور تیسرا یہ کہ

مہمانوں کے آنے سے پہلے میز پر کھانے کا سٹیج کیسے سیٹ کیا جائے گا اور پھر عین وقت پر غڑاپ سے پردے کے پیچھے کیسے روپوش ہو جائیں اور اگر روپوش نہ بھی ہوں تو

''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں''

والا معاملہ رہتا ہے۔ اب یہ معاملہ انتظامیہ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ مہربانی فرما کر سب باورچی خانوں کو باپردہ کر دیں۔

Elevator اس بلڈنگ میں سوشل سروس کا کام دیتی ہے۔ اگر کسی کے گھر نہ بھی جا سکیں تو Elevator میں ضرور ملاقات ہو جاتی ہے اور خیر خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ اپنے کئی پرانے ملنے والوں سے یہاں پہلی ملاقات لفٹ میں ہی ہوئی اور مارے حیرت وافسوس سے سوچا ارے یہ بھی یہاں آن پھنسے۔ بچوں کے لئے لفٹ ایک کھلونا نما جھولا بھی ہے۔ جب جی چاہا بٹن دبایا اور چودھویں فلور سے بھی پھر پھرا آئے۔ خواتین کے لئے سب سے عجیب وغریب وہ لمحہ ہوتا ہے جب لفٹ کا دروازہ اچانک کھلتا ہے اور سامنے سات، آٹھ مرد کھڑے نظر آتے ہیں۔ اب 'نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا' معاملہ ہو جاتا ہے اور مجبوراً سر جھکائے اور نظریں چرائے مانند مجرم داخل Elevator ہو جاتے ہیں۔ عموماً اگر خواتین وحضرات اکٹھے محوسفر ہوں تو عجیب سی خاموشی طاری ہوتی ہے۔ سبھی شرمائے، لجائے اور کچھ کچھ بوکھلائے سے کھڑے ہوتے ہیں۔ میرا بس چلے تو عورتوں کیلئے ایک علیحدہ آسمانی بس چلا دوں۔

اس بلڈنگ کا سحر ایسا ہے کہ اس سے باہر نکل کر بھی آپ اس سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ مال میں شاپنگ کرتی ہوئی سب خواتین اہل بلڈنگ کی نظر میں رہتی ہیں۔

دوآبہ فارم تک آپ سب احمدیہ کاروں کی زد میں ہوتے ہیں۔ ادھر Islington Avenue کے چوراہے تک سینکڑوں نظریں آپ کا تعاقب کرسکتی ہیں۔کون، کہاں، کدھر، کیوں اور کیسے جارہا ہے، یہ سب کا مشترکہ concern ہوسکتا ہے۔

نیچے Multipurpose Room جس مقصد کیلئے بنایا گیا تھا، احمدی واقعی اس کا پورا پورا حق ادا کررہے ہیں۔ پانچوں وقت نمازیں، درس القرآن اور اردو کلاسیں، جلسے، مقامی اجتماع، جوڈو کراٹے کی کلاسیں، ٹیبل ٹینس وغیرہ سبھی اس میں ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اب طرہ یہ کہ مردوں کو اپنے جلسے میں خواتین کی موجودگی زیادہ گوارا نہیں ہوتی بلکہ انہیں براہ راست گھروں میں بیٹھے بٹھائے ہی ٹی وی پر سب کاروائی دکھا دی جاتی ہے۔

اس بلڈنگ میں آنے سے پہلے بعض لوگ خودساختہ مفروضوں کی بناء پر اور کچھ گھر چھوٹے ہونے کی وجہ سے یہاں آنے کیلئے متامل تھے۔مگر جونہیں آئے وہ خوب پچھتائے ہوئے ہیں اور جو آ گئے ہیں وہ خوب اترائے ہوئے ہیں۔کیوں نہ اترائیں... امن کے گہوارے میں رہنے کا اعزاز حاصل کئے ہوئے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جو خدا تعالیٰ نے ہمیں بطور تحفہ عطا فرمائی ہے۔خدا کرے کہ ہم اس عطا کردہ نعمت کا صحیح حق ادا کرنے والے ہوں اور اس کے ہر گھر کو خدا تعالیٰ کی حمد و تسبیح سے معمور کردیں۔آمین۔

OO

اس زمانہ کی صحبت صالحین

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے اُس نے صالحین کے خاندان میں پیدا کیا۔ بچپن سے ہی اپنی نانیوں، دادیوں اور بزرگوں کی عبادات اور زہد وتقویٰ کی باتیں کانوں میں پڑتی رہیں۔ بڑے ہوئے تو قادیان اور ربوہ کے صحابہؓ اور تابعین کے واقعات پڑھتے اور سنتے کہ کس طرح قادیان کی گلیوں میں صحابہ مسیح موعودؑ اپنے خوبصورت اقدار اور کردار کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے تھے اور اُن کی صحبتیں بھی خاص و عام کیلئے وقف تھیں۔

حضرت خلیفہ اولؓ، حضرت مصلح موعودؓ، حضرت میاں بشیر احمد صاحبؓ، حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ حضرت مولوی غلام رسول راجیکی صاحبؓ یعنی ہر طرف یہ محبتوں کے خزانے سب کیلئے برابر وقف تھے۔ جب چاہو ملو اور صحبت سے مستفیض ہو۔

ربوہ میں بھی یہی عالم تھا۔ بہت جید عالم اور بزرگ سب کی تربیت کیلئے ہمہ وقت کمر بستہ رہتے تھے۔ مجھے ربوہ میں مولوی غلام رسول صاحب راجیکیؓ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اپنے گھر کے تہہ خانے نما کمرے میں تشریف فرما تھے۔ میری امی اور میری خالہ اُن سے دعا کروانے اور ملنے کی غرض سے گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالعطاء صاحب، مولانا نذیر احمد مبشر صاحب، مرزا بشیر احمد صاحبؓ، مولانا مختار احمد شاہجہانپوری صاحب، مولانا ایاز احمد صاحب وغیرہ... الغرض... ؎

کئی چاند تھے سرِ آسماں جو چمک چمک کر پلٹ گئے

اور جو ہمارے نصیب میں نہ تھے۔ کیونکہ ہماری مجبوری کہیں یا بدقسمتی کہ سوائے جلسہ کے دنوں کے ربوہ میں جانا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اُس کے بعد تو تمام زندگی ہی خانہ بدوشی میں گزر گئی۔لوگ تو بہت ملے مگر کہاں وہ بات زہد وتقویٰ کی۔عموماً دنیاداری اور دکھاوا ہی زمانے کا چلن تھا اور ہے۔ وہ محبت اور خلوص ، وضع داری اور کچھ سکھانے اور بتانے کی لگن یا کسی خاص وجود کی ٹھنڈی میٹھی کشش سوائے چندلوگوں کے مجھے یادنہیں۔

اور جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں ایسا زمانہ تو شائد پہلے کبھی نہ گزرا ہو۔اس زمانے میں ہم نے قیادت سائنس اور ٹیکنالوجی کو سونپ دی ہے۔ ستاروں پر کمندیں ڈال دی گئی ہیں اور نئی نسل کو انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور آئی فون کے سپرد کر دیا ہے۔اب یہ وائی فائی اُن کی جو تربیت کرے اور وہ جو چاہیں وہاں سے حاصل کریں۔اب دنیا حاصل اور لاحاصل کے پیچھے سرگرداں ہے۔

اِدھر اسلام میں صحبتِ صالحین کی بہت تلقین کی گئی ہے۔قرآن کریم میں بھی یہی دعا سکھائی گئی ہے۔رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پاک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے پر بہت زور دیا ہے۔حضرت مسیح موعودؑ بار بار قادیان آکر اپنی صحبت میں بیٹھنے کی تلقین کرتے رہے اور اسی لئے جلسہ سالانہ بھی شروع کیا گیا۔ پرانے زمانے میں تو لوگ کسبِ فیض کرنے کیلئے دور دور جا کر یہ صحبت حاصل کیا کرتے تھے اور بہت وقت وہاں گزارتے تھے۔مگر اب تو ہمارے زمانے بدل گئے، منظر بدل گئے، کردار بدل گئے۔ نئی نسل اور ہمارے درمیان خلا در خلا ہے جو دور دور تک پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔زبان و بیان کا فقدان اور ٹیکنالوجی کی یلغار ...دھند ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایسا جنریشن

گیپ تونسلِ انسانی شاید پہلی دفعہ ہی دیکھ رہی ہے۔

اپنی اگلی نسل کے ساتھ کچھ ایسی ہی محفل لگانے کو جی چاہتا ہے کہ اپنے آباء کی کچھ باتیں ہوں، مگر کچھ ہمارے زبان و بیان کا فرق اور کچھ وہ اپنے سیل فون میں غرق... بات چلے تو کیسے۔ اُن کے چہروں کی بیزاری دیکھ کر ہمیں اپنا منہ بند رکھنے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ بقول حبیب جالب ؎

پیار کی روشنی نہیں ملتی ان مکانوں میں مکینوں میں
وہ محبت نہیں رہی جالب، ہم سفیروں ہم نشینوں میں

اب رہ گئے ہم پچھلی نسل کے بیچارے لوگ جو خود ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کوئی ہم نفس، کوئی ہمنوا، کوئی ہم ذوق وہم عصر مل جائے تو مل بیٹھیں کہ ؎

ہم اختتام ہیں اک عہد کے فسانے کا

ہمارے لئے یہ محبتیں اگر نایاب نہیں تو کم ضرور ہیں اور اگر چہ یہ چھپے ہوئے موتی کہیں نہ کہیں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں مگر اُن تک پہنچنا بھی تو اِک کارِدارد ہے اور پھر آج کل لوگوں کے گھروں میں یونہی چلے جانا بھی تو ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ باقاعدہ فون کر کے اور اوروقت لیکر جانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی آج کل کے مصروف شب و روز میں کسی کو فرصت ہے کہ کسی کو وقت دے یا خود کہیں جا کر کسی عمر شکن اور متاثر کن شخصیت کی صحبت میں جا کر بیٹھے۔ عجیب سی تشنگی کا احساس رہنے لگا تھا۔

قادیان اور ربوہ کی باتیں کچھ اور بھی آتشِ شوق کو تیز کرنے لگیں تو اس تمنا کا حل میں نے یوں ڈھونڈ نکالا کہ کیوں نہ مشہور سوانح عمریاں پڑھی جائیں اور ان کی صحبتوں

میں رہا جائے۔ مجھے واقعی بہت اچھا لگا۔ ہر بایوگرافی کچھ اچھا کرنے کی خواہش کو اُجاگر کرتی۔ پھر یہی پیاس مجھے پہلے روحانی خزائن اور پھر ملفوظات کی طرف لے گئی تو مجھے یوں لگا کہ واقعی میں حضرت مسیح موعودؑ کے قدموں میں جابیٹھی ہوں۔ وہ شاہ نشین پر بیٹھے ہیں اور میں اُن کی مجلس عرفان میں اُن کی طرف دیکھنے اور اُن کی باتیں سننے میں محو ہوں۔ نہ نظر ہٹتی ہے نہ دِل بھرتا ہے۔ ایک ایسی روحانی و پاکیزہ محفل جس میں آپ گھنٹوں بیٹھے رہیں تو خود کی خبر نہ رہے۔ جی ہاں اگر آپ واقعی کسی صحبتِ صالحین کی تلاش میں ہیں تو ملفوظات سے بہتر اس زمانے میں کوئی اور صحبت نہیں ہے۔

ملفوظات سے مُراد آپ کا وہ کلام ہے جو آپ نے کسی مجمع یا مجلس یا سیر کے دوران میں بطریق گفتگو یا تقریر ارشاد فرمایا اور لکھنے والوں نے اُسے اسی وقت لکھ کر ڈائری وغیرہ کی صورت میں البدر اور الحکم اخبار میں شائع کر دیا۔

خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے اس زمانے میں ایسے وسائل مہیا فرما دیئے تھے کہ اس مامورِ زمانہ کے یہ روح پرور کلمات قیامت تک کیلئے محفوظ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مولوی عبد الکریم صاحب سیالکوٹیؓ، حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ اور حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی صاحبؓ کے درجات بلند فرمائے، جنہوں نے یہ ملفوظات حتیٰ الوسع حضورؑ کے ہی الفاظ میں قلمبند کر کے محفوظ کئے اور حضورؑ کی زندگی میں ہی بدر اور الحکم میں شائع فرماتے رہے۔

ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک ایسا قیمتی خزانہ ہے جو خود ہماری اور آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کیلئے اپنے اندر ایک غیر معمولی مواد اور طاقت رکھتے ہیں۔

خصوصاً جبکہ آج کی نئی نسل کو تربیت کی بہت ضرورت ہے۔ہم سب یہ ارشادات حضور کی ہی زبان میں ان کو سمجھا سکتے ہیں اور تبلیغ میں بھی یہ بہت کام آسکتے ہیں۔ جماعت کی تربیت کے ضمن میں ملفوظات کا مرتبہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کلام کی جملہ اقسام میں سے اوّل نمبر پر سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جو حضور علیہ السلام نے اپنے احباب کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا اور حضورؑ کے مدنظر جماعت کی تعلیم و تربیت کا پہلو تھا۔اسلئے ملفوظات میں اصلاحِ نفس اور تربیت کا سب سے بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

ملفوظات 10 جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد 1891 سے 1899ء تک کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔جلد چہارم سے جلد دہم تک 15/اکتوبر 1902 سے لیکر مسیح موعود علیہ السلام کی یومِ وفات 26/مئی 1908ء تک ہیں۔

اب چونکہ یہ آخرین منہم کا دور ہے۔اس زمانے کے امام اپنی بیش بہا کتابوں کا خزانہ چھوڑ گئے ہیں اور پھر اُن کا فیضان خلافت کی صورت میں جاری ہے۔ہم اس زمانے کے اُن خوش قسمت افراد کا گروہ ہیں جس کیلئے یہ مامور بھی اپنی تربیت کے خزانے چھوڑ گیا اور ساتھ ہی خلفاء کرام نے بھی اپنی کتب کے ذریعہ ہماری تعلیم وتربیت جاری رکھی۔ہم جب چاہیں اُن کی اسی صحبتِ جاریہ سے فیض اُٹھا سکتے ہیں اور آج کل تو ہماری یہ نیکی کی صحبت ایم ٹی اے کے ذریعہ ہر وقت موجود ہے۔ جب چاہیں ایم ٹی اے کی صحبت میں جا بیٹھیں۔

یہ روحانی مائدہ مستقل ہمارے لئے مہیا ہے۔ ہماری نئی نسل کیلئے ہماری بہترین سرمایہ کاری اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگی کہ اُنہیں خلافت کی لڑی میں پرو دیں۔ایم

ٹی اے ان کی عادت بنا دیں اور خلافت سے مضبوط تعلق قائم کر دیں۔

اور پھر ان دنوں Covid کا زمانہ آیا ہوا ہے اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ لیکن جسطرح ہر چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہوتے ہیں اسی طرح اس ناگہانی آفت کا اچھا پہلو گھروں میں بچوں کی تربیت، ہر گھر کا مسجد بن جانا اور ٹیلیفون پر سب کی تربیت کا مائدہ نازل ہونا بھی ہے۔ اُردو اور انگلش میں ہر طرح کا درسِ قرآن، درسِ حدیث، عربی گرائمر کلاس، حلقہ وار تعلیمی اور تربیتی کلاسز، حلقہ وار اجلاساتِ عام وغیرہ گھر بیٹھ کر اپنے ماحول میں اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے حاصل کرتے رہیں۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آخری زمانے میں صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے اور زمین اپنے ہر طرح کے خزانے اُگل کر باہر پھینک دے گی۔ صاحبو! صرف حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس دورِ پُر آشوب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس کشتی کے ہم سب جو سوار ہیں ان کیلئے اس مبارک کشتی کے پتوار خلفاء کرام کے ہاتھوں میں ہیں جو زمانے کی شوریدہ سر لہروں میں اسے کھیتے چلے جا رہے ہیں اور ہماری حفاظت کا سامان کر رہے ہیں۔ آج اس مبارک کشتی نوح کے ملاح ہی ہماری نجات ہیں۔ یہی ایک جاری و ساری صحبت صالحین ہے۔ کاش ہم سب ان صحبتوں سے فائدہ اٹھانے والے ہوں۔ آمین۔

OO

مجھے فخر ہے

صداقت مسیح موعودؑ ہماری روزمرہ زندگی کے حوالے سے

کیا شک ہے ماننے میں تمہیں اس مسیح کے
جس کی مماثلت کو خدا نے بتا دیا
لوگوں کو یہ بتائے کہ اب وقتِ مسیح ہے
اب جنگ و جہاد حرام و قبیح ہے

کہیں کوئی بم پھٹتا ہے، لوگ مرتے ہیں، تباہی و بربادی کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ ٹی وی، اخباروں میں ہر طرف کئی پھٹی لاشوں کے انبار اور خون کے دریا دکھائی دیتے ہیں اور ساتھ ہی تمام دنیا کی نظریں عالمِ اسلام کی طرف اُٹھ جاتی ہیں تو میرا خیال سیدھا اس طرف جاتا ہے کہ کاش دنیا میں جو نذیر آیا تھا، یہ لوگ اس کو قبول کر لیتے تو آج یہ رسوائی تو مقدر نہ ہوتی۔ ہاں دنیا نے اُسے قبول نہ کیا مگر اب خدا تعالیٰ انہی زوردار حملوں سے اُس کی سچائی کو ظاہر کر رہا ہے۔ جہاد کی نفی کرنے والے از قسم کے یہ جہادی کس طرح جہاد کے نام پر خود بھی ذلیل ہو رہے ہیں اور تمام عالم اسلام کو بھی رسوا کر رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسیح پاک کے اس فرمان کے خلاف مسلمانوں نے اس دور میں جب بھی لڑائیاں لڑیں ہزیمت ہی اُٹھائی کیونکہ وقت کے مسیحا نے بتا دیا تھا کہ یہ زمانہ تلوار کے جہاد کا نہیں بلکہ قلم کے جہاد کا ہے۔ سلطان القلم نے اشاعتِ اسلام کیلئے

آج کے میڈیا کی بنیاد رکھی اوراس زمانہ کے قلمی جہاد کا اعلان کیا۔اب جبکہ ایم ٹی اے کے پر جہاد جاری ہے۔انٹرنیٹ، کتب ورسائل پریس اورمیڈیا کے ذریعے یہ جنگ لڑی جارہی ہےتو میں خدا تعالیٰ کا بے حد شکرادا کرتی ہوں کہ میں اس سچے مسیح کی جماعت میں سے ایک جہادی ہوں جس نے کہا کہ:

صفِ دُشمن کو کیا ہم نے بحجت پامال
سیف کا کام قلم سے ہے دکھایا ہم نے

پچھلے سال میں پاکستان گئی تو مجھے مختلف اولیائے کرام کے مزاروں پر جانے کا اتفاق ہوا۔آج اس اکیسویں صدی میں جب دنیا کے علوم اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں، وہاں کے غریب عوام کے حالات،شرک وتوہمات کے سیلاب، بےحساب جاہلیت اور عام لوگوں کی مذہب کی روح سے نابلدگی عجب حیران کُن تھی۔میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہاں کے عام آدمی کی ذہنی سطح اس حد تک گرادی گئی ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کران مٹی کے ڈھیروں کوسجدہ کرتا ہے۔

ایک مزار پر ہم عصر کی نماز کے وقت گئے۔وہاں نماز میں شامل چار پانچ آدمی تھے مگر پیر صاحب کی قبر پرایک ہجوم تھا۔اُس کے بعد حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بیچارے جاہل غریب لوگ باقاعدہ اُس قبر کے سامنے سجدہ ریز تھے۔ہم نے قبروں کوسجدہ توسن رکھا تھا مگر پہلی دفعہ واقعۃً سجدہ کرتے ہوئے دیکھ کر بے حد افسوس ہوا اوران نام نہاد پیروں پر بےانتہا غصہ آیا جو کہ یہ حدیث جانتے ہیں کہ:

''دیکھومیرے بعد میری قبرکوسجدہ گاہ نہ بنالینا''

مگر یہ خودغرض پیراپنی اجارہ داری اوررزق کیلئے ان جاہل لوگوں کوکبھی نہیں بتائیں گے کہ سجدہ صرف خدا تعالیٰ کو جائز ہے۔ اس سے پہلے مزار کے باہر ہم ان پیر صاحب کے گھر کے باہر کا منظر دیکھ آئے تھے جہاں ان کی پجارو گاڑی کھڑی تھی اور لوگ ان سے تعویز لینے کیلئے باہر جمع تھے۔ یعنی خدااوررسول کے نام پر خوب بزنس چل رہا تھا۔

اسی طرح داتا گنج بخش رحمۃ اللہ کے مزار پر مولویوں کی ٹولیاں حلقے بنا کر گرج گرج کر وعظ کرتے ہوئے ،نعت خوانوں کی ٹولیاں لہک لہک کر نعت خوانی کرتے ہوئے ،قوالوں کی منڈلیاں اور تالیوں کا شوراوران سب کے درمیان پیسے اکٹھے کرنے کیلئے ایک کپڑا بچھا ہوتا اور لوگ ان وعظوں، نعتوں اور قوالیوں پر جھومتے ہوئے نذرانے پھینکتے جاتے۔ ایک بازار گرم تھااور ہنگامہ برپا تھا۔ اسلام، خدااور رسولؐ کے نام پر عجب کاروبار جاری تھا۔ میں عورتوں کی جانب جا کر مزار پر دعا کرنے کیلئے گئی تو میرا مغربی طرز کا برقعہ نما کوٹ ان مجاورعورتوں کیلئے لالچ کا باعث ہوااورانہوں نے مجھے دور سے بلا کر مزار شریف تک دُعا کیلئے رسائی دی جبکہ باقی عورتوں کا جم غفیر وہاں پہنچنے کیلئے منت سماجت کررہا تھا۔ وہاں مزار کی کھڑکی میں ایک بڑا سا سیف رکھا تھا جہاں مجھے اُن کے اندازے کے مطابق ڈالروں میں نذرانہ ڈالنا تھا۔ میں نے فاتحہ تو پڑھی مگر ساتھ ہی جیسے اس قسم کے اسلام پر بھی فاتحہ پڑھ دی کہ اگر یہ اسلام اتنی بڑی ہستی کے نام پر چل رہا ہے تو یہ عظیم صاحب قبر بھی کسقدر شرمندہ ہوتا ہوگا کہ میرے نام پر کیا کفرو الحاد چل رہا ہے۔ مزار کے اندر قبر کی سجاوٹ، مجاوروں کی بناوٹ اور باہر بیٹھے ہوئے عوام یا یوں کہیئے کہ عالم اسلام کی جاہلیت کو دیکھ کر میں نے خدا تعالیٰ کا بے حد شکرادا کیا کہ میں

اس قسم کے مسلمانوں میں سے نہیں ہوں بلکہ اس زمانے کے مامور، اس سچے مسیح کی ماننے والی ہوں جس نے ہمیں صحیح خدا شناسی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسے عظیم الشان نبی کی پہچان اور اُس کے بتائے ہوئے حقیقی اسلام کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا۔ الحمدللہ۔

ملتان میں بہاؤالدین ذکریا رحمہ اللہ اور دیگر بڑے بڑے مزاروں پر بھی یہی دیکھا کہ قبر کے ساتھ حجروں میں قرآن خوانی کیلئے بہت سے قرآن کریم اور سپارے رکھے تھے جہاں خواتین بہت خشوع وخضوع سے جھوم جھوم کر قرآن شریف پڑھنے میں مصروف تھیں۔ میں نے وہاں کسی سیپارے یا قرآن کو باترجمہ نہیں پایا۔ اس اسطرح صرف ناظرہ قرآن کریم پڑھنا تو جیسے عالم اسلام کا مستقل طریقہ ہی بن گیا ہے اور کسی کو یہ معلوم نہیں کہ قرآن مجید سکھاتا کیا ہے؟ اس میں لکھا کیا ہے؟ اور اس میں پیغام کیا ہے۔ بس صرف جنتر منتر کے طور پر اپنی ذاتی تسکین کو حاصل کرنے کا ذریعہ رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کی حقیقی تصویر کسی کے پاس پہنچتی ہی نہیں تو قرآن مجید کی تعلیم کا ادراک اور پھر اس پر عمل کیسے ہو؟

میں نے وہاں مجاوروں کو سب عورتوں کو بلکہ مردوں کو بھی یہی بتانے کی کوشش کی کہ خدا کیلئے قرآن کو ترجمے سے پڑھیں۔ مجھے ہمیشہ ہی یہ بہت محسوس ہوتا ہے کہ آج تک جتنی بھی اسلامی حکومتیں گزریں اور آج کل بھی جو ہیں کسی نے بھی عربی زبان کو سیکھنا لازمی قرار نہیں دیا۔ ہر قسم کے علوم پڑھائے جاتے ہیں مگر عربی لازمی نہیں۔

اور پھر یہاں ایک مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ اگر لوگ ترجمہ جان گئے تو پھر مولویوں کے

رزق کا کیا بنے گا؟ ان کے مفاد میں تو ترجمہ نہ جاننا ہی بہتر ہے۔ وہاں پر موجود ان غریب عورتوں پر مجھے بے حد ترس آیا کہ ان کا کوئی رہنما کوئی ہادی ہی نہیں۔ میں نے ایک دفعہ پھر بہت اطمینان اور فخر سے جی ہاں فخر سے سوچا کہ میں اُن لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔ میں اس مہدی دوراں کی جماعت میں سے ہوں جس نے ہمیں سکھایا کہ:

قرآں خدا نما ہے خدا کا کلام ہے
بے اُس کے معرفت کا چمن نا تمام ہے

موجودہ زمانے میں قرآن کی عظمت شان کا اظہار حضور علیہ السلام کا احیائے اسلام کے تعلق میں ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جسے ایک ماموررِ ربانی ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ آپ نے یقینی اور قطعی دلائل سے ثابت کیا قرآن مجید سنتِ رسول اور حدیثِ رسول سے مقدم ہے اور قرآن شریف کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ قرآن کو حسنِ ترتیل کے ساتھ ترجمے سے بھی پڑھنے کیلئے بے حد زور دیا کہ قرآن مجید کے معانی کو جاننا اصل مقصد ہے۔ آج حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل ؓ کی تفسیر حقائق الفرقان، حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ کی تفسیر کبیر و صغیر اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ کے قرآن کے تراجم اور تفاسیر نے ہم سب کو اس عظیم کتاب کا عرفان عطا کیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پوری دنیا کو قبولیت دُعا کا چیلنج دیتے ہوئے فرمایا کہ میں قبولیت دُعا کا نشان دیا گیا ہوں، کوئی نہیں جو میرا مقابلہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا کہ میری ہزاروں دعائیں قبول ہو چکی ہیں اور میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔ آپ نے ہمیں زندہ خدا کا نشان بتلایا کہ جو آج بھی اُس طرح سنتا ہے اور جواب دیتا

ہے۔آج جماعت احمدیہ عالمگیر اس دعا کے ہتھیار پر اسقدر ایمان رکھتی ہے کہ کوئی بھی مشکل ہوتو یہ یقین کہ ’’خداداری چہ غم داری‘‘ تمام فکر وغم دور کر دیتا ہے اور سب ایک کامل یقین کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایسے ایسے خارق عادت واقعات ظہور میں آتے ہیں کہ اس مجیب الدعوات سمیع وبصیر خدا پر کامل ایمان ہو جاتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک جو اس جماعت میں شامل ہے، قبولیت دعا کا ذاتی تجربہ رکھتا ہے۔ہم نے اپنی زندگی کے ہر پہلو میں قبولیت دُعا کے معجزات دیکھے اور اضطرار اور کرب کے ساتھ کی گئی دعاؤں کے نتیجے میں ناممکن کو ممکن ہوتے دیکھا۔میں خدا تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کرتی ہوں کہ میں اس شاہد ونقیب امام مہدی کے گروہِ قدوسیاں میں شامل ہوئی جس نے دنیا کو زندہ خدا کی خبر دی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے مسیح موعود کا ایک بڑا کارنامہ کسرِ صلیب بیان فرمایا ہے چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام ازالہ اوہام میں فرماتے ہیں کہ:

’’...جب تم مسیح کا مُردوں میں داخل ہونا ثابت کر دو گے اور عیسائیوں کے دلوں میں نقش کر دو گے تو اُس دن تم سمجھ لو کہ آج عیسائی مذہب دنیا سے رخصت ہوا۔‘‘ (ازالہ اوہام۔حصہ دوم۔صفحہ 288)

چنانچہ ویٹیکن میں حضرت عیسیٰ کا Shroud یعنی کفن اور اُس پر لگا ہوا خون ثابت کرتا ہے کہ آپ زندہ صلیب سے اُترے ۔ کچھ عرصہ گزرا ایک یورپی عورت جو آرکیالوجی کی ماہر ہے، اُس نے کہا کہ مجھے مسیح کی قبر جو محلہ خانیار کشمیر میں ہے اُس کا DNA ٹیسٹ لینے دو تا کہ میں اس کو Shroud والے خون کے DNA سے ملا کر دیکھوں

کہ وہ ایک جیسے ہیں کہ نہیں۔ مگر کسی عیسائی حکومت یا طاقت نے اسے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ اس سے یہ زندہ مسیح کے آسمان پر جانے کا عقیدہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ تمام لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں مگر ماننے سے انکاری ہیں کیونکہ اس طرح ان کے مذہب کا وجود اور بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن اب وہ وقت قریب ہے کہ ہم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ میں ہی کہہ سکتے ہیں کہ:

آرہا ہے اس طرف احرارِ یورپ کا مزاج
نبض پھر چلنے لگی مُردوں کی ناگہ زندہ وار

ہم اپنے پاکستانی ملنے والوں سے یا اپنے دوسرے مسلمان ملکوں کے دوستوں سے میل ملاقات کے دوران صاف محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں ایک جلا ہے۔ ہمارے ذہن نئے دور کے ساتھ اسلام کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جبکہ دوسرے مسلمانوں نے اپنے ذہنوں کے دریچے بند ہی رکھے ہوئے ہیں۔ عید میلاد النبیؐ کو ہی لیجئے۔ ہمیں میلاد کی محفلوں میں اکثر بلایا جاتا ہے۔ وہاں رسول کریم ﷺ سے عقیدت و محبت کے والہانہ نظارے نظر آتے ہیں اور اجتماعی درود و سلام ولوں پر ایک روحانی سرور کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی کچھ بدعات و رسومات ماحول کے تقدس کو کچھ گہنا سا دیتی ہیں۔

مجھے ایک میلاد کی محفل نہیں بھولتی۔ میری ایک بہت پڑھی لکھی دوست جو لاہور کے ایک بڑے کالج کی پرنسپل بھی تھیں، کے گھر میں محفل میلاد تھی۔ ایک بڑے کمرے میں سفید چاندنیوں کے فرش پر تین اطراف دیواروں کے ساتھ رکھے گاؤ تکیوں پر بہت رکھ

رکھاؤ والی امیر خواتین پُرتکلف لباسوں میں اپنے دوپٹے قرینے سے سروں پر اوڑھ کر مؤدب بیٹھی تھیں اور ایک دیوار کے ساتھ ایک مولانا نما مولوی صاحب تشریف فرما تھے ۔صلی علی کے روح پرور اجتماعی درود و سلام کے ساتھ محفل کا آغاز ہوا۔ ماحول میں ایک نورانی تقدس چھا گیا اور عورتوں نے اپنے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

اُس کے بعد اُن خوش لحن مولوی صاحب نے آنکھیں بند کر کے خوبصورت نعتیں یکے بعد دیگرے پڑھنی شروع کیں۔ اور ہر نعت کے دران وقتاً فوقتاً اچانک آنکھ کھول کر اسطرح کمال چابکدستی سے تینوں اطراف نظریں گھما کر آنکھیں بند کر لیتے کہ اُن کی مکمل نگاہِ کرم سے کوئی بچی نہ رہتی۔ میں نے ان کی اس بصری مہارت کی داد دیتے ہوئے سوچا کہ مدحِ رسولؐ کا کیا ہی انوکھا اور نرالا انداز ہے کہ سجی سجائی عورتوں کے درمیان جھومتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام لیتے لیتے سب پر نظر کرم بھی ڈالتے جائیں اور پھر خشوع و خضوع سے حُبّ رسولؐ کا دم بھرنے لگیں۔ اس وقت مجھے پھر یہ احساسِ تفاخر ہوا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے توضیح اسلامی تعلیم جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں سکھائی ہے وہ اس طرح ہمارے دلوں میں جاگزیں کر دی ہے کہ خود بخود اس عظیم ہستی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے درود و سلام ہمارے لبوں پر جاری ہو جاتا ہے اور کوئی لمحہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں ہوتا۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہماری سانسوں میں درود سمایا ہوا ہے۔ ہمیں تو ایسی محفلیں برپا کر کے ایسا درود پڑھنے کی کوئی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلسے منعقد کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کے ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

آج اکیسویں صدی میں جبکہ زمانہ قیامت کی چال چل چُکا ہے اور علوم وفنون و ٹیکنالوجی اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ مسلمان ابھی تک نہایت چھوٹے چھوٹے بے کار گھٹیا مسائل میں اُلجھے ہوئے اپنی جاہلیت کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ آپ یوٹیوب یا اُردو اخباروں میں دیکھ لیں وہی نیل پالش کے ساتھ وضو یا نہانے دھونے کے بیوقوفانہ سوال وجواب میں پڑے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک ابھی تک عید کے مسئلے پر اکٹھے نہیں ہو سکے۔ ایک چھوڑ تین تین عیدیں منائی جاتی ہیں۔ وہ یہ بات سمجھنے کیلئے تیار ہی نہیں ہیں کہ ماڈرن ٹیکنالوجی سے ہر جگہ وقت کے مطابق چاند کے سائیکل کی تاریخیں سال کے شروع میں ہی معلوم کرکے اور ایک ایک سیکنڈ کا حساب رکھ کر نکال لی جاتی ہیں۔

جماعت احمدیہ ان علوم سے فائدہ اُٹھا کر زمانے سے قدم ملا کر چلنے والی جماعت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام امام مہدی تو مبعوث ہی اس زمانے کیلئے کئے گئے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ مرورِ زمانہ کی جو فرسودگی اسلام پر چھا چکی ہے اُسے صاف کرکے حقیقی اسلام کا چہرہ دنیا کو دکھائیں۔

اُن کے بعد قدرت ثانیہ اُن کے خلفاء کے ذریعہ ہمیں ہر دم اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے۔ ہم ایک امام کے سائے تلے ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہیں اور ہر قدم پر ان کی رہنمائی اور برکت ہمیں مل رہی ہے۔ مجھے فخر ہے... ہاں مجھے بے حد فخر ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس امام الزماں مہدیٔ دوراں علیہ السلام کی جماعت میں شامل کیا ہے اور میں ان تمام فیوض و برکات سے فیضیاب ہو رہی ہوں جو امام کے ساتھ وابستہ رہنے میں ہیں۔ الحمدللہ۔ OO

نشاناتِ عمرِ رفتہ

لجنہ کی مجلسِ عاملہ کی طرف سے بزرگ خواتین عرف سینئرز کی میٹنگ میں ان سے عمرِ رفتہ کی کہانیاں سنانے کی فرمائش پر یہ مضمون پڑھا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ جب بوڑھے بوڑھیاں اپنے وقتوں کے قصے سنا کر سننے والوں پر سحر کر دیتے تھے۔ آباؤ اجداد کے قصے، شجرۂ نصب، ان کی اپنی آپ بیتیاں، اپنے خاوندوں، سسرالیوں اور برادریوں کے سبق آموز قصے اور کبھی برادریوں کی آپس میں چپقلشیں اور لڑائیاں، پھر صلح صفائیاں، متحدہ خاندانی نظام کی روزمرہ کی کھٹی میٹھی باتیں، تجربات و تجزیات وغیرہ۔ یعنی ایک مزیدار تجرباتی اور واقعاتی سچی کہانیاں چلتی رہتی تھیں اور نئی نسل خود بخود سیکھتی رہتی تھی۔ وہی اُس زمانے کے اقوالِ زریں ہوتے تھے اور وہی علاج اور ٹوٹکے۔ آپس میں محبتیں اور رشتہ داریاں بہت میٹھی اور مضبوط ہوتی تھیں۔ صاف ستھرا اور ستھرا معاشرہ تشکیل پاتا تھا۔

اچھا ہے وہ بزرگانہ طور طریقے اب نہیں رہے۔ اگر ہوتے بھی تو بزرگ بے چارے کیا کر لیتے۔ Cell فون کے سامنے ان کی دال کہاں گلنی تھی۔ پچھلے زمانے کے تمام طور طریقے اب انگلی کی ایک جنبش سے یک قلم موقوف ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔ اب تو انگلی کی حرکت میں اسقدر برکت ہے کہ ایٹم بم چلانے

کیلئے بھی بس یہی انگلی کی ایک حرکت درکار ہے اور دنیا پلک جھپکتے ہی ختم۔ اب تو نئی نسل سیل فون کے بحرِ عمیق میں غرق ہو چکی ہے۔ اگر باتیں نہیں تو انگلیاں پیغامات پر چلتی ہیں اور آنکھیں اس جامِ جم کے رنگین نظاروں میں گم اور بزرگ اپنا سا منہ لے کر خود بھی واٹس ایپ پر اپنے آپ کو گم کرنے لگے ہیں۔

بات یہ ہے کہ بڑھاپے میں ماضی اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اُٹھتا ہے مگر قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ان رعنائیوں کے بارے میں سننے کیلئے نہ کسی کے پاس وقت ہے نہ ضرورت بلکہ ایسی بیزاری اُن کے چہروں پر نظر آتی ہے کہ توبہ۔ فوراً ہونٹ بھینچ جاتے ہیں اور شرمندگی طاری ہو جاتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ پچھلے سال کی طرح نام پر ہی اعتراض ہے۔ پچھلے سال سینئرز میٹنگ تھا اور اس دفعہ بزرگ حسینائیں، دیکھو اس طرح دِل توڑا نہیں کرتے۔ بزرگ کس کو کہا ہے؟ بزرگ کون؟ بزرگ ہوں گی آپ !! آپ کو کئی دفعہ کہا ہے کہ آپ ہمیں گولڈن گرلز کیوں نہیں کہتیں۔ بس اس کا ایک بھلا سا مستقل نام رکھ دو: ''گولڈن گرلز میٹنگ'' ویسے بھی اگر بھگو کر لگاؤ تو چوٹ زیادہ لگتی ہے۔ تو آپ دوہرا فائدہ اُٹھائیں۔

کہتے ہیں کہ جب میر تقی میرؔ دلی سے لکھنؤ گئے تو وہاں کے لوگوں کی اکثریت اُن کی شہرت سے ناواقف تھی۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں لوگوں نے اُن کا تعارف پوچھا تو انہوں نے اپنا مشہور زمانہ قطعہ سنایا۔

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کر برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

چنانچہ عہدِ رفتہ کے ان ستاروں کی چمک ماند پڑنے کا مرثیہ اب کامیڈی کی صورت میں ہم سے کیوں سننا چاہتی ہیں۔

''اِک تیر میرے سینے میں مارا ہائے ہائے''

کیا کارنامے تھے، کیا پُرسحر شخصیات تھیں اور ہیں۔ ہم آپ تو اُن کی دُھول تک نہیں پہنچ سکتے۔ ویسے بھی یہ تو دل دلوں کے معاملے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی 80 سالہ بھی ابھی تو میں جوان ہوں کہ خیال میں ہو اور کوئی جوان اپنے اطوار و عادات میں بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا ہو۔ اوراس کے علاوہ اگر آپ کا کسی کو بزرگ کہنے پر کچھ لوگ اَبُرو اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے پوچھیں کہ کس کو کہہ رہے ہوتو!

چنانچہ آج ہم بڑھاپے کی نشانیاں بتا کر آپ سے پوچھتے ہیں کہ جس جس میں یہ نشانیاں پائی جائیں وہ ہاتھ کھڑا کرنے کی بجائے صرف سر ہلاتا جائے۔ چنانچہ بڑھاپے کی نشانیاں کچھ یوں ہوسکتی ہیں:

❁ بڑھاپے کے آغاز میں ہی اقوالِ زریں اچھے لگنے لگنا۔

۞ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتابوں اور نصائح کا صحیح مفہوم سمجھ آنے لگنا۔

۞ حضور کے خطبات اور مُربیان کی تقاریر پر خود بخود سر ہلنے لگنا۔

۞ پرانے قصے سنانے کا شوق بڑھ جانا چاہے لوگ کان بند کر لیں۔

۞ نئی نسل کو وعظ نصیحت کرتے ہوئے خونخوار اور بیزار نظروں کا سامنا کرنا اور اگلی دفعہ یہ کام کرتے ہوئے زبان کا لڑکھڑا جانا۔

۞ نئی نسل کو سیل فون کی خرابیاں بتاتے بتاتے خود واٹس ایپ کا شکار ہو جانا۔

۞ دوستوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے سب سے زیادہ محبوبِ موضوعِ سُخن آپس کی بیماریوں، دوائیوں اور ڈاکٹروں کو ڈِسکس کرنا۔

۞ اچھے ہسپتالوں اور لیبارٹریوں کو بھی موضوعِ سخن بنایا جا سکتا ہے۔

۞ سب سے زیادہ کامن بیماریاں، شوگر، بلڈ پریشر، کولیسٹرول، کُڑل یعنی ٹانگوں میں Cramps اور جوڑوں اور گھٹنوں کا درد ہو سکتی ہیں۔

۞ بھولنے کا مسئلہ بھی سوالیہ نشان ہو سکتا ہے۔

۞ ایک دوسرے کو اپنے نسخے، ٹوٹکے اور طبی تجربات بتانے کی افادیت کا بڑھ جانا۔

۞ بچوں کے رشتوں کے قصے، استخارے، شادیاں اور خدانخواستہ ٹوٹنے کے قصے بہت دلچسپی سے سنانا اور سُننا۔

۞ بہوؤں کی اچھائیاں اور برائیاں اور اپنی رسوائیوں کا بیان اور اس معاملے میں اپنی آپ بیتیاں سب سے زیادہ محبوب ہو جانا۔

۞ جن بچوں کی شادیاں ابھی نہیں ہوسکیں اُن کے رشتوں کے فکر اور اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کی تلاش میں پریشان رہنا۔

۞ ہر اچھی بات پر فوراً عمل کرنے پر دِل کرنا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔

۞ انگریزی علاج کی بجائے دیسی علاج یا پھر ہومیوپیتھی پر پختہ یقین ہوجانا۔

۞ باہر کے کھانے نقصان دہ لگنے لگنا۔

۞ سادے، بے رنگ، بے ذائقہ سوٹ پہننے میں عافیت محسوس ہونا۔ سُرخ آتشی یا گہرے کلر لوگوں کی تیکھی نظروں کے خوف سے ڈراؤنے لگنے لگنا۔

۞ دوپٹہ کھول کر اوڑھنا زیادہ پسندیدہ ہوجانا اور اگر سر پر رکھا ہوتو کیا کہنے۔ خود کو زیادہ معزز محسوس کرنے لگنا۔

۞ ہیئر اسٹائل بنوانے کی بجائے چھوٹے بال کٹوانا یا پھر چیٹا کس کر یا جوڑا بنانا۔

۞ بار بار اپنی ہم عمروں کو بوڑھا کہنے میں تسکین ملنا۔

۞ ٹی وی دیکھتے ہوئے نیند آنے لگنا۔

۞ ہر دو گھنٹہ بعد قیلولہ کرنے کو دل کرنا۔

۞ نائٹی یا کھلے کپڑے پہن کر سارا دن پھرنا ہر مشکل کا حل نظر آنا۔

۞ اپنی کسی پرانی تصویر کو دیکھ کر یقین نہ کرنا کہ یہ ہم ہی ہیں اور پھر دل سے ایک ہُوک نکلنا کہ ''کبھی ہم بھی خوبصورت تھے''

۞ غیبت کرنا بھی ہمیشہ کی طرح محبوب تو ہوتا ہی ہے مگر پھر عمر کے لحاظ سے شرم

آجانا کہ چلو چھوڑو آگے خدا کو بھی جواب دینا ہے۔

۞ ضائع شدہ جائیدادوں کا غم جاگ جانا۔

۞ بیٹیوں کی خدمات پر دل میں ٹھنڈ پڑی رہنی کہ شکر ہے دل کے پھپھولے بھی پھوڑ لیتے ہیں اور خدمت بھی کروا لیتے ہیں۔

۞ نفسِ مطمئنہ تو حاصل ہونے لگتا ہے مگر ساتھ ہی بیتے ہوئے نفسِ امارّہ کے ڈر کا ٹانگ کھینچنا۔

۞ چلیں چھوڑیں اس سب کاروبارِ دنیا کو دفان کریں۔ آخرت کا غم سب سے زیادہ سر پر سوار رہتا۔

۞ ہم عصروں اور دوستوں کے بچھڑنے کی خبر پر جلد ہی انا للہ کہہ کر توجہ کہیں اور لگانے کی کوشش کرنا۔

۞ آخر میں انجام بخیر ہونے کی دعا سب سے زیادہ محبوب و پیاری اور اصلی محسوس ہونا کہ اسی دعا میں خیر ہے۔ باقی سب ہیر پھیر ہے۔

○○

اِک آہِ بندۂ مبتلا

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

مرزا غالب کے اس مشہور زمانہ شعر کی ایک فربہ انسان دُکھی دل کے ساتھ یوں تحریف کر سکتا ہے کہ:

فربہی اگر نہ ہو شامل
تندرستی ہزار نعمت ہے

نعمتِ تندرستی کا یہ شاخسانہ بھی عجب رنگ رکھتا ہے۔ ابتدا اس کی ہے خوشنما اور انتہا سراسر مضحکہ۔ یوں تو دھن دولت آنی جانی چیز ہے مگر تن کی دولت یا فربہی کچھ ایسی دولت ہے کہ جب ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں۔ دوسری قسم کی دولت کمانے کیلئے دن رات محنت کریں تو تب کہیں حاصل ہوتی ہے جبکہ اس دولت کا حصول آرام اور سکھ چین کی بنسری بجانے پر موقوف ہے اور بعض دفعہ تو بغیر کسی بنسری بجانے کے ہی مہربان ہوئی جاتی ہے۔ آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیوں میں ہے کہ زمین اپنے ہر طرح کے خزانے اُلٹ دے گی۔ لہٰذا انہی خزانوں میں سے یہ دولت بھی سوائے چند ایک کے ہر ایک کیلئے وافر مقدار میں دستیاب ہے۔

دنیا بھر میں بچے، بوڑھے اور جوان اس دولت سے جھولیاں بھر بھر کے فیضیاب

ہو رہے ہیں۔ خاصیت اس کی یہی ہے کہ اگر آ گئی تو پھر ڈیرہ جمائے گی۔ چاہے خوش ہوں یا ناخوش۔ دوسری یہ الگ بات ہے کہ اس دولت کو پانے والا خود کو نہایت بدنصیبوں میں شامل سمجھتا ہے۔

یوں تو بدنصیبی کی بہت سی اقسام ہیں مگر بدنصیبی کی یہ قسم عموماً اتنی ثقہ یا خاص نہیں مانی جاتی لیکن بات یہ ہے کہ جو تن لاگے سو تن جانے۔ یہ تو کوئی موٹوں کے دل سے پوچھے اس تیرِ نیم کش کو۔ ہر کس و ناکس کی ایسی ایسی پھبتیاں، فقرے اور نصائح سننے کو ملتی ہیں کہ جگر چھلنی ہو جائے مگر صبر کا ٹھنڈا گھونٹ پی کر مسکرانا پڑتا ہے۔ ایسے ایسے چسکورے اور آرام طلب افراد جن کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ ڈائٹنگ کیا چیز ہے اور ورزش کی حقیقت کیا ہے۔ مگر ایسے تحکمانہ لہجے میں ''کچھ کرنے'' کا مشورہ دیتے ہیں کہ دل کباب ہو جاتا ہے۔

میری ایک کرم فرما نے تقریباً مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ کچھ واک وغیرہ کیا کرو۔ پھر کچھ اتراتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تو شروع کر دی ہے۔ میں نے تھوڑا سا Impress ہوتے ہوئے کہا اچھا کدھر جاتی ہیں۔ بولیں بس یہیں گھر کی گیلری میں ہی کر لیتی ہوں آرام سے۔ (ابوڈ آف پیس کے اپارٹمنٹس کی لمبائی ملاحظہ ہو) میری نظروں میں اپنا گھنٹوں سڑکوں پر بھٹکنا گھوم گیا مگر ایک آہِ سرد بھر کر خاموشی اختیار کی۔ کھانے کے معاملے میں بھی ایک سے ایک مشورہ طعن و تشنیع کے ڈونگروں میں رکھ رکھ کر پیش کیا جاتا ہے کہ:

''سوچ سمجھ کر کھایا کرو۔ کچھ گھر والوں کیلئے بھی چھوڑ دیا کرو۔ روغنی اور تلی ہوئی

چیزیں کیوں کھاتی ہو۔ یہ کیوں کھایا۔ وہ کیوں کھایا۔ بیلنس ڈائٹ، کوئی ڈائٹنگ کلب یا کوئی Gym جائن کرلو۔ کیا ہے اگر کچھ پیسے خرچ ہو گئے۔ پتلی تو ہو جاؤ گی۔''

نہ جانے کیا کیا۔ جیسے کہ یہ بندۂ مظلوم بیچارہ بہت معصوم ہو۔ اسے کیا معلوم کہ وزن کیسے کم کیا جاتا ہے۔

ایک محترمہ بھری محفل میں بڑے ہی جاہلانہ طرزِ تکلّم اور تلفّظ میں مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگیں کہ ہاں ہماری عورتوں کو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کھانے کا دھیان رکھیں اور کچھ ورزش وغیرہ کریں۔ اور ہم اس سرِ عام دھلائی پر اُن کا منہ دیکھا کئے اور سوچا کئے کہ محترمہ آپ کہیں تو ایک کتاب لکھ کر دکھاویں ان تمام معلومات کی۔ مگر یہاں یہ مسئلہ ہے کہ جب بظاہر اس محنت کا کچھ اثر نظر نہیں آتا تو اپنے ڈیفنس میں منہ کھولنا کیسا؟ کیا بتائیں کہ ہم کن کن شدائد وضوابط سے گزرتے ہیں اور کن کن چکیوں میں اپنے آپ کو پیستے ہیں۔ لیکن اُن کا بھی کیا قصور ہے۔ اُنہیں الہام تو نہیں ہوتا کہ ہم خوامخواہ ہی اپنی جان کو عذاب میں ڈالے ہوئے ہیں۔ کیونکہ بظاہر تن وتوش تو اس کی نفی کرتا ہے۔

بس صاحبو، موٹاپا بھی کیا بری شئے ہے جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ سوائے بچپن کے دو تین سالوں کے کہ جب ہر کسی کو گلگلے بچے پیارے لگتے ہیں۔ وگرنہ ؎

عمر بھر کی پھٹکار ہے اور ہم ہیں دوستو!

شاید اسی لئے خدا تعالیٰ نے موٹوں میں بے پرواہی بھی ودیعت کردی ہے کہ تمام عمر پھبتیاں سن کر بھی بدمزہ نہ ہوں۔

زندگی کی بے انتہا آزمائشوں اور فکروں میں موٹوں کیلئے یہ موٹاپے کا اضافی فکر ایک

ایسا فکر ہے جس کا ادراک دوسرے لوگوں کو نہیں ہوسکتا۔ ہمہ وقت ایک طرح کا احساس جرم، ڈپیریشن اور غم سا سر پر سوار رہتا ہے کہ جس کا کوئی end نہیں۔ تمام عمر اپنے نفس اور جسم کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہی زندگی گزرتی ہے۔ وہ جنگ جس میں جیت کا امکان شاذ ہی ہوتا ہے اور اگر جیت ہو بھی جائے تو کب تلک؟ لیکن ایک بات ہے کہ جیت کے وہ عارضی چار دن موٹوں کی زندگی میں نہایت پُر بہار، خوشگوار اور شاندار دن ہوتے ہیں۔ یقیناً اس بے بہا خوشی کا ادراک بھی دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ اور ایسے میں لوگوں کے یہ فقرے کہ ''ارے آپ کچھ کم نظر آ رہے ہیں'' عجب کانوں میں رس گھولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ یہی چار دن تو اس شرمندہ سی زندگی کا کچھ حاصل کہے جا سکتے ہیں۔ بس کیا کہیں کہ ہائے...

بہت دشوار ہوتا ہے
ذرا سا خود کو کم کرنا
کہ موٹاپے کی کہانی کو
بیانِ بے زبانی کو
کہاں سے شروع کرنا ہے
کہاں پہ ختم کرنا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے
کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے

لیکن صاحبو! ہر چیز کے اچھے یا برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ موٹاپے جیسی بے

کار چیز بھی ایک طرح سے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ بس صرف اپنے آپ سے سمجھوتہ کر کے حکمتِ عملی طے کرنے کی بات ہے۔ میں ہمیشہ اپنے گردوپیش میں اکثر خواتین پر نظر ڈالتی ہوں تو پتہ نہیں کیوں مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ان لوگوں سے ایک طرح سے بہتر ہوں۔ اگرچہ آج کل ہر طرف عموماً اتنی ذہنی ترقی ہو چکی ہے کہ فزیکل فٹنیس اب ایک طرزِ زندگی بنتا جا رہا ہے لیکن جن زمانوں کی میں بات کر رہی ہوں ان دنوں خواتین کا ''بیگم پن'' ایک سماجی وجہِ امتیاز ہوتا تھا۔ جو خاتون جسقدر ہلنے جُلنے سے عاری ہوگی اتنی ہی اصلی بیگم کہلائے گی۔ نوکروں پر حکم چلانے اور بیٹھے بٹھائے تمام کام کروانے والی بیگمات ٹھسّے دار، رعب دار اور مدبّر سمجھی جاتی تھیں۔ مگر ہم تو چونکہ شروع سے ہی اپنے آپ سے حالتِ جنگ میں رہے لہٰذا زندگی کے اکثر کاموں میں بھاگ دوڑ اپنا شعار رہی اور پھر چونکہ ہمہ وقت گردش میں رہنے سے ہی بات بنتی تھی تو کچھ لائف سٹائل ہی ''غیر بیگمانہ'' سا ہو گیا۔ اب چاہے لوگ میرے حدود وار بعہ کو قابلِ اعتراض ہی سمجھیں مگر گھٹنے پکڑ کر بیٹھی ہوئی، تھکے تھکے انداز میں چلتی ہوئی، جوڑوں کے دردوں اور سوجے ہوئے پاؤں والی خواتین کو دیکھ کر مجھے موٹاپے کا شکر گزار ہونا پڑتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو زندگی کس قدر بور اور بے رنگ ہوتی۔

ان خوانین کے نصیب میں لمبی واک اور لمبی سیروں سے ملنے والی خوشی اور تازگی کہاں۔ ان سیروں کے دوران ذہنی یکسوئی، عبادات کی لذت اور خیالات کی اُڑان۔ خدا تعالیٰ کی کائنات کو دیکھنے اور لطف اُٹھانے کے مواقع کہاں۔ ہر قسم کے یوگا اور ورک آؤٹ کو آزمانے سے جو دورانِ خون کی تازگی ملتی ہے یا سانسوں کی مشقوں سے نئے

نئے تجربات کرنے اور ان کے سمجھنے کا جو ادراک ہوتا ہے، وہ ہمارے زمانے کی عام خواتین کی بیگماتی طرزِ زندگی میں تقریباً عنقا تھیں۔مگر بھلا ہو میرے موٹاپے کا مجھے بہت سی باتوں میں بہت بامُراد کرگیا۔ زندگی کا ایک ایسا حسین رُخ مجھے نصیب ہوا جو شائد پتلوں کو حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مزے سے کھاتے ہیں۔آرام سے رہتے ہیں اور موٹوں کی طعن وتشنیع سے دھجیاں اُڑاتے ہیں۔

○○

خوش رہیں۔مُسکرائیں

خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است

اگر ہم اپنے آس پاس، ادھر اُدھر نظر دوڑائیں تو ہر جگہ ہر مقام پر مایوس، ناامید اور قنوطی لوگ نظر آتے ہیں۔ڈپریشن اس صدی کی آخری دہائی کی سب سے بڑی لعنت بن کر اُبھری ہے۔تمام دنیا مغربی مشینی زندگی اور سرمایہ دارانہ طرزِ حیات کے بوجھ کے نیچے دبی پڑی ہے۔اس کے علاوہ یہاں ہم لوگوں کو کچھ تو وطن عزیز کو چھوڑنے کی وجہ سے تنہائیوں، اداسیوں اور جدائیوں نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اور کچھ غم روزگار نے پریشان کر رکھا ہے۔ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا دکھائی دیتا ہے اور بظاہر خوش باش نظر آنے والا بھی ''اک ذرا چھیڑ کے دیکھ تشنۂ مضراب ہے ساز'' کے مصداق جلد ہی اپنی خوشی کے تانے بانے بکھیر دیتا ہے۔

پچھلے چند سالوں سے اپنے سمیت اور بھی بہت سے لوگوں کو دیکھ کر میں اکثر سوچتی ہوں کہ یہ سب کچھ زندگانی کا ہی حصہ ہے اور آزمائشیں انسان پر آنی بھی ضرور ہیں کیونکہ قرآن شریف میں بھی خدا تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ ہم اچھے یا بُرے حالات سے لوگوں کی آزمائش کرکے رہیں گے تو پھر ہم ان حالات کے ساتھ جینا کیوں نہیں سیکھ لیتے۔

ہم زندگی کو ایک دائمی مصیبت کیوں سمجھنے لگے ہیں! ہم کیوں ناخوشگوار حالات،

بدنصیبی کے واقعات ،غلطیوں اور خامیوں کے انبار اپنے ہمراہ لئے پھرتے ہیں ۔ہم کیوں ایسی چیزوں کے زندہ رکھنے پر اصرار کرتے ہیں جنہیں مار ڈالنا ہی بہتر ہے۔ انہیں تو خاک میں بہا دینا چاہئے اور قطعاً بھول جانا چاہئے کیونکہ جب ہم اپنی بدنصیبی اور ناکامیوں کی داستان دہراتے ہیں تو اپنی روح قلب پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان ناکامیوں کو محو کر دینا چاہئے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے مٹا دینا چاہئے۔ہم کیوں نہ دھوپ گھڑی والا ماٹو اختیار کریں کہ ہمیں صرف روشنی کے گھنٹوں کا حساب یاد رکھنا ہے۔ اندھیرے سے ہمیں کیا کام۔ اگر ہم زیادہ سے زیادہ اور بہترین کام کرنا چاہتے ہیں تو اپنے دل و دماغ کو روشنی، حقیقت، سچائی، حسن وخوبصورتی، نیکی اور مسرت سے روشن اور منور رکھیں۔ جو چیز ہمیں آزردہ کرے، ہماری طبیعت پر ناگوار گزرے ،اسے مٹا ڈالیں۔ مٹانے کا بہترین طریقہ جو مجھے سمجھ آیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مصروف رکھا جائے۔ اپنے آپ کو اس قدر مصروف رکھیں کہ پریشان ہونے کا وقت ہی نہ ملے۔ کیونکہ ہم پریشان تب ہی ہو سکتے ہیں جب ہمارے پاس پریشان ہونے کیلئے وقت ہو۔ جی بھر کے کام کریں۔ اپنی پسند کے مشاغل اپنائیں، گھر کو سجائیں بنائیں۔ اچھے اچھے کپڑے بنائیں اور پہنیں، جماعت کا کام کریں، کہیں رضا کارانہ طور پر خدمت انجام دیں، لوگوں کی مدد کریں، اپنی پسند کا گانا سنیں ، لکھنے پڑھنے کا شوق اپنے اندر پیدا کریں، شعروشاعری میں دلچسپی لیں، ٹی وی دیکھیں۔ گھر میں ورزش کی مشین رکھ لیں، ساتھ ساتھ ایم ٹی اے دیکھیں ۔ خدا تعالیٰ نے آپ کیلئے دل لگی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

کسی دوست کے ہاں جا کر گپیں لگائیں، پسند کی کتابیں پڑھیں یا پھر پڑھتے پڑھتے نیند کے مزے لیں۔ جب طبیعت، ہلکی پھلکی ہو جائے تو باقی ماندہ کام کو ہاتھ لگائیں۔ آپ کی کارکردگی بہت بہتر ہوگی اور پھر سب دواؤں سے بڑھ کر دوا ذکرِ الٰہی اور عبادت ہے۔ قرآن شریف میں بھی آیا ہے کہ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىٕنُّ الْقُلُوْبُ (سورۃ الرعد:29)

''سنو! اللہ ہی کے ذکر سے دل اطمینان پکڑتے ہیں۔''

خدا تعالیٰ کی یاد اور عبادت سے وہ اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے جو کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔

میں یہاں اپنی ایک بزرگ خاتون کا ذکر کروں گی۔ وہ رات کے پچھلے پہر سے لیکر دن کے 10 بجے تک مسلسل عبادت میں مصروف رہتی تھیں اور پھر یوں کھلکھلاتی ہوئی اپنے کمرے سے برآمد ہوتی تھیں کہ سارا گھر ان کی مسکراہٹوں کے نور سے جگمگا اُٹھتا تھا۔

اس سلسلے میں میرا اپنا آزمودہ نسخہ یہی ہے کہ جب بھی کوئی مرحلہ درپیش ہو، دو نفل پڑھ کر سجدے میں خوب دعا کر لیتی ہوں اور پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتی ہوں۔ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہر کام میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کریں۔ اور پھر دعا کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کریں اس سے طبیعت کا اضطراب کم ہو جاتا ہے۔

ہمیں چاہئے کہ اپنی تکالیف اور مصائب کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ ہماری

مشکلات کی جس قدر کم لوگوں کو خبر ہوگی اتنا ہی ہمارے لئے بہتر ہوگا۔آپ لوگوں کے استہزاء سے بچ جائیں گے۔ کیونکہ لوگ اُسی کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں جو خوش خلق ہواور ہر طرف خوشیوں اور مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتا چلا جائے۔ اسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ جاڑے کی دھوپ کی طرح ہر کوئی اسے پیار کرتا ہے۔خندہ جبین رہیں۔ مسکرائیں کہ مسکرانے پر کوئی خرچ نہیں ہوتا۔اس سے آپ کی زندگی پر گہرا اثر پڑے گا۔ بے شک آپ کا دل مصائب سے چھلنی ہو چکا ہےاور غموں نے آپ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ پھر بھی آپ ہر وقت مسکراتے رہیں۔خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی کا جامہ پہنے رکھیں تو آپ اپنی زندگی میں ایک نیا انقلاب محسوس کریں گے۔لوگوں کا کیا ہے وہ ہنسنے والوں پر بھی اور رونے والوں پر بھی نقطہ چینی کرتے ہیں۔تو پھر اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کریں ایسا کرنے سے آپ اپنی زندگی میں ایک نیا انقلاب محسوس کریں گے۔

اس موقع پر مجھے اپنی خوش دامنہ یاد آتی ہیں جو واقعی ایک آئیڈیل شخصیت تھیں۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہنا اور اپنی پریشانیوں اور غموں کو صرف سجدوں میں خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرنا آپ کا معمول تھا۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میں تو اپنا غم صرف خدا تعالیٰ کو بتاتی ہوں۔ایک دفعہ ایک محفل میں خوب لطائف وظرائف سے ماحول کو زعفران زار بنا رکھا تھا تو کسی نے کہا آپا! آپ کی کیا بات ہے نہ کوئی غم نہ فکر۔خوب خوش رہتی ہیں۔ کہنے لگیں اگر تمہارا یہ خیال ہے تو سنو۔اس کے بعد ایک لمبی چوڑی فہرست اپنی پریشانیوں اور غموں کی گنوائی تو سب کو بہت حیرت ہوئی کہ یہ ہنسی کا مرقع شخصیت اتنی دکھی بھی ہوسکتی

ہے۔

اس دنیا میں خدا تعالیٰ نے خوشی کی تقسیم برابر رکھی ہے۔اس میں امیر وغریب، چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہر ایک کو اپنے حصے کے غم اور خوشیاں مل کر رہتی ہیں۔ بات یہ نہیں کہ آپ کو کیا حالات درپیش ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جیسے بھی حالات درپیش ہوں آپ کا ردعمل کیا ہے۔ حوصلہ،صبر وشکر اور دعا بحران سے نپٹنے اور نکلنے کے بہترین ہتھیار ہیں۔ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو یاد رکھیں اور انہیں گن گن کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ ہم اس کی بے انداز نوازشوں کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن کوئی تکلیف آ جائے تو گلے شکوے آنسو اور آہیں ہمارا معمول بن جاتا ہے۔ بہرحال ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراھیم:8)

''اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں ضرور تمہیں بڑھاؤں گا۔''

اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا تو کیوں نہ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں اور انہیں یاد رکھیں اور صبر اور دعا کے ساتھ اس سے مدد مانگتے رہیں۔ خدا تعالیٰ نے مومنوں کی یہی شان بیان فرمائی ہے کہ وہ صبر وشکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت طلب کرتے رہتے ہیں۔

ایک مغربی خاتون کا کہنا ہے کہ میں ہر ممکن طریقے پر خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں ہمیشہ خوشی اور مسرت کے خیالات سوچتی ہوں۔ صرف منتخب کتابیں پڑھتی ہوں۔ کھڑکیوں میں شش پہلو بلور کے ٹکڑے آویزاں کرتی ہوں تاکہ میرا کمرہ قوس

قزاح کے خوبصورت اور جاذب نظر رنگوں سے بھرا رہے۔

اگر ہم سب پختہ ارادہ کرلیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، دن ہو یا رات، رنج ہو یا راحت، آپ ہمیشہ خوش رہیں گے، مسرور رہیں گے، پُرامید رہیں گے۔ دنیا میں اپنے سے کمزور اور لاچار لوگوں کی مدد کریں گے۔ ہمیشہ زندہ دل اور خوش اخلاق رہیں گے تو زندگی کی ہر کٹھن منزل آسان ہوتی چلی جائے گی۔ کیونکہ میرے نزدیک یہی خوش مزاجی کا اعلیٰ فلسفہ ہے۔ اگر آپ میں یہ قوت موجود ہے کہ آپ خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی کی نورانی شمع اپنے سینے میں ہمیشہ فروزاں رکھ سکیں تو کارزار حیات کے بوجھ خواہ کتنے بھی بھاری ہوں وقت پڑنے پر ان کو اٹھانے میں چنداں دشواری نہیں ہوگی۔

OO

مولوی صاحب

برسوں پہلے کی بات ہے مجھے کچھ عرصہ کیلئے اپنے گاؤں جا کر رہنا پڑا۔ پہلی دفعہ دیہات میں چند ماہ جا کر رہنے کا تجربہ میرے لئے خاصہ نیا تھا۔ شہری ماحول سے یکا یک دیہاتی ماحول میں جانا جیسے آسمان سے زمین پر پٹخے جانے کے مترادف تھا۔ یقیناً یہ بہت خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں قسم کا تجربہ تھا۔ مگر یہ بات ان زمانوں کی ہے جب دیہات واقعی دیہات ہوتے تھے جبکہ آج کل تو یوں لگتا ہے جیسے وہ شہروں سے بھی زیادہ ایڈوانس ہو چکے ہیں۔ بہرحال آج سے چالیس پچاس سال قبل کے گاؤں واقعی اصلی گاؤں ہوتے تھے جن میں ماڈرن زمانے کی کوئی رمق دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لوگ زمین کے دوسرے قدرتی ذرائع کے ساتھ ساتھ زمین کی ہی کوئی پیداوار ہیں۔

یہ 70ء کی دہائی کی بات ہے۔ اُس وقت تک مشینیں ابھی اتنی عام نہیں ہوئی تھیں۔ اگر چہ تھریشر کا استعمال کہیں کہیں ہونے لگا تھا۔ مگر عمومی طور پر ابھی برسوں پرانے مروجہ طریق پر ہی گندم کی کٹائی اور چھڑوائی ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے گندم کے دانے کی اہمیت پتہ چلی کہ اس کو حاصل کرنے کیلئے کس قدر مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ گندم اُگانا، کاٹنا اور پھر اس کو بغیر مشینوں کے تپتی دوپہروں میں کس قدر محنت اور مشقت سے صاف کرنا۔ غریب کیلئے ایک ایک خوشے کی کتنی اہمیت ہے۔ مئی جون میں

تقریباً سارا گاؤں خالی ہو جاتا تھا اور مرد، عورتیں، بچے سب گندم کی چھڑوائی اور سنبھالنے میں جُٹ جاتے تھے۔عورتیں کٹائی کے بعد گرے پڑے گندم کے خوشے اور سٹّوں کے چننے میں سارا دن صرف کرتی تھیں۔اور شام کو وہ ان سٹّوں کا ایک گٹّا دن بھر کی کمائی کے طور پر گھر لاتی تھیں۔اور میں اس قدر دُکھ سے سوچتی کہ ہمیں ان چند سیر گندم کی کبھی قدر ہی نہیں ہوتی جبکہ ان لوگوں کیلئے یہ ایک گٹّا ہی دن بھر کی کمائی ہے جس میں سے بمشکل کچھ کلو گندم ہی نکلتی ہوگی۔

اسی طرح مجھے پہلی دفعہ پتا چلا کہ راکھ ایک طرح سے کپڑے دھونے والے ڈٹرجینٹ کا کام بھی کرتی ہے۔وہ اس طرح کہ راکھ کو رات کو پانی میں بھگو کر رکھا جاتا ہے اور صبح اس الکلائن والے پانی کو نتھار کر کپڑے دھو لئے جاتے یا پھر کاسٹک سوڈا پانی میں اُبال کر کپڑے دھو لئے جاتے ہیں۔صابن شاذ ہی نظر آتا تھا۔

فوج کے کمانڈوز کے ماٹو Live on the Ground کے اصول پر وہ صرف اور صرف زمین کے وسائل پر ہی زندگی کا بیشتر حصہ گزارتے تھے۔لیکن خوب خوش اور مطمئن رہتے تھے۔پہلے پہل تو یوں لگا کہ جیسے میں ایک کنوئیں میں قید کر دی گئی ہوں اور اب رہائی کی نہ جانے کیا صورت ہوگی کہ میں اپنی اصل دنیا میں لوٹ جاؤں۔ بہرحال جب کچھ عرصہ بعد گھبراہٹ کی اس ابتدائی صورتحال سے ''بحالی'' ہوئی تو بحالتِ مجبوری حالات سے سمجھوتا کرنے کا سوچا کہ جب رہنا ہی ہے تو رو کر گزارنے کی بجائے ہنس کر گزار لینی چاہئے۔ چنانچہ کچھ حیرت اور دلچسپی کے ساتھ لوگوں کی لائف سٹائل کا جائزہ لینا شروع کیا۔جوں جوں اس ماحول کا حصہ بننے کی کوشش کی تو آہستہ آہستہ سب

کچھ اچھا اور دلچسپ سا لگنے لگا۔ چنانچہ میں بھی ایک نیم قسم کی ''جٹی'' بن کر اس ماحول میں ایسے ایڈجسٹ ہوئی جیسے یہاں کی ہی رہنے والی ہوں اور پھر اس وقت کو بھرپور مصروفیت اور دلچسپی کے ساتھ گزارا۔ مجھے یوں لگا جیسے کیمپنگ پر آئی ہوں اور ہر کام ایک ایڈونچر ہے جسے سرانجام دیتے ہوئے ایک خوشی اور Thrill سی محسوس ہوتی۔

بہت دلچسپ سادہ مگر پیچیدہ یہ دیہاتی زندگی اپنے اندر کئی متضاد رنگ لئے ہوتی ہے جو کبھی سرشار کرتے ہیں اور کبھی بےزار۔ یہاں سب رہنے والوں کے تانے بانے ایک دوسرے سے اس قدر پیوست ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر گزارا نہیں۔

زمینداروں اور کارکنان کا تعلق ایک دوسرے سے مضبوط مربوط ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ محبت و نفرت، ہمدردی، عداوت بھائی چارہ اور شریکا بازی سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور پھر کم علمی اور جہالت اس پر مستزاد ہوتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں پر سب اچھا نہیں ہوتا، شائد...

اس ماحول کا حصہ بنتے ہوئے میرے لئے سب سے زیادہ حیران کن شخصیت ایک ایسا کردار تھا جس کے گرد تمام گاؤں گھومتا تھا۔ وہ ایک فرد واحد جو اس معاشرے کو ہر طرح متوازن رکھنے میں بےحد کامیاب تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسکی اہمیت اور ضرورت مسلم تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ امرت دھارا قسم کی شخصیت کیسے ان کے ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہے۔

جی ہاں وہ شخصیت وہاں کے ''مولبی ہوروں'' کی تھی (یعنی مولوی صاحب پنجابی میں) وہ مولوی صاحب ان کے دینی دنیاوی، معاشرتی و سماجی نیز طبّی مسائل بیک وقت

حل کرنے میں مصروف رہتے تھے اور ماحول میں ایک طرح کی آسودگی اور اطمینان سا پایا جاتا کہ اگر مولوی صاحب ہیں تو پھر خیر ہے۔لوگ ان کی بے حد عزت و اکرام کے ساتھ ساتھ اطاعت بھی بہت کرتے تھے۔ چنانچہ اس طرح مولوی صاحب ان کے خاندانی جھگڑے حل کرنے، مطلقہ اور بیوہ خواتین کی شادیاں کروانے اور آپس کی لڑائی جھگڑے اور عداوتیں ختم کروانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔

سب سے زیادہ جس بات پر مولوی صاحب یاد کئے جاتے وہ اُن کی ڈاکٹری تھی۔ کوئی بھی چھوٹی بڑی تکلیف مولبی صاحب کی دوائی سے ٹھیک ہوجاتی تھی۔انتہائی تیز بخار میں مولوی صاحب کا ٹیکہ تیر بہدف ہوتا اور میں ایک ڈاکٹر کی بیٹی ہونے کے ناطے اکثر سوچتی کہ آخر اس ٹیکے میں کیا ہے جو ہر مرض کی دوا بن جاتا ہے۔یقیناً اس میں اُن کی روحانی قوت کارفرما ہوتی ہوگی اور لوگوں کا نفسیاتی اطمینان جو مل کر شفا کا باعث بنتا ہوگا۔ بہرحال مولوی صاحب کا ٹیکہ آج بھی مجھے کسی ایسی ہی کراماتی شفاء پر یاد آجاتا ہے۔

اس سے پہلے جو معلمین وہاں رہ کر جاچکے تھے ان کی باتیں اور اُن کی یادیں لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھیں اور بہت اچھی طرح ان کا ذکر خیر ہوتا کہ فلاں مولوی صاحب کے زمانے میں فلاں جھگڑا حل ہوا۔فلاں مولوی صاحب نے دو متحارب گروہوں میں صلح کے ساتھ شادیاں بھی کروائیں۔فلاں مولوی صاحب نے وقار عمل کے ساتھ پل بنوایا۔ فلاں مولوی صاحب کے زمانے میں صد فیصد چندہ دہندگان میں بہت ترقی ہوئی وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ یہ مولوی صاحب تحریک وقف جدید کے تحت اکثر پاکستانی دیہاتوں میں متعین کئے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور ساتھ ساتھ ان کی تربیت

بھی کریں اوراس کے علاوہ طبی امداد بھی کر سکیں۔

میرے دل سے حضرت مصلح موعودؓ کیلئے بے حد دعا نکلی کہ ہزاروں رحمتیں ہوں اس بطلِ جلیل پر جس کی وسیع النظری اور دور بینی نے اس کم علم اور دکھی انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے اتنا جامع منصوبہ سوچا اور پھراس پر عمل بھی کروایا۔ جن دنوں یہ تحریک وقف جدید شروع ہوئی اُن دنوں تو یہ کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔

سچی بات ہے کہ اس سے قبل مجھے تحریک وقف جدید کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں سوائے اس کے کہ ایک چندہ ہے جو ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ چندہ کہاں اور کیسے خرچ ہوتا ہے اوراس کی افادیت کیا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا جب تک کہ خود اس ماحول کا حصہ نہیں بنی۔ مگر ایسے موقع تو کم ہی دستیاب ہوتے ہیں بلکہ اگر یہ مواقع مل بھی جائیں تو کون ہے جو دیہات میں ایک ہفتہ سے زیادہ جا کر رہنا پسند کرے۔

اسی طرح یہاں بھی جماعتی کاموں کے دوران جب چندہ وقف جدید کی تحریک کی جاتی ہے تو اکثر کا میری طرح ایک ہی خیال ہوتا ہے کہ ایک چندہ ہے جو ادا کرنا ہے چنانچہ میں اکثر سوچتی تھی کہ لوگوں کو بتاؤں کہ اگر تحریک جدید دنیا میں دعوت الی اللہ کا کام کرتی ہے تو تحریک وقف جدید مخصوص ممالک و علاقہ جات میں تبلیغ کے ساتھ ساتھ افراد کی تعلیم و تربیت کا شعبہ سنبھالتی ہے۔

یہ سکیم خدا تعالیٰ کے منشا کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے 27 دسمبر 1957ء کو جاری فرمائی۔ آغاز میں یہ تحریک پاکستان انڈیا اور بنگلہ دیش کے لئے تھی مگر 1985ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے اس تحریک کو ساری دنیا کی جماعتوں کیلئے لازمی قرار دیا۔

وقف جدید دو اجزاء پر مشتمل ہے:

(1) واقفین زندگی اور معلمین کے ذریعہ تربیت اور دعوت الی اللہ کا نظام

(2) مالی قربانی کا نظام

حضرت مصلح الموعودؓ نے جلسہ سالانہ 27 دسمبر 1957ء کے موقع پر جماعت کو وقف جدید کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

’’میری اس وقف سے غرض یہ ہے کہ پشاور سے لیکر کراچی تک ہمارے معلمین کا جال پھیلا دیا جائے اور تمام جگہوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر یعنی دس دس پندرہ میل پر ہمارا معلم موجود ہو اور اس نے مدرسہ جاری کیا ہوا ہو یا دوکان کھولی ہوئی ہو اور سارا سال اس علاقے کے لوگوں میں رہ کر کام کرتا رہے اور گو یہ سکیم بہت وسیع ہے۔ میں نے خرچ کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع میں صرف دس واقفین لینے کا فیصلہ کیا ہے ممکن ہے بعض واقفین افریقہ سے لئے جائیں یا اور غیر ملکوں سے لئے جائیں مگر بہرحال ابتدا دس واقفین سے کی جائے گی اور پھر بڑھاتے بڑھاتے ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جائے۔

پس میں جماعت کے دوستوں سے کہتا ہوں کہ وہ جتنی قربانی کر سکیں اس سلسلہ میں کریں اور اپنے نام اس سکیم کیلئے پیش کریں۔ اگر ہمیں ہزاروں معلم مل جائیں تو پشاور سے کراچی تک ہم دینی تعلیم کے لحاظ سے سنبھال سکتے ہیں اور ہر سال دس دس بیس بیس ہزار اشخاص کی تعلیم و تربیت

کر سکیں گے۔‘‘ (روز نامہ الفضل، ربوہ۔16؍فروری1958ء)

’’پس میں جماعت کے دوستوں کو ایک بار پھر اس وقف کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ ہماری جماعت کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر وہ ترقی کرنا چاہتی ہے تو اس قسم کے وقف جاری کرنے پڑیں گے اور چاروں طرف رشد اور اصلاح کا جال پھیلانا پڑے گا۔ یہاں تک کہ پنجاب کا کوئی گوشہ اور کوئی مقام نہ رہے جہاں رشد و اصلاح کی کوئی شاخ نہ ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کوئی مربی ایک ضلع میں مقرر ہو گیا اور وہ دورہ کرتا ہوا ہر جگہ گھنٹہ دو گھنٹے ٹھہرتا ہوا سارے ضلع میں پھر گیا۔ اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ ہر گھر ہر جھونپڑی تک پہنچنا پڑے گا اور یہ اسی وقت ہی ہو سکتا ہے جب میری اس نئی سکیم پر عمل کیا جائے اور تمام پنجاب میں بلکہ کراچی سے لیکر پشاور تک ہر جگہ ایسے آدمی مقرر کر دیئے جائیں جو اس علاقہ کے لوگوں کے اندر رہیں اور ایسے مفید کام کریں کہ لوگ ان سے متاثر ہوں۔ وہ انہیں پڑھائیں بھی اور رشد و اصلاح کا کام بھی کریں اور یہ جال اتنا وسیع طور پر پھیلایا جائے۔ اور اس کے ذریعہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ کے لوگوں تک ہماری آواز پہنچ جائے بلکہ ہر گاؤں کے ہر گھر تک ہماری پہنچ ہو۔ پس جب تک ہم اس مہا جال کو نہ پھیلائیں گے اُس وقت تک ہم کامیاب نہیں ہوں گے۔‘‘

(روز نامہ الفضل، ربوہ۔11؍جنوری1958ء)

اب آپ میرے اس تجربے کے تناظر میں اگر ان ارشادات پر غور کریں تو ان کی

عملی تفسیر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔قرآن کریم میں بار بار ''بَلِّغْ'' یعنی پیغام پہنچانے اور پھیلانے کا ذکر آتا ہے تو اکثر دل میں شرمندگی سی ہوتی ہے کہ اس حکم کو جاننے کے باوجود ہم تبلیغ یا تربیت نہیں کرتے یا کرنہیں سکتے۔اس کا گناہ تو اپنے سر لیتے ہی ہیں لیکن اس احساس گناہ کو کم کرنے کیلئے کم ازکم ان لوگوں کی ہی مدد کریں جو یہ کام کررہے ہیں تو شاید یہ احساس ندامت کم ہو سکے۔تحریک جدید اور وقف جدید دونوں ہی ایسی تحریکات ہیں جو اس فریضہ کو سرانجام دینے کیلئے بہت موزوں ہیں۔ چنانچہ ہماری پوری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم اس کیلئے چندہ اپنی استطاعت سے بھی بڑھ کر ادا کریں تا کہ خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کچھ حصہ دار تو ٹھہر جائیں۔اسی طرح نئ نسل کی تربیت ہمارے لئے ان ملکوں میں ایک بڑا چیلنج ہے۔اتنا بڑا کہ بعض دفعہ تو سوچ کر ہی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ایک طرح سے ہمارے وہ بچے جو خدا تعالیٰ رسول اور والدین کی اطاعت کرتے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں ان کیلئے تو میں اکثر کہتی ہوں کہ اصل جہاد تو یہ کررہے ہیں۔اس بحرِ ظلمات میں جماعت کے سفینے پر ثابت قدمی سے جمے رہنا ایک بہت بڑا جہاد ہے۔ اس کا ادراک بھی صرف ان لوگوں کو ہی ہوسکتا ہے جو اس سوسائٹی میں باہر نکل کر کام پر جاتے ہیں۔گھروں میں بیٹھ کر بچوں کو وعظ نصیحت کراتے رہنا اگر چہ جہادِ اصغر ہے مگر اصل درپیش مسائل کا سامنا کرنا انہی کا حصہ ہے۔جن کی اکثریت خدا کے فضل سے ان مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے۔

اس مسئلے پر نئ نسل کیلئے خلفاء وقت کے ارشادات ان کی تربیت میں والدین کی بہت مدد کرتے ہیں۔ چندہ وقفِ جدید میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ہر بچے میں

قربانی کی روح پیدا کرنے کیلئے اپنے جیب خرچ میں سے صرف آٹھ آنہ اس چندے میں دینے کیلئے کہا اور اس طرح اطفال و ناصرات میں شروع سے ہی مالی قربانی کا شوق ابھارا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے بھی بچوں کو جیب خرچ اور عیدی وغیرہ میں سے اور کبھی کبھی برگرز کا چسکہ قربان کر کے وقف جدید میں چندہ ادا کرنے کو کہا۔ اگر چہ یہ قربانی ان کیلئے زیادہ نہیں مگر صرف ایک جذبہ ابھارنے اور عادت ڈالنے کیلئے بہت بڑا نسخہ ہے۔ جو کہ تمام عمر اُن کو مالی قربانیوں کی عادت ڈالتا چلا جائے گا۔ چنانچہ ان ارشادات کی روشنی میں وقف جدید کا چندہ اطفال و ناصرات کے چندے کے نام سے احمدی بچوں کی پہچان بن گیا ہے اور یہ بچوں کا جوش اور جذبہ ہے کہ پاکستان میں وقف جدید میں بچوں کی شمولیت بڑوں کی شمولیت کا نصف ہے۔

کینیڈا میں ان کی شرح مجاہد صف اول 100 ڈالر سالانہ، مجاہد صف دوم 50 ڈالر سالانہ اور ننھے مجاہدین کا 25 ڈالر سالانہ ہے۔ اور یہ چندہ ان بچوں کی زبان میں Big Deal نہیں ہے۔

سیرت النبیؐ ایک ایسا موضوع ہے جس کو پڑھتے ہوئے اُس زمانے میں پیدا ہونے کی خواہش اُبھرتی ہے کہ کاش ہم بھی اس زمانے میں ہوتے تو ہمیں بھی رسول کریم ﷺ کی صحبت میسر ہوتی اور ہم بھی یونہی ہر طرح کی قربانی کرتے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اگر ہمیں وہ زمانہ نہیں ملا تو حضورؐ کے غلام کا زمانہ تو ملا، ان کے خلفاء کا زمانہ تو ملا۔ ہم براہ راست ان کی صحبت سے فیضیاب ہوئے لیکن یہ خیال بھی رکھنا چاہئے کہ اس دور کے

برکات سے حصہ لیتے ہوئے کیا ہم اُن کی پکار پر لبیک بھی کہہ رہے ہیں یا نہیں۔ جن تقویٰ کی باریک راہوں پر ہمیں چلانا چاہ رہے ہیں ہم ان پر چل بھی رہے ہیں یا نہیں اور نفس کی تطہیر کیلئے جن مالی قربانیوں کی تحریک کرتے ہیں کیا ہم اُس پر خلوص دل سے لبیک کہہ رہے ہیں؟ جیسے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''چندوں کی تحریک تو جماعت میں ہمیشہ سے ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی کہ ایمان کی مضبوطی کیلئے یہ ضروری ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعودؑ نے قران کریم کی تعلیم کے مطابق ہمیں بتایا ہے۔ دُنیا کی تمام منصوبہ بندیوں میں مال کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ اس کا بہت زیادہ دخل ہے اور تمام منصوبہ بندی جس میں مال دین کی مضبوطی کیلئے خرچ ہو رہا ہو اور جس کے خرچ کرنے والے کو اللہ تعالیٰ یہ ضمانت دے رہا ہو کہ تمہارے خوف دور ہو رہے ہوں گے اور اجر بھی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اتنا اجر ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں تو اس سے زیادہ مال کا اور کیا بہتر استعمال ہوسکتا ہے... حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں کہ بڑی بڑی بڑی سلطنتیں بھی آخر چندوں پر ہی چلتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی سلطنتیں زور سے ٹیکس لگا کر وصول کرتی ہیں اور یہاں ہم رضا اور ارادے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ بندے کی مرضی پر چھوڑ کر اجر بھی بے حساب دیتا ہے۔ پابندی نہیں کر رہا کہ اتنا ضرور دینا ہے۔ چھوڑ بھی بندے کی مرضی پر رہا ہے۔ ساتھ فرما رہا ہے جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا اجر بھی دوں گا۔ صرف یہ ہے کہ خرچ کرنے کی

نیت ہونی چاہیئے اس سے زیادہ سستا اور عمدہ سودا اور کیا ہو سکتا ہے۔‘‘

(الفضل انٹرنیشنل ۔2رفروری تا8رفروری2007ء)

تو صاحبو خدا کی راہ میں جتنا دو گے اُس کا حساب اجر تو خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اور خدا تعالیٰ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ہم سب ذاتی تجربے کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جتنا دیا اُس سے کئی گنا زیادہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا۔ برکت تو پڑتی ہی تب ہے جب چندہ کی ادائیگی آپ کو ماہانہ آمدنی میں سے ہو جاتی ہے۔ میرے ایک کزن تو اکثر کسی بھی مد میں خرچ کرتے ہوئے یعنی چندہ یا کسی کی مالی امداد یا صدقہ تو وہ اس یقین سے دیتے ہیں کہ دس گناہ زیادہ ملے گا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ میرا یقین خدا تعالیٰ کبھی ٹوٹنے نہیں دیتا۔ خدا تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے ساتھ اس کے یقین کے مطابق ہی سلوک کرتا ہے۔ ہمیں خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے کیلیئے اچھے عمل ہی کرنے چاہئیں۔ اُس کی رضا حاصل ہو جائے تو دس گنا کیا دنیا جہان کی نعمتیں بھی حاصل ہو جائیں تو ہیچ ہیں۔ بس خدا تعالیٰ کے پیار اور رضا کی نظریں پڑنی چاہئیں ورنہ اس کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔

بقول مرزا غالب ؎

می شیشہ بگذار و بگذر من، ہمانہ من بلکہ ایں انجمن

نمودسیت کان را بود بود ہیچ، زیاں ہیچ و سرمایہ و سود ہیچ

یعنی شراب شیشہ و میرا خیال بھی چھوڑو۔ کیونکہ نہ صرف میں بلکہ یہ انجمن یعنی (دنیا) صرف ایک نمود ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کا سرمایہ بھی ہیچ اس کا نفع بھی ہیچ ہے۔ ○○

چیّا چیّا

بات کچھ یوں ہے کہ جنوبی امریکہ میں دو عظیم تہذیبیں گزری ہیں جن کی غیر معمولی قوت، طاقت اور ان کی Super Human کارناموں سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اُن کا طرزِ تعمیر، سائنسی معلومات، غیر معمولی دماغی اور جسمانی صلاحیتوں کی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ 'مایا' تہذیب کا کیلنڈر دُنیا میں بہت مشہور رہا ہے جس میں دُنیا کی عمر اور اس میں مختلف وقتوں میں ہونے والے واقعات کی بہت سی پیشگوئیاں کی گئیں جو اکثر و بیشتر پوری ہوئیں بلکہ اُن کی قیامت تک کے بارے میں بھی پیشگوئیوں پر لوگ یقین رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کی اسقدر عظیم تہذیب کی بنیاد ایک نہایت چھوٹے سے کالے اور سفید بیج کی مرہونِ منت تھی جس کو کھانے سے اُنہیں جسمانی اور دماغی قوت و طاقت ملتی تھی جو کہ مافوق الفطرت سمجھی جاتی تھی۔

میرا آج کا موضوع بھی اس ننھے منے مہین بیج کے متعلق ہے جو ابھی ماضی قریب میں ہی دریافت ہوا ہے یا یوں کہیں کہ زیرِ غور آیا ہے اور جب آیا ہے تو دنیا کو حیران کر گیا ہے۔ گوئٹے مالا، میکسیکو اور جنوبی امریکہ میں پیدا ہونے والا یہ پودینے کی نسل کا پودا Sylvia Hispanica سلویا ہسپینکا کے نام سے جانا جاتا ہے جبکہ عرفِ عام میں اس چھوٹے سے کالے اور سفید بیج کا اس کی ساخت کی طرز کا ہی چھوٹا سا Cute سا نام ہے: چِیا (Chia)۔ چیا سے یوں تو میری واقفیت بہت سال پہلے ایک ٹی وی اشتہار کے

ذریعہ ہوئی۔جس میں ایک مٹی کے بنے ہوئے کھلونے کے طور پر ایک بوڑھے بابا کے گنجے سر کو دکھایا جاتا اور پھر اُس گنجے سر کے اوپر چیا کے بیج ڈال کر پانی ڈال دیا جاتا۔ اگلے دن بابا کے سر میں ڈھیروں سبزیاں اُگ آتیں اور ساتھ ہی آواز آتی:

''Chia Seeds کسی کو تحفہ بھی دیں اور گھر میں بھی رکھیں۔''

اشتہار کافی دلچسپ اور مزاحیہ سا ہوتا تھا اور پھر چیا کی آواز۔ بہر حال پھر کبھی کسی اخبار یا رسالے میں اُن کے متعلق کوئی مضمون پڑھنے کو مل جاتا مگر بات یہ ہے کہ فوڈ ریسرچ والوں کا بھی عجب عالم ہے کہ ایک سال کسی چیز کو کھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے اور دوسرے سال منع کر دیا جاتا ہے۔اس لئے میں نے Chia پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔

پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اچانک ہر طرف چیا چیا کی پکار ہونے لگی اور اُسے اس کُرۂ ارض کے سب سے قیمتی اور ملٹی پرپز فوڈ کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور اب تو یہ عالم ہے کہ ہماری صدر صاحبہ نے مجھے اس اجلاس میں انٹری ہی چیا کے حوالے سے دی ہے۔ چنانچہ آج میں چیا کا جھنڈا اُٹھائے آپ کے سامنے حاضر خدمت ہوں۔

چیا کا بیج اپنی بہت چھوٹی ساخت کے باوجود بہت زیادہ خواص و فوائد اپنے اندر رکھتا ہے جو کہ فائبر، پروٹین، اومیگا 3 اور دوسرے بے شمار وٹامنز وغیرہ سے بھر پور ہے۔ اس کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) یہ Anti Oxident جو کہ بڑھاپے اور کینسر کے سیل کو پھیلنے سے روکتا ہے۔

(۲) اس کے تمام Carbs فائبر ہوتے ہیں کیونکہ یہ پانی میں گھل کر دس سے بارہ گنا وزن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔اس لئے یہ فائبر بلڈ شوگر کو بڑھنے نہیں دیتا اور انتڑیوں میں

اچھے بیکٹیریا کی افزائش کرتا ہے اور آپ کے نظامِ انہضام کو با قاعدہ اور ریگولر کرتا ہے۔

(۳) اس کے کھانے سے جلد ہی پیٹ بھرنے کا احساس ہوتا ہے اور خود بخود زیادہ کھانے سے ہاتھ رُک جاتا ہے۔

(۴) چیا پروٹین کا بہترین ذریعہ ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کیلئے جو انڈے گوشت وغیرہ نہیں کھا سکتے۔ یعنی Vegetarians کیلئے بہت اچھا ہے۔

(۵) چونکہ یہ ہائی فائبر اور ہائی پروٹین پر مشتمل ہیں اس لئے یہ آپ کے وزن گھٹانے میں مدد دیتے ہیں۔

(۶) یہ حقیقت ہے کہ چیا میں سالمن مچھلی سے زیادہ او میگا -3 پائے جاتے ہیں۔

(۷) یہ ٹائپ ٹو ذیابطیس اور دل کی بیماریوں کو ختم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

(۸) ورزش یا Workout کرتے ہوئے یہ کسی طاقتور ڈرنک کی بجائے کھایا جائے تو Stamina یا دوڑنے کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے کیونکہ چیا کے لغوی معنی ہسپانوی قدیمی زبان میں طاقت کا ہے اور دوڑنے کیلئے یہ بہترین گردانا جاتا تھا۔ چنانچہ ایتھلیٹ اسے انرجی حاصل کرنے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔

(۹) ٹائپ ٹو ذیابطیس کے مریضوں کو جب چیا کے بیج دئے گئے تو اُن کا بلڈ پریشر 40 فیصد کم ہو گیا۔

(۱۰) آپ کی ہڈیوں کو طاقت دیتا ہے کیونکہ اس میں کیلشیم، فاسفورس، میگنیشم اور پروٹین ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ دودھ اور Dairy فوڈ نہیں لے سکتے ان کے لئے کیلشیم

حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

(۱۱) چِیا کے بیج آپ کے اچھے کولیسٹرول HDL کو بڑھاتے ہیں اور آپ کی Metabolic Health کو بہتر کرتے ہیں۔

چِیا کھانے کے طریقے:

1۔ اس کی عام خوراک ایک سے دو ٹیبل سپون ہے جو آپ صبح شام کھا سکتے ہیں۔

2۔ اسے آپ جس طرح چاہے استعمال کر سکتے ہیں مگر بہتر ہوتا ہے کہ پہلے پانی میں بھگو لیں۔ ویسے چبا کر بھی کھا سکتے ہیں۔مگر ساتھ زیادہ پانی نہ پیئیں۔ جوس میں بھگو لیں، دلیہ یا پڈنگ میں شامل کریں، پیس کر یا ثابت دہی دودھ، سبزیوں یا چاولوں پر چھڑک لیں۔

3۔ چونکہ یہ پانی میں گھل کر چکنائی اور پانی دونوں کو جذب کر لیتے ہیں اس لئے آپ اسے کسی سالن کو گاڑھا کرنے کیلئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

4۔ شامی کباب وغیرہ یا کسی کھانے کی ترکیب میں گاڑھا کرنے یا جوڑنے کیلئے انڈوں کے متبادل کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

5۔ اسی طرح پانی میں ملائیں تو یہ گھل کر GEL کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اس لحاظ سے ان کی رشتہ داری ہمارے تخم ملنگا سے بھی لگتی ہے جسے ہم گرمیوں میں فالودہ بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح یہ آپ کیلئے فالودہ یا آئس کریم میں تخم ملنگا کا متبادل بن سکتا ہے۔

اس لحاظ سے اس کے مختصراً فوائد کچھ یوں بیان ہو سکتے ہیں:

لو بلڈ شوگر، لو کولیسٹرول، دماغی طاقت یعنی Brain health، ایمیون ہیلتھ، ہڈیوں کی مضبوطی، دمہ سے بچاؤ، بڑی آنت کی صفائی، ماہواری کی دردیں، مسلز اور ٹشوز کی مرمت، نیند گہری، پراسٹیٹ کینسر سے بچاؤ، وزن کی کمی، قبض، خوبصورت بال اور ناخن وغیرہ۔

غرضیکہ اس بات میں واقعی سچائی ہے کہ اس روئے زمین پر یہ بہترین خوراک ہے۔ پتہ نہیں اب تک صیغہ راز میں کیوں تھی۔ یا اگر موجود تھی تو جلد آگے کیوں نہیں آئی۔ بہر حات اب ہمارے اجلاس میں تو آ گئی ہے۔ فائدہ اُٹھائیں۔

واقعی اگلے دن ہمارے Bulkbon Store سے چِیا ختم ہو چکا تھا۔

○○

تحریک جدید اور زمانے کے بدلتے ہوئے انداز

تحریک جدید مالی قربانی کا ایک ایسا پہلو ہے جس میں تمام مالی تربیتی اور تبلیغی تحریک کا نچوڑ ہے۔ 1934ء میں جب تمام مذہبی جماعتیں مجلس احرار کے تحت قادیان کو تباہ کرنے کیلئے تیار ہو گئیں اور ساتھ ہی انگلش گورنمنٹ نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ تب حضرت مصلح موعودؓ کے دل میں خدا تعالیٰ نے یہ تحریک ڈالی کہ پہلے جماعت کو مالی طور پر مستحکم اور متحد کیا جائے اور اُن کو اپنے فالتو اخراجات کم کر کے مختلف طریقوں سے بچت کرتے ہوئے ایک ایسے پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے کہ وہ سادہ زندگی گزارتے ہوئے اخلاقی مذہبی اور تبلیغی میدان میں آگے نکل سکیں اور اپنے اعلیٰ کردار سے اُن کو شکست دے سکیں۔ چنانچہ انہوں نے جماعت کو ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ جس میں تین بنیادی نکات تھے:

1۔ جماعت اپنے کردار میں پاک تبدیلیاں پیدا کرے۔

2۔ سادہ زندگی گزارے۔

3۔ ہر ممکن طریقے سے لغویات سے بچ کر تبلیغ کیلئے رقم فراہم کرے۔

اب بچت کرنے کے بہت سے طریقے حضرت مصلح موعودؓ نے بتائے جن میں سے آدھے پوائنٹ تو مردوں کیلئے ہیں کہ وہ کس طرح کما کر تبلیغ کیلئے خرچ کر سکتے ہیں۔ مگر آدھی ہدایات عورتوں کیلئے ہیں کہ وہ اپنے گھریلو اخراجات میں سے کس طرح بچت

کر کے چندہ دے سکتی ہیں اور مردوں پر کم بوجھ ڈال سکتی ہیں۔ اس کیلئے آپؓ نے عورتوں کو بھی کہا کہ آپ کچھ گھریلو سطح پر کاروبار کر کے چندہ دیں۔اس پر کچھ خواتین نے چھوٹے کاروبار کرنا بھی شروع کر دیئے۔ چنانچہ آج میں آپ کو حضورؓ کے مطالبات تحریک جدید کے بارے میں بتاتی ہوں کہ:

سادہ زندگی اختیار کریں۔ایک کھانا پکائیں۔سادہ کپڑے پہنیں۔فالتو کپڑے نہ سلوائیں۔ نیا زیور نہ بنوائیں۔شادی بیاہ میں فالتو اخراجات نہ کریں۔ میک اپ پر خوامخواہ روپیہ ضائع نہ کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مالی قربانی کر کے تبلیغِ اسلام کیلئے رقم پیش کریں۔

تحریک جدید کے دوسرے مطالبات زیادہ تر مردوں کیلئے ہیں مگر مندرجہ بالا بیان کردہ مطالبات خالصتاً عورتوں کیلئے ہیں۔آج میری ان باتوں کا موضوع بھی ظاہر ہے عورتوں کے حوالے سے ہی ہوگا۔

آج سے 25 یا تیس سال پہلے کا ماحول آج کل کے دور کی نسبت کچھ سادگی لئے ہوئے تھا۔ابھی ہر سال بدلتے فیشنوں اور برانڈ کلچر کا زمانہ نہیں آیا تھا۔سادہ،ایک ہی لمبائی اور تراش فراش کے لباس اور سادہ زیورات پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔شادیوں میں بھی سادگی تھی اور حضورؓ کے ارشادات کے مطابق رسوم ورواج پر خاصا کنٹرول تھا۔ان گزشتہ سالوں میں پاکستان کے حالات نے کچھ عجیب کروٹ لی ہے۔ جہاں مالی آسودگی آئی وہاں اخلاقی اور سماجی اقدار قدرے زوال پزیر ہوئیں۔اور اس کا اثر احمدیوں پر بھی پڑا۔اس کے علاوہ جیسے کہ حضرت خلیفۃ اوّلؓ فرماتے ہیں کہ ہجرت ہمیشہ

بابرکت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ ہمیں احمدیت کے نام پر یہاں لایا تو ہمیں ہر طرح کی فراخی بھی عطا فرمائی۔ آج ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہم حضرت مسیح موعودؑ اور حضرت مصلح موعودؓ کے ارشادات پر کتنا عمل کر رہے ہیں۔ لیجئے میں آپ کو ایک سفر پر لئے چلتی ہوں۔

آج میں تحریک جدید کی آڑ میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تحریک جدید اور مجھ میں کچھ مماثلت ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر انسان کو خدا تعالیٰ ایک مخصوص فطرت عطا فرماتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسے بقول حضرت خلیفۃ الاوّلؓ وما انا من المتکلفین کہ مجھ میں تکلف اور بناوٹ نہیں ہے۔ شائد اسی فطرت کے تحت میرا تکلف اور بناوٹ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ عورتوں کے مخصوص اخراجات یعنی کپڑا، جوتے، پرس، میک اپ وغیرہ وغیرہ جن پر لوگ خوب خرچ کر سکتے ہیں، میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میرے لئے مناسب لباس کچھ اس طرح ہے کہ کپڑے کا مٹیریل، رنگ و پرنٹ خوبصورت ہو۔ ڈیسینٹ سلائی کے ساتھ مناسب لمبائی چوڑائی ہو۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔ کوئی زیادہ کڑھائیاں، زری کے کام، سجاوٹیں گوٹے لیے اور آج کل کے عجیب وغریب ڈیزائنوں والے کپڑوں سے سخت گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ میک اپ کیلئے بھی کوئی سا تیل بطور موسچرآئز، ایک عدد لپ اسٹک اور کوئی بھی فاؤنڈیشن کسی پارٹی پر جانے کیلئے میرے لئے کافی ہے۔

جوتوں اور پرسوں کا شوق تو ہے مگر بہت مہنگے نہ تو لینے کا شوق ہے نہ ارادہ۔ بس

میں اس مناسب قسم کے بانکپن میں خوش تھی۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ کبھی اعتراض کا سامنا نہیں ہوا تھا۔لوگ پسند ہی کرتے ہوں گے شائد کیونکہ کبھی ایسا شور نہیں مچا تھا۔مگر صاحبو یہ آج سے 25 سال پہلے کا قصہ ہے۔

پھر یوں ہوا کہ کینیڈا میں ورود ہوا تو ہر قسم کے لوگوں سے واقفیت اور ربط بڑھا۔ وطن کی اداسی دور کرنے کیلئے پارٹیاں۔ گیٹ ٹو گیدر اور اس کے علاوہ شادیاں، اجلاس، اجتماع وغیرہ میں شمولیت اپنے احمدی کلچر کا حصہ تھے۔ مابدولت اپنے حسابوں اپنی مناسب قسم کی ڈگر پر مطمئن ہر جگہ شرکت فرماتے رہے اور سکون و آسودگی ہمیشہ کی طرح طبیعت پر غالب رہی۔

مگر جلد ہی فیشن بدلا کیونکہ میرا خیال ہے کہ 1990ء کی دہائی کے پہلے سالوں سے ہی فیشن کی بیماری زیادہ پھیل رہی تھی مگر میرے اوپر حسب معمول کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پھر کچھ محسوس سا ہونے لگا کہ ہر طرف طنزیہ مسکراہٹوں، جملوں اور کسی قدر حقارتوں کی فضا ہے تو حیرانگی سی ہوئی۔ پھر کچھ ہمدرد دوستوں کی محبت بھری پھبتیاں، مشورے اور طنزیہ قہقہوں کا سامنا ہوا تو پوچھا کہ میرا قصور کیا ہے؟ بولے:

''فیشن کی بھی کچھ خبر ہے کہ نہیں... آج کل لمبی قمیضیں اور کھلے پائیجاموں کا فیشن ہے۔فوراً فیشن کے مطابق خود کو بدلو۔''

یہ 1990ء کی دہائی کے پہلے سالوں کی بات ہے۔ چونکہ ان دنوں کپڑے تو سب کے پاکستان سے ہی بن کر آتے تھے۔اس لئے گھر والوں سے کہا کہ دیکھو یہ بات سچ ہو رہی ہے کہ کھاؤ من بھاتا اور پہنو جگ بھاتا۔تو پلیز اب میرے کپڑے میری پسند کے

نہیں بلکہ لوگوں کی خوشی کے مطابق بھیجو لیکن صاحب The First Impression is the Last Impression کے مطابق اپنے پہلے زمانے کے دوستوں میں اسی طرح معتوب ہوں کہ ''ہُن فیشن دی سمجھ آ گئی اے... فیشنی ہوگئی ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اوہ خدایا۔ تیرے سادہ دل بندے کہاں جائیں۔

بہرحال پھر زمانہ بدلا۔ کپڑوں پر پٹیوں، ربنوں، کڑھائیوں، بارڈروں تریزوں اور فراکوں کا فیشن آیا۔ جانے کیا کیا طوفان بیچاری شلوار قمیض پر ٹوٹے۔ پرانی شلواریں قمیض کہیں منہ چھپا کر پھرنے لگیں اور نئی کڑھائی دار خیمے، لمبی قمیضوں، لمبے چاکوں اور پاجاموں نے وہ بہاریں دکھائیں کہ خدا کی پناہ۔ مگر ایک فائدہ موٹی عورتوں کو ضرور ہوا کہ لمبی قمیضوں میں موٹاپا کچھ کم نظر آتا تھا۔ اب میرے جیسے پرانے لوگ ابھی سیدھے ہی ہوئے تھے کہ یہ مصیبت آن پڑی۔ آپ پسند کریں یا نہ کریں، بھگتنا ہوگا کہ پہنو جگ بھاتا اور میں اکثر سوچتی ہوں کہ تحریک جدید تو کہاں اور کدھر ہے جو کہتی ہے سادہ کپڑے پہنیں۔ فالتو نہ بنوائیں وغیرہ۔

کیا آپ اس بات سے اتفاق کریں گی کہ brand اور ڈیزائنر کا لفظ چند سال قبل اتنا عام نہیں تھا۔ صرف سکول میں بچوں میں مقابلہ رہتا تھا کہ ہر چیز اچھے برانڈ کی ہونی چاہئے مگر عام لوگوں میں اتنی مصیبت نہیں آئی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے کچھ سال پہلے پاکستان جا کر ہوا۔ وہاں یقین کریں کہ یہ برانڈ کی بیماری شوگر کی طرح ہر خاص وعام میں پھیلی ہوئی تھی۔ شہر یا گاؤں ہر طرف برانڈ اور ڈیزائنز کے بنے بنائے کپڑے دستیاب تھے اور کپڑوں کی دوکانیں اور تھان سے کپڑا لینے کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ جوتے اور

کپڑے وغیرہ بھی امریکہ، پیرس، اٹلی وغیرہ کے برانڈ ہونے چاہئیں اور اگر خریدنے کی استطاعت نہیں تو جناب ہر چیز کی نقل بہ مطابق اصل تیار ہو چکی ہیں۔ جنہیں آپ نمبر 2 بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جو سوٹ 20 ہزار کا آتا ہے۔ اُس کی کاپی مخصوص دوکانوں پر 10 ہزار میں دستیاب ہے۔ اسی طرح ہر جوتا، کپڑا، میک اپ اصل اور نقل ہر دوکان پر باافراط ملتا ہے۔

مجھے اوّل تو حسب معمول برانڈ کی خبر ہی نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر پاکستان جا کر پتہ چلا کہ برانڈ جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یعنی جس کے پاس برانڈڈ کپڑا جوتی نہیں ہے وہ گویا صحیح انسان ہی نہیں ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اصلی برانڈ کا نہیں ہے۔ اب لوگ ہیں کہ اصلی برانڈ کا پہننے کیلئے ہانپتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی بادل نخواستہ اگر اصلی سوٹ 20 ہزار کا ملتا تھا تو نقلی آدھی قیمت میں خریدنے میں ہی عافیت سمجھی اور باقی کے پیسے کسی غریب کو دیئے کہ چلو بھلے نقلی سوٹ ہے مگر جوہری کے علاوہ میری طرح عام لوگوں کو تو کچھ مطمئن کر سکے گا۔ چنانچہ میں نے ہر چیز نمبر 2 ہی خریدی اور بقیہ رقم کسی بہتر کام پر خرچ کی۔

میرے خیال میں چونکہ کچھ تنہائی کو دور کرنے کیلئے اور کچھ صرف اپنی ہی کمیونٹی کے لوگوں میں ملنے کی مجبوری کی وجہ سے سوشل پارٹیز کا خواتین میں کافی رواج ہے۔ جس میں سب سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ منفی باتیں بھی جنم لے لیتی ہیں۔ مثلاً خواتین میں سادگی کے ساتھ شو آف کلچر نے جگہ لے لی ہے۔ جو اس دوڑ میں شامل نہیں اس کیلئے بیچاری کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر چہ ہمہ صفت شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔

برانڈڈ اور ڈیزائنر کلچر نے تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے۔گھروں میں سامان اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی بھی دوڑ لگی ہوئی ہے۔گھر بھی ایک سے ایک نیا چینج ہوتا رہتا ہے۔گاڑیاں اس کے علاوہ ہیں۔کھانے پینے کے معیار اتنے بلند ہو چکے ہیں کہ بچے تو گھر کے کے کھانے پسند ہی نہیں کرتے۔کھانا آرڈر کرنے کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔کسی ہوٹل میں دیکھو تو اکثر فیملیاں باقاعدہ روٹین کا کھانا کھانے تشریف لائی ہوتی ہیں۔مہمانوں کو اکثر و بیشتر ہوٹلوں میں ہی دعوت دی جاتی ہے یا پھر پارٹیز پر کیٹرنگ کا رواج ہے۔Maids رکھنے کا بھی رجحان ہے۔

یہ ہمارے عام رہن سہن کا معیار ہے۔بہت اچھی بات ہے۔خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ اگر فراخی دی ہے تو اظہار بھی ہونا چاہئے۔مگر اس قدر اظہار کہ شادیوں پر بھی 20–25 ہزار کے اخراجات صرف نمود و نمائش پر ہی اُٹھ جاتے ہیں۔اس کے علاوہ جہیز اور بری، گھر کے سامان، بیوٹی پارلر اور ملبوسات پر بے حساب اخراجات۔مہندی کے فنکش اس کے علاوہ ہیں جس میں عزیز و اقارب بھی حسب توفیق حصہ لیتے ہیں۔جن کا اختتام لڑکا یا لڑکی والے کسی ہال میں دھوم دھام سے گا بجا کر یا DJ بلا کر زرد رنگ کی ہر طرح کی سجاوٹ کے ساتھ کرتے ہیں۔اس کو آپ اصلی شادی بھی کہہ سکتے ہیں۔بقول مراثی ’’اصل بیاہ تے مہندی ہُندی اے۔فیر تے روٹی ہُندی اے۔‘‘

مجھے ہمیشہ سے ہی یہ خیال آتا ہے کہ بجائے بینکوئیٹ ہال میں ہزاروں ڈالر خرچ کرنے کے دونوں خاندان اپنے گھروں میں ہی سادگی سے یہ رسم ادا کریں۔زیادہ مہمان نہ بلائیں۔بقیہ رقم کا ایک حصہ جماعت کو، ایک غرباء کو اور ایک حصہ اپنے بچوں کو

سیٹ کرنے کیلئے کیوں نہیں استعمال کر لیتے۔ چلو گھر پر نہ سہی مگر چھوٹے پیمانے پر یہ رسم سادگی سے ادا ہو سکتی ہے۔ صرف ذہنی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ سادہ شادیوں والے جوڑے زیادہ خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں۔ ہم پرانے لوگ تو عمومی تصویر یہی دیکھتے ہیں۔ آج بھی کرونا کے بے شمار نقصانات کے ساتھ کچھ فوائد بھی ظہور میں آئے جن میں سب سے اچھا فائدہ خاموشی سے شادی کا سرانجام پا جانا بھی ہے۔ اس کے علاوہ شوریٰ پر یہ تجویز بھی دینی چاہئے کہ جماعت کو ایک جگہ شادی گھر کیلئے ضرور مخصوص کرنی چاہئے۔

اس کے علاوہ اسی نیت اور سوچ کے ساتھ اگر دُلہن یہ ارادہ کر لے کہ بجائے 3 ہزار کا برائیڈل سوٹ خریدنے کے ایک ہزار والا ہی خرید لیا جائے اور بقیہ دو ہزار پاکستان کسی غریب لڑکی کی شادی کیلئے بھجوا دیئے جائیں۔ تو یقین کریں 2 ہزار کے جو پاکستانی روپوں میں خاص رقم بن سکتی ہے اس کی شادی کا تمام خرچ نکل آئے گا اور اتنی دعائیں لیکر اُس کی اپنی شادی بہت بابرکت ہو جائے گی۔ اسی طرح باقی اخراجات میں کمی کر کے چندے میں دینا کیا مشکل ہے جبکہ اس کے بدلے میں برکتوں اور ثواب کے علاوہ دس گنا بڑھ جانے کا بھی وعدہ خدا تعالیٰ آپ سے کرتا ہے اور خدا تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ اب اگر نہ مانیں تو یہ تکاثر یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ ہی کہلائی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم پارٹی ڈریس یا آؤٹ فٹ یعنی اچھے کپڑے پہننے کیلئے بھی درمیانی قیمت کے رکھیں اور جیولری بھی نیوٹرل کلر میں خریدیں جو ہر سوٹ کے ساتھ چل

جائے تو کافی بچت ہوسکتی ہے۔مگر ایک بات پر میں زور دوں گی کہ اپنا برقعہ،سکارف اور جوتے بہت اعلیٰ قسم کے رکھیں اور پھر اُن کو عربی اور ٹرکش خواتین کی طرح صفائی اور نفاست سے پہنیں نہ کہ گندے اور چکنائی والے کوٹوں اور مصالحے دار سکارفوں کے ساتھ باہر اٹھلاتی پھریں۔ ہمارے اکثریت والے علاقوں میں ایسے نظارے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں اس سے عمومی تاثر خراب پڑتا ہے۔

ٹھیک ہے حالات بدل گئے ہیں۔فراخی عطا ہوئی تو اظہار بھی ہونا چاہئے اور پھر اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے۔ہم اپنے آپ کو سلیقے سے نہایت حد تک سجا بنا سکتے ہیں۔

صرف اللہ تعالیٰ اسراف اور فضول خرچی کو ناپسند فرماتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں خاندان حضرت مسیح موعودؑ کی خواتین سلیقے اور طریقے میں اعلیٰ نمبر پر ہیں۔زندگی کے ہر کام کو مناسب انداز میں انجام دینا اُن کا شعار ہے۔نانی کا شادی کا جوڑا نواسی بھی پہن لیتی ہے۔اس معاملے میں کم خرچ بالا نشین کی مثال بہترین ہے۔

ہمارے زمانے کی عورتیں پرانے کپڑوں کو رنگ کر نیا کر لیتی تھیں۔کروشیا کی لیس یا ہلکا گوٹا کناری یا ابرق لگا کر دوپٹے خوبصورت بنا لیتی تھیں۔جہیز کے کام کے دوپٹوں سے دلائیاں،گاؤ تکیے اور کشن بنا لینا، پرانے یا بلا رنگ قالینوں پر رنگوں کی پوٹلیاں بنا کر اوپر پھیر کر قالین نئے کر دینا، کپڑوں کو چھوٹا بڑا کر کے نیا ڈیزائن بنانا یا بچوں کے کپڑوں میں بدل لینا۔مگر یہ تو ہمارے زمانے کی باتیں ہیں،آج کل ان چیزوں کیلئے گاربیج کا لفظ

استعمال ہوتا ہے۔ ہر چیز گاربیج کردو اور نئی لے آؤ۔ لیکن اگر تحریک جدید کے حوالے سے دیکھا جائے تو گاربیج کے لفظ کو recycle میں بدل دینا چاہئے۔ ویسے کووڈ 19 کے معاشی حالات کچھ اس طرح سے لوگوں کو سوچنے پر زیادہ مجبور بھی کر رہے ہیں۔

دراصل ہم اپنے لائف سٹائل میں اسقدر جکڑے ہوئے ہیں کہ باہر نکلنا مشکل ہے۔ جیسے سورۃ یٰسین میں ہے کہ رسم و رواج کے طوق ہماری گردنوں میں پڑے ہیں۔ ہم یوروپین لوگوں سے ویسے خاصے متاثر اور دبے ہوئے رہتے ہیں لیکن ان کی اچھی باتوں کو اپنانے کی ہم میں کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ یہاں ہمارا ناک بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ گوروں کے ہاں عموماً Pot luck ون ڈش کا رواج ہے۔ اگر کوئی دعوت بھی ہوتی ہے تو سادگی سے دو ڈش کے ساتھ۔ میں جس سکول میں کام کرتی تھی وہاں عورتیں اپنے فالتو پرانے استعمال شدہ کپڑے اور دوسری فالتو اشیاء لاکر میز پر ڈھیر کر دیتی تھیں اور سب خوشی خوشی اپنی ضرورت کی چیز اُٹھا لیتے یا پھر کسی سیکنڈ ہینڈ چیزوں کے سٹور Value Village سے اپنے کپڑے اور دیگر ضروری اشیاء خریدتی تھیں۔ آپ یہاں ایسے کریں ناں۔ ہمارے ناک کو بہت بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کئی دعوتیں اپنی گوری فرینڈز کے ہاں کھائی ہیں۔ بے شک ان کا بڑا خرچ Drinks پر ہوتا ہے۔ مگر لیڈیز پارٹیز میں یہ عام نہیں۔ سادہ سا آلو پالک کا سلاد اور چپس یا اگر کوئی بہت چھلانگ ماری تو کوئی فنگر فوڈ یا انڈے یا ٹونا کے سینڈوچ۔ لیکن ان لوگوں کا عام اندازِ زندگی محنت اور مستقل مزاجی کا ہے۔ کام کو لگن اور بہترین انداز میں کرنا، صبح جلدی اُٹھنا اور رات کو جلدی سونا، سادہ لباس، سادہ جیولری، ایک جاگر اور ایک سینڈل، الماری میں صرف دو تین ڈریس

لٹکے ہوئے ،ایک دو جینز اور ایک دو ٹی شرٹس وغیرہ ۔سادہ کھانے اور سادہ طرزِ زندگی ۔ مگر صفائی ستھرائی میں بہترین، باغبانی میں بہترین ۔ ہر مرد عورت باقاعدہ handy man یعنی گھر کی مرمت اور چیزوں کی ٹھیک کر لینا۔ بچوں کو ڈسپلن سکھانا اور گھر کے کام کاج کی ذمہ داریاں دینا۔یعنی ہر کام میں ڈسپلن ،قانون کی پاسداری اور سخت محنت کرنا ہے۔لیکن ہمیں ان سب سے کوئی غرض نہیں ۔ہمیں صرف ان کی بظاہر چمک دمک ،فیشن اور آزادی نظر آتی ہے۔فیشن بھی صرف ان کے دفتری ماحول یا ایک خاص طبقہ فکر میں کرنا پڑتا ہے۔ورنہ اکثریت تو بنیادی طور پر پریکٹیکل اور معیانہ رو ہے۔6 بجے رات کا کھانا اور 9 بجے سونے کا وقت ہو جاتا ہے۔مگر صبح 6 بجے سب اپنے کاموں پر جانے کیلئے تیار ہوتے ہیں ۔ان پچھلے 25 سالوں میں نے ایک عمومی تصویر تو یہی دیکھی ہے اور پھر امیر لوگوں کی طرزِ زندگی تو مختلف ہی ہوتی ہے مگر عمومی طور پر عوامی زندگی تو یہی ہے۔

چوہدری ظفر اللہ خان صاحب ہم سب کے لئے بہت ہی آئیڈیل شخصیت ہیں ۔ انکی تمام دوسری باتوں کے علاوہ مجھے ان کی جو سب سے زیادہ متاثر کن بات لگتی ہے وہ اُن کی سادگی محنت اور اپنے اوپر خرچ نہ کرنا بلکہ وہ پیسے بچا کر دوسرے کی مدد کرنا یا چندے دینا ہے۔وہ اپنی ذاتی زندگی میں بہت سادہ تھے مگر لوگوں کیلئے بہت سخی۔تو میرا بھی شروع سے یہی خیال رہا ہے کہ اگر اپنے اوپر خرچ کیا تو کیا کیا ؟ وہ تو ہر ایک کرتا ہے۔کچھ دوسروں کیلئے کرو تو کوئی بات ہے۔مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی۔

تحریک جدید کا بنیادی مقصد ہی غیر ضروری اخراجات بچا کر اسے کسی با مقصد کام پر خرچ کرنا ہے۔اگر آپ اس زاویے سے اِسے اپنی زندگی میں شامل کر کے دیکھیں کہ

اگر کسی برانڈ کا400ڈالر کا پرس آپ کو جذبہ تفاخر دیتا ہےتو وہی300 ڈالر آپ کسی غریب کو پاکستان بھجوا کر100 ڈالر والے پرس میں بھی اتنی ہی طمانیت محسوس کریں گی اور اُس کے علاوہ300 کو10 سے ضرب دیں تو خدا تعالیٰ اُسے 300 گنا ڈالروں سے بھر ارکھے گا۔سکون اس کے علاوہ ہے۔

ہم کچھ فرینڈز اس زاویے سے اپنے اخراجات کو تقسیم کرتے ہیں تو دوسروں پر خرچ کرنے سے بہت سے راستے نکل آتے ہیں۔ہم اپنے کپڑوں اور دیگر اخراجات کو کم کر کے جو بچت کرتے ہیں وہ پیسہ اکٹھا کر کے میری ایک دوست پاکستان لے جاتی ہیں اور وہاں عام غریب آدمی کے حالات معلوم کرتی ہیں اور ان کی مدد کرتی ہیں۔مثلاً ریت میں اُبلی ہوئی چھلیاں اُس کو بہت پسند ہیں۔ وہاں کے ریڑھی والوں سے یہ چھلیاں خریدتی ہےاور پھر دوسرے غریب لوگوں کو ایسی ریڑھیاں بمع سامان کے خرید دیتی ہے اور اُن کا روزگار لگ جاتا ہے۔ان ریڑھیوں پر پندرہ بیس ہزار کا خرچ آتا ہے وہ اس قسم کی چار پانچ ریڑھیاں بنوا دیتی ہے۔غریب لوگ اتنا بھی Invest نہیں کر سکتے جبکہ ہمارے لئے100 ڈالر کا ایک سوٹ ہے۔اس طرح چھوٹے رکشے، کسی عام آدمی کے گھر میں UPS لگوا دینا، کسی دیہاتی سکول میں پنکھے یا پانی کے کولر لگوانا یا جنریٹر لگوانا۔کئی نادار بچیوں کی شادی کے خرچ۔کسی غریب کے آپریشن اور علاج کیلئے لاکھ دو لاکھ اکٹھے کر دینا۔کئی گھروں میں ماہانہ راشن ڈلوانا یا ماہانہ خرچ بھیج دینا۔ہومیو پیتھک کلینک کسی گاؤں میں کھول دینا یا وہاں دوائیاں مہیا کرنا وغیرہ۔ ہزاروں کام ہیں جن پر ہم خرچ کر سکتے ہیں۔صرف سوچ کی ضرورت ہے۔یہ سب بتانے کی اس نیت پر ہمت کی ہے

کہ شائد آپ بھی اس پہلو پر سوچیں۔ یقین کریں ان کاموں سے اسقدر سکون اور خوشی ملتی ہے کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ میں اسے اگلے جہان کی کمیٹی ڈالنا کہتی ہوں۔

تو جناب اس سارے قصے کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ تحریک جدید کا مطلب سادگی اپنا کر مالی قربانی کرتے ہوئے تبلیغ اسلام کی کوشش کرنا ہے۔ کیونکہ ایک عام عورت اتنی تبلیغ نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی اس امریکی معاشرے میں آپ کیا تبلیغ کر سکتے ہیں۔ پھر تبلیغ ویسے بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کیلئے ایک خاص طرز فکر چاہئے۔ اس لئے ہم کم از کم کچھ رقم بچا کر جماعت کے نظام کی مدد کر سکتے ہیں جو خاص تحریک جدید کے مقاصد کو پورا کرنے کیلئے کام کر رہا ہے اور تبلیغ کر رہا ہے۔ اِس کہانی کا مقصد صرف یہ کہنا ہے کہ سادگی بہت زیادہ بھی اپنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف میانہ روی اختیار کرتے ہوئے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی کھاؤ پیؤ مگر اسراف نہ کرو، پر عمل کرتے ہوئے اپنے فالتو اخراجات کو ایک ضبط کے دائرے میں رکھتے ہوئے کچھ پیسے بچا کر خدا کی راہ میں کسی کی مدد اور تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرنے کیلئے خرچ کرنا ہے۔

خواتین اس تحریک پر اس لئے بھی عمل کرسکتی ہیں کہ بہت سا دائرہ کار اخراجات کا اُن کے اختیار میں ہے یعنی ہمیں wants اور needs میں فرق کرنا سیکھنا ہے۔ توکل سیکھنا ہے۔ چاہیں تو کم کر دیں اور چاہیں تو تکاثر کی دوڑ میں مصروف رہیں۔ تحریکِ جدید کو قرآنی رنگ میں سمجھنے کیلئے سورۃ تکاثر ہم سب کو راہِ راست پر چلنے کی عجیب تلقین کرتی ہے۔ آپ اِس سورۃ کی پہلی اور آخری آیت غور سے پڑھیں۔ تمہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ نے غافل کر دیا ہے۔'' (آیت نمبر 1)

اور یہ کہ تم اپنے ناز ونعم کے متعلق ضرور پوچھے جاؤ گے۔‘‘(آخری آیت)

لیکن ڈریئے نہیں خدا تعالیٰ نے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا بھی فرمایا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ آیت ہم سب کیلئے مشعل راہ ہے کہ میانہ روی اختیار کرو، اور بس۔

متذکرہ بالا تحریک کا یہ پہلو تو اُسوقت کی ضرورت کے مطابق حضرت مصلح موعودؓ نے پیش کیا اور آج جبکہ حالات کووڈ اور پھر یوکرین کی جنگ کے بعد ایک ایسی نہج پر آ نکلے ہیں کہ تمام دنیا مہنگائی کی ’’احراری‘‘ قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہے اور ایک مایوسی، گھبراہٹ اور فکرِ فردا نے ہر ایک کو گھیر رکھا ہے تو ایک بار پھر تحریک جدید دین و دنیا میں سرفراز کرنے کیلئے تیار کھڑی ہے۔ کاش کہ ہم خوشدلی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دین و دنیا میں اپنے قدموں پر چل سکیں۔ آمین۔

OO

دِلوں پر نقش رہے گا میرے زمانے کا
میں اختتام ہوں اِک عہد کے فسانے کا

یہ مضامین لجنہ کی سینئرز کی میٹنگ میں پڑھے گئے جو مجلس عاملہ نے اُن کیلئے منعقد کی۔

ہاں تو صاحبو! آج یہاں ہماری یعنی بزرگوں کی حکمرانی ہے زہے نصیب...!! کہاں ہم اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔ ہمیں تو اپنے گھروں میں بھی نمبر 2 کا مقام حاصل ہو چکا ہے۔ مگر واہ رے! آج تو ہمیں وہ مرتبہ بلند ملا جس کو عاملہ بھی کچھ بے بسی سے دیکھ رہی ہے۔ مگر کبھی کبھی شک بھی پڑتا ہے کہ ہمیں کسی آثارِ قدیمہ کی نمائش کے لئے تو نہیں بلایا گیا۔ یعنی خوبصورت سوٹ پہنا کر زندہ Antique کے طور پر۔

تو کیوں نہ اس لمحۂ تفاخر پر آج کچھ جمال یار کی باتیں کریں یعنی اپنے دور عافیت اور بزرگیت کے خواص پسندیدہ کا ذکر خیر ہو جائے۔ یعنی یہ وہ دورِ عافیت ہے کہ جس میں ہر بُری چیز واقعی بُری نظر آتی ہے۔ یہ وہ خوبصورت دور ہے کہ چاہنے کے باوجود آپ کسی غلط بات کی تاب نہیں لا سکتے۔ اب ایک ایسی پیاری اور بے نیاز کھلنڈری سی عمر آ گئی ہے کہ تمام نفاستوں، فیشنوں اور دیگر بکھیڑوں از قسم فلموں، ڈراموں اور دیگر لغویات سے کمال بے تعلق اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ پچھلی دو راتیں میں نے ایک

ڈرامے کی ساری قسطیں ایک ٹرانس کی کیفیت میں ہوتے ہوئے بھی ایک اسقدر مجرمانہ Guilt کے ساتھ دیکھیں اور پھر اگلے دو دن باقاعدہ اپنی نظروں سے گِر کر گزارے۔ جہاں تک کسی بے ضرر سے فیشن یا زیبائش کا تعلق ہے تو وہ زمانے کی نظر میں ایک تیر بن کے لگتا ہے لہٰذا خاموشی سے کنارہ کشی بہتر ہے۔ ویسے بھی یہ منزلِ عمر عرفانِ حیات کے ادراک کا انوکھا تجربہ ہے۔

کسی بازار یا مال میں جاؤ تو ونڈو شاپنگ کی بجائے منہ دھیان گیان میں لگا کر درود و سلام پڑھنے میں ہی عافیت سمجھو۔ گھوم پھر لو کہ یہ مقامِ خاص پہلے کب کہاں نصیب میں تھا۔

بڑھاپے میں نیا ہنر آنا تو درکنار انسان پرانا عیب تک نہیں کر سکتا۔ اسلئے خوامخواہ کمپیوٹروں اور سیل فون کے راز و نیاز سیکھنے میں کیا سر کھپانا۔ موجیں ہی موجیں۔ بس فون کرلیا۔ واٹس ایپ پر گپیں لگالیں۔ یوٹیوب پر مطلب کی چیزیں دیکھ لیں۔ ضرورت پڑی تو گوگل بھی کرلیا۔ کیا یہ علم کافی نہیں۔

کیا مزے کا زمانہ ہے۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ اپنی مرضی سے جب چاہو سو جاؤ۔ اُٹھ جاؤ۔ باہر سیر کو نکل جاؤ یا بڑھاپے کیلئے بچائے ہوئے سرمائے سے دنیا کی سیر کیلئے گائیڈڈ ٹور بک کرواؤ یا ہر دوسرے تیسرے مہینے پاکستان جرمنی اور یورپ کی سیر کو نکل جاؤ اور وہاں رشتہ داروں سے خوب خاطر مدارات کرواؤ۔ 6 ماہ سردیوں کے پاکستان گزارو اور گرمیوں میں امریکہ کینیڈا یورپ تشریف لے آؤ۔

نہ جوانی کے بکھیڑے، نہ بچے پالنے نہ پڑھانے نہ بیاہنے، نواسوں اور پوتوں جیسے

خوبصورت کھلونوں سے دل بہلانا اور اپنی خدمت خاطر میں وقت لگانا۔ کبھی دودھ پتی بنائی یا بنوائی اور پھر ابلے انڈوں کے ساتھ نوش فرمائی۔ کبھی ''بھانڈا'' یعنی پنجیری بہت سادے میوہ جات ڈال کر بنائی یا بنوائی اور پھر تھوڑا نمائشی ہائے ہائے کرتے ہوئے کھائی۔ اپنے لئے چنگا چوکھا کھانا اور یخنی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بنا کر دھڑلے سے پینا کہ ڈاکٹر نے پروٹین ڈائٹ کی ہدایت کی ہے۔ جیسے ما بدولت 3 ڈالر والے چکن کو چھوڑ کر 12 ڈالر والا مٹن ڈنکے کی چوٹ پر کھاتے ہیں کہ قوتِ لایموت کیلئے ضروری ہے۔

قصہ مختصر کہ ہمیں تو بڑھاپے کے مرثیے پڑھنے کی بجائے ہر وقت بڑھاپے کے قصیدے ہی الاپتے رہنا چاہئے کہ ہر وقت نخرے کرنے، اُٹھوانے اور اس پر بھی ماتھے پر تیوری چڑھا کر بڑھاپے کی شان میں ''ہجویانہ'' انداز اختیار کرنا اِک عجب دورِ چسکوراپن ہے جو جوانی میں میسر کہاں...! یہ علیحدہ بات ہے کہ؎

بزم احباب، مئے ناب و وصالِ معشوق
اب کسی شئے میں نہیں جس کو مزہ کہتے ہیں

یعنی اب وصالِ معشوق یعنی خاوند۔ مئے ناب یعنی لذیذ کھانے وغیرہ ایک ناچار سی بے مزہ مجبوری ہے۔ مگر بزمِ احباب کی بات اور ہے کہ بزرگ تنہائی یعنی اپنی صحبت زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ آس پاس بزرگوں کی رونق لگی رہے تو ہر طرح کی من چاہی نئی پرانی باتیں اور نئے پرانے زمانے کے تقابل اور جائزے لئے جاتے رہیں۔

عورتوں اور مردوں کی محفلیں بھی اپنی اپنی صِنف کے مطابق مختلف قسم کی ہوسکتی

ہیں۔ پڑھے لکھے سکالر اور شاعر ادیب قسم کے حضرات کی محفلوں میں شمولیت ایک عام انسان کیلئے وجہ افتخار اور ذہن کے بند دریچے کھولنے کا سبب بنتی ہے۔اُن کے عالمی اور ملکی سیاست کے تجزیئے، اُن کا فلسفہ حیات، زندگی کے تجربات و واقعات کے ساتھ ساتھ اُن کے ادبی وشعری چاشنی لئے ہوئے دلچسپ جملے ایک ایک خاصے کی چیز ہوتے ہیں اور عام مرد حضرات کی رونقیں حالاتِ حاضرہ پر تبصروں کے ساتھ دلچسپ طنز و مزاح کے جملوں سے مزین رہتی ہیں یا پھر بزنس وغیرہ کے اسرار و رموز پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی پارک یا مال میں بیٹھے ہوں تو آس پاس کی خواتین پر نظریں ڈالتے رہنا سب کی مشترکہ دلچسپی کا منبع ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کی محافل میں اپنے اپنے عوارض کے ٹوٹکے بھی بیان ہونے کے ساتھ اچھے ڈاکٹروں کو بھی ڈسکس کیا جاتا ہے۔

جہاں تک خواتین کا تعلق ہے، اوّل الذکر قسم تو ذرا کم کم ہی پائی جاتی ہے۔ یہاں البتہ کبھی کبھی ٹورنٹو کی اہل قلم اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر فائز خواتین کی محفلوں میں جانے کا اتفاق بھی ہوتا ہے جو کہ مردوں کی طرح ہی بہت جاندار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ باقی ہماری سب خواتین کی محفلیں عموماً یا کم وبیش ایک قسم کی ہی راگنی کا الاپ ہوتی ہیں جو سب سے پہلے انتہائی تنقیدی نظروں سے ایک دوسرے کے جائزے لینے کے بعد فیشن اور کپڑوں سے شروع ہو کر گھریلو مسائل کے گمبھیر معاملات سے گزرتے ہوئے اور کھانے کی تراکیب کے بعد غیبتوں اور تبصروں تک پہنچتی ہے جو کہ ان رونقوں کا نقطہ عروج ہوسکتا ہے اور پھر دورانِ خورد ونوش یہ غیبت کا تڑکا مزید لطف دوبالا کرتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بڑھاپا ایک ایسا محل ہے جس کی ہر کھڑکی ماضی کی طرف کھلتی ہے۔کوئی

ایک چھوٹا واقعہ کوئی بات یکدم ماضی کے کئی دریچے کھول دیتی ہے۔فوراً ہی کئی عمر رفتہ کے واقعات کو آواز دینے کو جی چاہتا ہے۔کسی بزرگ سے ملاقات ایک صدی کو روشن کر دیتی ہے۔ پرانے زمانے میں بزرگ بطور Historian اور بطور ٹی وی استعمال ہوتے تھے۔ پرانے زمانے کے قصے، کہانیاں، حکایات و واقعات و نصائح کا خزانہ مانے جاتے تھے۔ بچے ان کو نبیوں کی کہانیوں کے ساتھ جادوئی کہانیاں، الف لیلوی کہانیاں، شہزادے شہزادیوں، جنوں پریوں کی کہانیاں سردیوں میں رات کو رضائیوں میں دبک کر یا گرمیوں میں چاندنی راتوں میں صحنوں میں چارپائیوں پر لیٹ کر بطور ٹی وی اور ریڈیو استعمال کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ان بزرگ ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی چاشنی آج کل کی فلموں کی کہانیوں کو مات کرتی تھی اور آج کل بزرگ بیچارے کچھ کہنے لگیں تو لوگ جمائیاں لیتے ہوئے اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور بزرگ ''نِمانے'' یعنی بیچارے منہ کھولے شرمندہ شرمندہ۔اب تو پرانے ٹی وی ریڈیو اور بزرگ متروک اور انٹرنیٹ گوگل محبوب مائی باپ ہے...!

جب ہم بچپن سے جوانی کی طرف قدم مارنے لگے تو بزرگوں کی پکڑ دھکڑ کے علاوہ ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ کی کتاب ''کرنہ کر'' ہر وقت پڑھائی جاتی تھی۔اب جبکہ ہم بزرگ ہو چکے ہیں تو یہی کرنہ کر کا غلغلہ ابھی بھی سنائی دیتا ہے جبکہ وہ امور اور دورِ جوانی تو دور دور نظر نہیں آتا مگر اسی کرنے نہ کرنے کے چکر میں ہنوز پھنسے ہیں۔ بزرگی گزارنے کے طور طریقے ہر وقت بتائے اور سمجھائے جاتے ہیں۔بچپن اور جوانی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے آنے کا احساس اُن کے جانے کے بعد ہوتا ہے۔(جبکہ

بڑھاپا تو تیس کی دہائی کے بعد ہی دروازے پر خوامخواہ دستک دے دیتا ہے اور ایک انجانا سا خوف اور یاسیت لاشعور میں بسنے لگتی ہے) جیسے کئی بچیاں مجھے ہمیشہ ہی بہت پیاری اور کیوٹ لگتی ہیں اور میں اکثر اُن سے اظہارِ محبت پر یہی جملہ سنتی ہوں:

''چھوڑیں آنٹی! اب تو میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔''

یعنی یہ ظالم بڑھاپا شروع ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب آتا ہے تو ہر نقشِ ماسوا مٹاتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی خود چیخ اُٹھتا ہے کہ:

''اب کچھ بھی نہیں مجھ کو بڑھاپے کے سوا یاد۔''

ادھر اس جوانی اور بزرگی میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ دونوں جب آتی ہیں تو پھر ٹوٹ کر آتی ہیں۔ سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ آج کل ہم سب یہاں ''ماراں جاندی جوانی نوں ہتھ ماہیا'' کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ٹوٹکے، دوائیاں، ورک آؤٹ جو کچھ بن پڑے کئے جاتے ہیں کہ شاید جاندی جوانی ہتھ آجائے۔

اس کے علاوہ جہاں تک میری معلومات اور نظر کام کرتی ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کا بڑا مسئلہ بزرگ ہیں۔ ہماری ینگ لجنہ ہم آنٹیوں سے اسقدر خوفزدہ رہتی ہے کہ وہ مسجدوں اور اجلاسوں پر آنے سے صرف ہم اور ہماری چبھتی ہوئی نظروں کی وجہ سے گریز کرتی ہیں۔ جتنی سادہ اور پھسکڑی لڑکی ہوگی وہ نیک اور اچھی ہوگی اور ذرا طرحدار، شوخ وشنگ اور فیشن روزمرہ کے مطابق ہوگی تو مشکوک ہوگی۔ جبکہ اپنی جوانی کے جھمکے، رنگین چُنے ہوئے دوپٹے اور گوٹا کناری سے سجے ہوئے سوٹ ہماری یاداشت سے موقوف ہو چکے ہیں۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ رشتہ ڈھونڈتے وقت ہماری

نظر ایک طرحدار لڑکی ہی ہوتی ہے۔

تو صاحبو! بزرگوں کے متعلق لطائف وظرائف کے بہت نادر ذخیرے موجود ہیں۔ ان میں سے میرا بےحد پسندیدہ بلکہ آپ بیتا لطیفہ بلکہ 'حقیقہ' یہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ 5 منٹ تک نصیحت نہ کرے تو اُس کی زبان چیک کرو اور اگر پانچ منٹ تک کھانسے نہیں تو اُس کی نبض چیک کرو۔ اب کسی نے مجھے چیک کیا کرنا ہے مگر حقیقت واقعی یہ ہے کہ جب تک میں کسی کو نصیحت نہ کرلوں میری زبان اور دماغ میں کھجلی ہونے لگتی ہے اور اگر دو دن واقعی کسی واضح تکلیف کے گزر جائیں تو لگتا ہے یہ کسی طوفان کے آنے سے پہلے کی خاموشی ہے۔ خدا خیر کرے۔ آخر میں ''کیوں'' اتنی تندرست محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے تو چھوڑیں لوگ بھی فکرمند ہونے لگتے ہیں ارے آپ تو بالکل سیدھی اور تیز چل رہی ہیں اور چہرے پر بھی خوب رونق ہے۔ اب جہاں تک رونق کا تعلق ہے تو میک اپ زندہ باد، آخر تک خواتین کا وفادار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کوئی بزرگ پھرتی سے کام کرتا اور چلتا پھرتا دکھائی دے تو یہ بھی مزید قابلِ اعتراض ''جُرم'' ہے۔

''ارے یہ گھر کیوں نہیں رہتی۔ بھلا آرام کرے۔''

''ہر وقت گھر میں بھی پھدکتی رہتی ہے۔ ہر کام میں پنگا۔ بھلا یہ کوئی عمر ہے کوفتے یا دہی بھلے بنانے کی۔ یا صفائیاں یا دھلائیاں کرنے کی۔ کمر کی چک نکل گئی ناں تو ہمیں ہی مصیبت پڑنی ہے!''

اور اگر کوئی نہایت تندرست بزرگ خاتون جملہ کاموں کے علاوہ درختوں کی

کٹائیاں تک کرتے ہوئے دھڑام سے نیچے گر پڑے تو گھر والوں کی دھمکیوں ، گھُڑکیوں کے علاوہ زمانے میں بھی جگ ہنسائی کروانے کی مُرتکب ہوتی ہیں۔ گھر کے ڈرائیوروے کی برف صاف کرتے ہوئے بجائے شکریہ کے گھر والوں کی لعن طعن کے علاوہ اُن کی اس دھمکی کو کہ ''اگر نمونیہ ہوا یا کمر کی چُک نکل گئی تو تیمارداری کی توقع نہ کی جائے'' بھی مسکرا کر برداشت کرتی ہیں۔

اور جو بیچاریاں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم بن کے بیٹھ جائیں تو بڑھی ویسے ہی زہر لگنے لگتی ہے کہ اتنا نہیں جو گھر میں ہاتھ ہی بٹا دے یا بچے ہی سنبھال لے۔

اور رہے مرد حضرات۔ اگر وہ باہر کسی دفتر میں باقاعدہ کام کرتے نظر آئیں تو معتوبِ زمانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑھا اب گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتا ہماری جان چھوڑے۔ ہاں بڑھا گھر بیٹھے گا تو بیوی کی بک بک ہی سنے گا۔ بیچارہ وہاں سے بھاگ کر ہمارے پلے پڑ جاتا ہے۔

اب بھلے وہ کام ٹھیک ٹھاک ذمہ داری سے بھی کرے، لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہی رہے گا۔ ہائے بیچارے بڑھے:

''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔'' نہ گھر میں چین نہ باہر کوئی عزت۔

توبہ توبہ! میں بھی حد کرتی ہوں۔ آخر کچھ تو ہوگا ان خزاں رسیدہ پتوں میں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ میں سفید بالوں والے کی دعا کو ردّ نہیں کرتا۔ دیکھا! پیدا کرنے والا ہی قدر کرتا ہے۔ جتنا بھی اپنے سفید بالوں پر ناز کریں کم ہیں۔ خوامخواہ بال رنگنے کی مصیبت میں پڑے رہتے ہیں۔ آئندہ اجتناب کرنے کی کوشش کریں۔

تبھی تو بزرگوں کو دعا کرنے کیلئے کہا جاتا ہے۔کبھی کسی نے جوانوں کو بھی درخواست دی؟ بزرگوں کو کرسی کے قابل سمجھا جاتا ہے۔اُن کے آنے پر کرسی خالی کی جاتی ہےاورتواور گورنمنٹ بھی کرسیاں خالی کروادیتی ہے۔مرتبہ بلند نہیں تو اور کیا ہے!

کبھی کبھی مشورہ ہائے رشتہ ناطہ کیلئے بھی کام میں لائے جاتے ہیں اور اُن کے ذریعہ معاملات طے کئے جاتے ہیں۔بچوں کو قرآن شریف پڑھانے اور وعظ نصائح کیلئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

کبھی یوٹیوب پر Recipe سمجھ نہ آئے تو اُن کے تجربہ کار ہاتھ وہ بگڑا کھانا سنوار دیتے ہیں۔کبھی رشتہ داری کے معاملات اور جھگڑے حل نہ ہو رہے ہوں تو بزرگوں کی گھڑکیاں اور فیصلے عجب جادو اثر ہوتے ہیں اور پل بھر میں جھگڑے طے ہو سکتے ہیں۔

ان کے وجود سے گھر برکتوں کے نور سے روشن رہ سکتے ہیں۔جب چلے جاتے ہیں یہ شجر سایہ دار تو قدر آتی ہے لیکن ان شجر ہائے سایہ دار کی صحیح قدر کینیڈا میں عمومی طور پر سردار برادری نے پہچانی ہے۔جونہی یہاں کی امیگریشن ملتی ہے تو اگلا قدم اپنے بزرگوں کی امپورٹ کا ہوتا ہےاور پھر بس ان کو دوبارہ جوانی کے جھمیلے یاد کروا دیئے جاتے ہیں کہ اب ہم سے فارغ ہونے کے بعد دوسری شفٹ میں کام کرو اور پھر انکو اپنے بڑھاپے کی کچھ بھی ادا یاد نہیں رہتی۔وہی گھن چکر زندگی کا۔آخر مصروفیت ہی تو صحت کا دوسرا نام ہے!!

بقول کسے بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں:

''ایک قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے۔دوسری قسم کے وہ جن کی بزرگی پر پیار آتا ہے۔اگر چہ پیار اور ترحّم دونوں ایک ہی قسم کے وسیع جذبے کے ذیلی

جذبے ہیں۔ چاہے بزرگ پر آئے یا دوشیزہ پر۔ پیار پیار ہی ہوتا ہے۔''

شاید ہمارا شمار بھی ان دوسری قسم کے بزرگوں میں ہوسکتا ہو جس کے بڑھاپے پر ان دنوں شباب آیا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جوانی تو گویا سوکر ہی گزار دی اور اب جب جانے کے دن قریب ہیں تو تمام قسم کے کام یکدم مکمل کرنے کی خواہش جاگ چکی ہے کہ کاش یہ سب ادھورے کام، ادھوری خواہشات اور کچھ کر گزرنے کے بعد ابدی استراحت کی طرف قدم بڑھاؤں۔ مکاں سے لامکاں کے سفر کو کچھ کرنے کے بعد مکمل کرسکوں مگر وقت کم ہے اور مقابلہ سخت ہے۔

کتنی تصویروں کے ساتھ آئی ہے شامِ زندگی
وقت جب کم رہ گیا تو کام یاد آئے بہت

لیکن صاحبو! خدالگتی تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی محبت بھی سب کو عطا کی ہوئی ہے۔ تبھی تو یہ خوبصورت نظم کتنی سندر کتنی دلآویز تصویرِ بڑھاپا ہے جو بزبان بزرگانِ دنیا ہمیں عطا ہوئی ہے۔

بڑھاپا خوبصورت ہے
اگر ذرا سا لڑکھڑائیں تو سہارے دوڑ کر آئیں
نئے اخبار لاکر دیں پرانے گیت سنوائیں
بصارت کی رسائی پسندیدہ کتابیں ہوں
مہکتے سبز موسم ہوں، پرندے ہوں شجر ہوں تو
بڑھاپا خوبصورت ہے

جنہیں دیکھیں تو آنکھوں میں ستارے جگمگا اُٹھیں

جنہیں چومیں تو ہونٹوں پر دُعائیں جھلملا اُٹھیں

جواں رشتوں کی دولت سے اگر دامن بھرا ہو تو

رفیق دِل شریکِ جاں برابر میں کھڑا ہو تو

بڑھاپا خوبصورت ہے

○○

اوّلین پُرسشِ نماز بود

فارسی کے اِس مصرعے کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ آخرت میں سب سے پہلی بات جو پوچھی جائے گی وہ نماز ہی ہوگی۔مگر نماز کا عادی بننا اور اسے اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنانا ایک خاصا مشکل کام ہے جس کیلئے بچپن سے لیکر آخری تک ایک مسلسل کوشش کرنی پڑتی ہے۔بچپن اور جوانی تو صرف عادی بننے کی کوشش میں گزرتی ہے۔ پھر چالیس کی دہائی میں آکر ہر وقت نماز کو وقت پر ادا کرنے کی فکر، اچھی طرح ادا کرنے کی فکر، دعاؤں سے لبریز نماز پر توجہ اور بڑھاپا، گرتے، سنبھلتے، لڑھکتے صرف اور صرف نمازِ پاکیزہ ادا کرنے کے غم اور مصروفیت میں بسر ہوتا ہے۔غرضیکہ یہ ایک ایسی جہدِ مسلسل ہے جو تمام عمر کی ریاضت مگر ٹھنڈک ہے۔جس کا انعام بھی بہت میٹھا اور اعلیٰ ہوتا ہے اور آپ کی یہ کوشش آپ کو دین و دُنیا میں سرفراز کر جاتی ہے۔

نماز ہماری زندگی کا ایک ایسا لازمی مگر (منافع بخش rewarding) حصہ ہے جس میں دین اور دنیا کی تمام باتیں سمو جاتی ہیں۔آپ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوستی، تعلق محبت اور عبادت کو ایک نماز ادا کرنے پر حاصل کر لیتے ہیں اور یہ تعلق دن میں پانچ دفعہ تو بہرحال بنتا ہے۔مگر نوافل جب چاہے ادا کریں اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جائیں کسی دنیاوی بادشاہ کے پاس جانے کیلئے لاکھ پروٹوکولز سے گزر کر باریابی ہوتی ہے لیکن وہ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اُس کا دربارِ عالی ہر وقت ہر شخص کیلئے کھلا ہے۔آؤ

اور اپنی جھولیاں خدا تعالیٰ کے پیار اور شفقت سے بھرلو۔ جو چاہو مانگو، جو بھی بات ہو اُس سے شیئر کرلو۔ کوئی مسئلہ کوئی مشورہ اپنی غمی، خوشی، دوستانہ گفتگو... بھلا کوئی ایسا راز دار دوست دنیا میں ہے جس کو آپ جب چاہیں جو چاہیں بتا کر مدد مانگ لیں اور وہ آپ کے مانگنے پر اور بھی خوش ہو کر آپ کو سب کچھ عطا کرتا چلا جائے۔ وہ صرف اور صرف دنیا میں خدائے واحد لاشریک ہی ہے جس کے دربار میں پانچ وقت حاضری دے کر آپ دین و دنیا کی ہر چیز حاصل کر لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب انسان خدا تعالیٰ کے حضور میں نماز ادا کر رہا ہوتا ہے، وہ وقت فرشتوں کیلئے انتہائی حسین اور شاندار ہوتا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں نماز پڑھتا ہے تو ایک خوبصورت دربار سج جاتا ہے۔ ایک انتہائی نورانی فضا میں تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان کو پتہ ہو کہ یہ کسقدر خوبصورت اور پُرسکون دربار ہے تو کبھی بھی وہاں سے جانے کی خواہش نہ کرے۔

OO

ایک مناجات

اس تیزی سے رنگ بدلتی ہوئی دُنیا میں اکثر پرانی چیزیں دُنیا کے پردے سے غائب ہوتی جارہی ہیں اور بالکل ایک نئی دُنیا تخلیق ہورہی ہے۔گلوبل ویلیج کا خواب پورا ہوتا نظر آتا ہے اور تمام دُنیا ایک ہی رنگ میں رنگتی جارہی ہے۔ اس نئے دور میں دوسری کئی چیزوں کے ساتھ دُنیا کی تمام زبانوں پر بھی بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ انٹرنیٹ کی بدولت انگلش ورلڈ لینگوئج بنتی جارہی ہے۔ اس وجہ سے دُنیا کی تمام بڑی زبانوں کو سخت دھچکا لگا ہے۔ دُنیا کی قدیم زبانیں تو اکثر ختم ہورہی ہیں اور باقیوں کی اہمیت بھی کافی کم ہوتی نظر آرہی ہے۔ فرانسیسیوں کو اپنی فرنچ زبان پر بہت ناز تھا مگر انگلش کے مقابلے میں وہ بھی ہارتی نظر آتی ہے۔

علاقائی زبانیں تو کسی شمار میں ہی نہیں ہیں۔ پاکستان میں اُردو نے علاقائی زبانوں کو کافی حد تک مات دے دی تھی گو کہ پشتو، سندھی اور بلوچی زبانوں نے اپنی اہمیت برقرار رکھی ہے مگر پنجابی زبان وادب نے اُردو سے بہت بری طرح مار کھائی۔ پنجاب کی تیزی سے دم توڑتی ہوئی علاقائی زبانوں میں سے جو چند ایک بچی ہیں ان میں سے سرائیکی زبان میں ابھی کچھ جان باقی ہے اور اس کا تخلیق کردہ ادب بہت گہری سوچ، خوبصورت اور میٹھی زبان و بیان رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ دامنِ کوہستان نمک کے علاقے کی پنجابی کا بھی اپنا لب ولہجہ اور چاشنی ہے۔ زیرِ نظر مناجات اسی پنجابی زبان کی

ایک نہایت دلآویز کاوش ہے۔

یہ دعائیہ نظم تقریباً ایک صدی پہلے لکھی گئی اور علاقے کے دیہات میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اولاد سے محروم ایک شخص کو بھیرہ کے کسی آدمی نے یہ دعا لکھ کر دی تھی کہ صبح اُٹھ کر تہجد کے بعد نہایت تضرع سے چالیس دن یہ دُعا پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے گا۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا تو واقعی خدا تعالیٰ نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا۔

لہٰذا اس وقت سے لیکر کافی عرصہ بعد تک یہ مناجات اس مقصد کیلئے پڑھی جاتی رہی لیکن طلبِ اولاد کے علاوہ بھی اس دعا کا ہر ایک مصرعہ اور ہر ایک شعر اتنے خوبصورت الفاظ و معانی و بیان رکھتا ہے کہ زندگی کی ہر پریشانی کیلئے مجھے تو بے حد مجربّ نسخہ لگتا ہے۔ میں اکثر اپنی دعاؤں میں اس مناجات کے کئی شعر اور مصرعے پڑھتی ہوں۔

اُس زمانے میں یہ نظم اسقدر مقبول تھی کہ بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے وقت ہر روز اس کا ایک مصرعہ بطور سبق یاد کروایا جاتا تھا۔ میری دادی جان مرحومہ کو بہت سی مناجات و دعائیں فارسی اور پنجابی زبان میں یاد تھیں جو وہ اکثر اپنے ملنے والوں کو یاد کروایا کرتی تھیں۔ اس لئے ہمارے گھروں میں اس کے پڑھنے کا کافی رواج تھا۔ اور میں نے بچپن میں اِدھر اُدھر سے سن کر ہی یاد کی ہوئی تھی۔ لیکن اب تو زمانے کے ساتھ دیہاتوں میں بھی شاید ہی کسی کو یہ دعا یاد ہو۔ مجھے بھی عرصہ ہوا بھول چکی تھی۔ پچھلے سال پاکستان گئی تو ابا جان مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مناجات مجھے اُن کے کاغذات میں سے ملی جو کہ انہوں نے میری خالہ جان سے سن کر محفوظ کر لی تھی۔

اِن دنوں پنجابی زبان کو گورنمنٹ آف کینیڈا کی سر پرستی حاصل ہونے کی وجہ سے غریب الوطنی میں کافی پزیرائی مل رہی ہے۔ چنانچہ مجھے خیال آیا کہ یہ نظم بھی تو پنجابی زبان کا ایک انمول تحفہ ہے۔ کیوں نہ اسے بھی ایک فن پارے کے طور پر روشناس کروایا جائے۔ اُمید ہے قارئین کسی حد تک اسے سمجھ سکیں گے۔ چند الفاظ ایسے ہیں جو شاید متروک ہو چکے ہوں گے مگر عموماً یہ سمجھ میں آ سکنے والی زبان ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم   نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مناجات بحضور اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر برائے طلب اولاد

وڈیاں مہراں والیا سائیاں رب غریب نوازا   اپنے فضل کرم تھیں کھولیں رحمت دا دروازہ

رحمت دا دریا الٰہی ہر دم وگدا تیرا   جے ہک قطرہ بخشیں مینوں کم ہو جاوے میرا

وچ خزانے تیرے یارب ہرگز تھوڑ نہ کوئی   ہر محتاج نمانے کارن رحمت تیری ہوئی

جے کر ساڈیاں عیباں کارن تیرا فضل نہ ہوندا   دفتر کالے بدیاں والے کون اساڈے دھوندا

وڈا گناہیں عیباں بھریا سائل آیا در تے   کیویں رحیم سداویں جستھیں سائل خالی پرتے

نہیں اُمید جے اپنے در تھیں خالی ٹوریں مینوں   پردے کجّن والیا سائیاں سب توفیقاں تینوں

سارے پاسے چھان ترے در آن ڈگا منہ کالا   ایسی نعمت تیرے باہجوں کوئی نئیں دیون والا

نیکاں آس نکوئیاں والی آس تری بدکارں   توں مخزن ہر نیکی سِندا اگھن اساڈیاں ساراں

بُریاں نال نکوئی کرنی ہر دم رحمت تیری   کس در جاون تئیں بن جنہاں ہور نہ کوئی ڈھیری

بخش قصور میرے یا خالق صدقہ نام غفاروں
اوگن میرے تے گُن تیرے دوویں باہجھ شماروں

جو کوئی سائل در تیرے تے آن سوال الاوے
پوری کریں مراد سیدی! جو منگے سو پاوے

تیرا اوہ دربار الٰہی پاک منزّہ عالی
جس درباروں کوئی سوالی کدے نہ وگیا خالی

کر کے آس دوارے تیرے جو کوئی عاجز جاندا
بھاویں لکھ گناہیں ہووے توں نہیں دور ہٹاندا

لکھ کروڑاں در تیرے توں خلقت مطلب پاوے
کی پرواہ جے ہک عاجز دی عرض قبولی جاوے

میریاں روگاں کارن بھیجیں فضلوں آپ دوائیاں
تیں بن ہور کیہڑے در جاواں فضلاں والیا سائیاں

وہ مرداں بخش اولاداں تے کرشادں آباداں
مردیاں تائیں بھلن ناہیں دل تھیں تیریاں یاداں

اہناں نال ملا جنہاں تے فضل تساڈے ہوئے
وچ حیاتی رکھیں ساڈے نین پران نروئے

صدقہ حضرت نبی محمدؐ سرور جمل جہاناں
جس دی خاطر پیدا کیتا تدھ زمین اسماناں

جس دی یاروں حضرت آدمؑ عیب معاف کرایا
جس دی برکت نوحؑ نبی دا بیڑا بنّے لایا

جسدی خاطر تدھ چخنہ تھیں ابراہیم بچایا
جس دی برکت یعقوب نوں یوسف فیر ملایا

ایڈ محابا جس حضرت دا وِچ تیرے دربارے
میں بھی اوہ محبوب وسیلہ لے آندا سرکارے

بخش تصدق اوسدے کر کے جو کجھ حاجت مینوں
ظاہر باطن کل مراداں میریاں مالم تینوں

مٹھا میوہ بخش الٰہی رحمت اپنی پاسوں
سُکّا رُکھ وجود میرے دا سبز کریں سرکاروں

لائیں پھل جناب اپنی تھیں سوہنے پُھل نکالے
بخش کریں فرزند حضوروں نمک حیاتی والے

جیوں مایوسی پیری ویلے قدرت ظاہر ہوئی
حضرت ذکریاؑ نوں یحییٰ آپ عطا کتوئی

سُکا باغ میرا کر ہریا رحمت مینہ وسائیں
آس اُمید میرے دی بوٹی پُھلاں نال سہائیں

بوہاں بوٹیاں لاون والا والی مالی ہردا
بے اولاداں نے نانا شاداں تکیہ تیرے دردا

باغ لگا دے خوشیاں والے بوٹی پٹ دے غم دی
سارے کم سنواریں میرے کر کے نظر کرم دی

ربّ لا تذر نی فرداً آپے تدھ دعا سکھائی
کدی تے پوری پا اساڈی روندیاں عمر وہائی

کر مقبول جناب اپنی تھیں اس روندے دی زاری
بخش غلام ذکیا مینوں یارب خالق باری

صدقہ پاک کلام اپنی دا صدقہ کُل رسولاں
صدقہ کُل انبیا نواں پاکاں محبوباں مقبولاں

صدقہ حضرت نبی محمدؐ صدقہ چواہی یاراں
صدقہ کل صدیق مہاجر صدقہ کُل انصاراں

پنج تن پاک اماماں باراں تے صدقہ معصوماندا
کُل شہید جو کربل والے عالی شان جہاندا

نقش بندی تے قادری صاحب ہور جو چشتی سارے
صدقہ پیر میانوی صاحب بخش غموں چھٹکارے

صدقہ حضرت غوث الاعظم تے صدقہ اجمل سائیں
یارب سائیاں میں عاجزویاں کریں قبول دعائیں

نوٹ: یہ مناجات پنجابی (تلفظ دامن کوہستان نمک) میں ہے بوقت سحری اُٹھ کر نوافل ادا کرنے کے بعد عاجزی اور نہایت تضرع کے ساتھ پڑھیں۔ کم از کم چالیس رات ضرور پڑھیں۔ انشاءاللہ مقصد برآری ہوگی۔ بصورتِ دیگر پھر شروع کریں، خالی واپس نہیں لوٹیں گے۔ انشاءاللہ۔

طالب دعا

اُمِّ عبدالرحمن قریشی

27رفروری1980ء

OO

تاریخ لجنہ
کینیڈا

لجنہ اماء اللہ ٹورانٹو کی طرف سے

خلافت جوبلی کی رنگارنگ تقریبات

خدا تو آخر خدا ہے
خدا کی قدرت ہی غالب آئی
نئی صدی کے اُجالے لے کر
نویدِ صبح بہار آئی

لجنہ اماء اللہ ٹورانٹو نے خلافت جوبلی کو شایانِ شان طریقے پر منانے کیلئے چار روزہ رنگارنگ تقریبات منعقد کیں۔ چاروں دن ایک جشن کا سماں تھا اور ہر ایک کے دل میں فخر و انبساط کے جذبات موجزن تھے کہ خدا تعالیٰ نے یہ عظیم موقعہ ہماری زندگیوں میں ہمیں عطا فرمایا ہے۔ ان خوشیوں اور مسرتوں سے لبالب تقریبات کی رپورٹ قارئین کیلئے حاضر خدمت ہے۔

بہت ہی روشن ہیں باب اس کے
بہت ہی دلکش ہیں داستانیں
گئی صدی میں جو فصل بوئی
اب اُس کی دیکھیں ذرا اُٹھانیں

پہلا دن ۔24 مئی 2008ء

فیضیہ مہدی پارک کے پُرفضا ماحول کی خنک فضا میں خواتین و ناصرات کی پہلی تقریب صبح 10 بجے شروع ہوئی۔ تمام ریجنز کی ناصرات اپنے اپنے بینز اُٹھائے اپنی ٹیموں کے ہمراہ مارچ پاسٹ کیلئے تیار کھڑی تھیں ۔ طاہرہ شبنم صاحبہ کی تلاوت سے تقریب کا آغاز ہوا اور حنا کوثر صاحبہ نے انگلش میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد یارک ریجن کی ناصرات نے گروپ نظم ''خوشی کے گیت سناؤ یہی سعادت ہے'' سنائی۔

خوشی اور جذبے کے ساتھ بلند کئے گئے نعرہ ہائے تکبیر اور نعرہ ہائے خلافت کے بعد صدر صاحبہ لجنہ اماءاللہ کینیڈا نے اپنے پر مغز خطاب سے تقریب کا افتتاح کیا۔ آپ نے فرمایا کہ خلافت کا یہ بابرکت صد سالہ جشن کا دن ہماری زندگیوں میں دوبارہ نہیں آئے گا۔ خلافت کی نئی صدی میں داخل ہوتے ہوئے اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں لائیں جو کہ ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ مشروط ہوں۔ صدر صاحبہ نے پھر نعرہ ہائے تکبیر، نعرہ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، غلام احمد کی جے، صد سالہ خلافت زندہ باد، بہت بہت مبارک ہو کے نعرے لگوائے۔

اُس کے بعد تمام ریجنز کی ناصرات کی پریڈ سے تقریب کا آغاز ہوا۔ جنہوں نے اپنے اپنے ریجن کے تحت بینز اُٹھائے ہوئے ترانے گاتے ہوئے مارچ پاسٹ کی۔ یہی ترانے بعد میں گائے جاتے رہے۔

اس افتتاحی تقریب کے بعد ناصرات کی کھیلوں کا پروگرام تھا۔ اُن کیلئے ٹکٹ جاری

کئے گئے تھے جن پر پانچ مہروں کے نشان تھے۔ پانچ ہی کھیلیں رکھی گئی تھیں جو ناصرہ جتنی کھیلوں میں حصہ لیتی اُن ٹکٹوں پر مہر لگا دی جاتی۔ پانچوں کھیلوں میں حصہ لینے والوں کو انعامات دیئے گئے۔

اسی طرح لجنہ کی کھیلیں بھی دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہوئیں۔اُن کیلئے بھی یہی پانچ نشانوں والے ٹکٹ تھے۔اور اسی طرح پانچ کھیلوں میں حصہ لینے والوں کیلئے ٹکٹوں پر مہریں ثبت کی جاتی رہیں اور انعامات ملتے رہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ظہر وعصر کی نمازیں مسجد میں ادا کی گئیں اور پھر وقف نو ناصرات کے لئے مسجد کے اندر پروگرام شروع ہوا۔اس میں تمام ریجنز کی ناصرات کیلئے ایک گھنٹے کا کوئز پروگرام تھا۔جس کے چار عنوانات تھے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، خلفائے راشدین، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور جنرل نالج۔

اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے سنہری دورِ خلافت پر ڈاکومنٹری دکھائی گئی۔ دو بچیوں نے تمام تصاویر کی رواں کمنٹری کی اور پاور پوائنٹ پر ہر چیز کو تفصیل سے پڑھا۔اسی طرح قادیان دارلامان پر بھی ایک Presentation دی گئی۔

25 مئی ۔دوسرا دن

دوسرے دن کا آغاز میراتھن ریس Run for Vaughan سے ہوا۔تلاوت سے تقریب کا آغاز ہوا اور پھر بچیوں نے ترانہ پڑھا۔اس تقریب میں وان کے علاقے کے مرد وعورتوں نے بھی بھر پور حصہ لیا اور اس طرح یہ اس علاقے کے لوگوں کا مشترکہ

پروگرام بن گیا۔اس دوڑ میں 362 احمدی وغیر احمدی مردوخواتین اور بچوں نے حصہ لیا۔ خواتین کیلئے Teston سے Collingun تک علیحدہ ٹریک تھا۔ جہاں ہماری خواتین نے سب کے شانہ بشانہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اس دوڑ اور سیر میں حصہ لیا۔ اس تقریب میں مقامی سٹورز نے بھی اسٹال لگائے اور مفت کھانا دیا۔

Hotdog اور فروٹ سب کیلئے عام تھا۔تمام رجسٹرڈ شرکت کرنے والوں کو گفٹ پیک دیئے گئے اور پہلی دوسری اور تیسری پوزیشن پر آنے والوں کو ٹرافی دی گئیں۔

اس دن کا دوسرا اور سب سے زیادہ رنگا رنگ اور دلچسپ پروگرام بچوں کا میلہ Carnival تھا جو کہ Teston Village School کے پارک میں لگایا گیا تھا۔اس میلے کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر سٹال کی چیز اور ہر کھیل بچوں کیلئے مفت تھی۔اس میں پونی رائڈ، جمپنگ کیٹل Magician، کاٹن کینڈی، پاپ کارن، فیس پینٹنگ اور ہاتھوں پر مہندی لگانے کیلئے سٹال تھے۔اس میلہ کی ایک بہت پیاری خصوصیت بچوں کے والدین اور بزرگوں سمیت اس میں شرکت تھی۔ بچوں کے ساتھ ساتھ والدین بھی ان کی خوشیوں میں شریک تھے جو کہ ایک طرح سے فیملی ایونٹ کے طور پر ہمارے لئے نئی روایت تھی۔اکثر لوگوں نے اسے پسند کیا اور مطالبہ کیا کہ عیدوں کے موقع پر بھی فیملی کے ساتھ اس طرح کا پروگرام ہونا چاہیئے۔

دوپہر کے کھانے اور نمازوں کے بعد لجنہ کا دوسرا بڑا پروگرام مسجد میں منعقد ہوا۔جلسہ کا آغاز پیل ساؤتھ کی فوزیہ اکرم صاحبہ کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا جس کا انگریزی ترجمہ خدیجہ صاحبہ نے کیا۔فائزہ احمد صاحبہ آف پیس ویلیج نے نظم

''طالبوتم کومبارک ہو کہ اب نزدیک ہیں''

اپنی خوبصورت آواز میں سنائی اور حنا کوثر صاحبہ نے انگلش ترجمہ کیا۔اس کے بعد افریقی بہنوں نے اپنی نظمیں پیش کیں ''لا الہ الا اللہ'' کسی کی چشمِ فسوں ساز نے کیا جادو' افریقن اور اُردو لہجہ کی ملاوٹ سے بہت میٹھی نظمیں پڑھی گئیں اور لا الہ الا اللہ کی آواز پر پورا ہال ساتھ دینے لگا۔رحیمہ صاحبہ نے قرآن شریف کی آیت اور سواحیلی اور اُردو میں ترجمہ کے ساتھ ''لا الہ الا اللہ'' کو ملا کر ایک نئے انداز کی بنیاد ڈالی۔

اس کے بعد صدر صاحبہ لجنہ اماء اللہ کینیڈا نے خلافت کے موضوع پر اپنی سیر حاصل تقریر پیش کی اور کہا کہ خلافت وہ انعام خداوندی ہے جس سے مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کو ایک رسی میں باندھ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ویسٹن انٹاریو ریجن کی لڑکیوں نے بہت ہی جاندار پر جوش اور پُرسوز آواز میں ایک خوبصورت ترانہ پیش کیا: ''مرحبا، مرحبا جشن جوبلی مناؤ'' ان کی آواز ایک خاص پکار لئے ہوئے تھے جس کا اثر تمام لوگوں پر تھا۔یہ ترانہ سب سے سبقت لے گیا۔ اس کی انگلش صدر صاحبہ نے کی۔

محترمہ نورین سہیل صاحبہ صدر جی ٹی اے ایسٹ نے ''جماعت احمدیہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں'' کے موضوع پر انگلش میں تقریر کی اور کہا کہ جو حدیث قرآن شریف کی آیت کے مطابق بیان کی جائے وہ صحیح حدیث سمجھی جاتی ہے۔انہوں نے سورۃ جمعہ کی آیت 3 تا 5 اور آیات استخلاف بیان کر کے دو احادیث کو اُن آیات کے مطابق منطبق کر کے تشریح کی۔

اس کے بعد جی ٹی اے ایسٹ کے ترانے کے بعد عقیلہ لاہے صاحبہ نے تین ٹیموں کے درمیان ایک کوئز مقابلہ کروایا۔ تمام سوالات کے جوابات پاور پوائنٹ پر دکھائے جاتے رہے۔ سوالات حاضرین مجلس سے بھی کئے جاتے رہے اور صحیح جوابات پر چاکلیٹ دی جاتی رہی۔ اس مقابلے میں جی ٹی اے سینٹرل کی ٹیم فرسٹ آئی۔ چونکہ یہ کوئز پروگرام بہت لمبا تھا اس لئے درمیان میں مختلف دیگر پروگرام بھی دکھائے جاتے رہے۔ مختلف ترانے پڑھے جاتے رہے۔ اسی طرح سبز ساڑھیوں میں ملبوس بنگالی بہنوں نے بلقین رحمان صاحبہ کی قیادت میں اپنا بنگالی ترانہ پڑھا۔ جس کا ترجمہ صدف راشد صاحبہ نے کیا۔ بہت اچھی پیش کش تھی۔

فی البدیہہ تقریروں کا مقابلہ جس میں تمام حلقوں سے 20 ممبرات نے حصہ لیا اور بہت اچھی تقاریر کیں۔ اول عالیۃ القدوس صاحبہ، دوم سائرہ نرگس صاحبہ سنٹرل ٹورانٹو، خدیجہ سلطانہ صاحبہ پیس ویلیج ایسٹ اور سوم امۃ الرفیق راحت صاحبہ مسی ساگا قرار پائیں۔

آخر میں لجنہ کینیڈا کی ایم ٹی اے ٹیم کی بنائی ہوئی ڈاکٹرمنٹری فلمیں ''اس زمانے کا امام'' اور The Journey to Islam and Ahmadiyyat دکھائی گئیں۔ جس میں اسلامی تاریخ کی ابتدا سے لیکر احمدیت کے آغاز تک تمام زمانہ ہائے خلافت کا مختلف تصاویر کے ساتھ احاطہ کیا گیا۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام، احمدیت کا آغاز اور احمدیہ خلافت پر تمام تصاویر دکھا کر ان موضوعات پر سیر حاصل تعارف کروایا گیا۔ اسی طرح صحابہ کرام کی تصاویر، شہیدانِ احمدیت کی تصاویر اور خاندانِ مسیح موعودؑ کی

تصاویر دکھائی جاتی رہیں۔ بیک گراؤنڈ میں ''بہار آئی ہے اس وقت خزاں میں، کھلے ہیں پھول میرے بوستاں میں'' نظم بہت خوش الحانی سے پڑھی جاتی رہی۔ یہ بہت اچھی معلوماتی اور روح کو گرمانے والے پیشکش تھی۔

پروگرام کے اختتام پر پیل ریجن ساؤتھ کا ترانہ پیش کیا گیا۔اس طرح خلافت کے سو سال کو اس ایک دن کے بھرپور پروگرام میں سمونے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی۔

ہال کی سجاوٹ دیدنی تھی۔ ہر جھنڈی پر خلافت جوبلی کے بارے میں الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ دونوں ہال کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور باہر مارکی میں بھی بہت سے لوگ تھے۔ خدا تعالیٰ ہمارے سروں پر خلافت کا سائبان ہمیشہ قائم رکھے اور اطاعت اور وفا کی راہوں پر ہم سدا چلتے رہیں۔آمین۔

26 مئی۔تیسرا دن

26 مئی کی سہ پہر کو لجنہ کی طرف سے ایک اور خصوصی پروگرام پیش کیا گیا۔جس میں ترانے اور تقاریر کے علاوہ سب سے دلچسپ پروگرام ایک مشاعرہ بھی شامل تھا۔ مارکی میں بہت وسیع پیمانے پر کرسیاں لگائی گئیں اور زمین پر بیٹھنے کے انتظامات کئے گئے تھے۔خواتین جوق در جوق اس پروگرام میں شرکت کرنے کیلئے پہنچیں۔ مارکی میں مشاعرے کیلئے سٹیج کی سجاوٹ دیدنی تھی۔ لجنہ ابوڈ آف پیس کی ٹیم نے حنا صفدر صاحبہ کی قیادت میں اپنے فن آرائش کو کمال تک پہنچاتے ہوئے اسٹیج کو اس مہارت، نفاست اور خوبصورتی سے سجایا کہ ہر ایک نے اس کی سجاوٹ کی داد دی۔ دھنک رنگ پردوں

سے آراستہ رنگین بچھی ہوئی بنارسی چاندنیوں کی فرشی نشست، جھلملاتی ہوئی مومی شمعوں اور قندیلوں سے جگمگاتی فضا، رنگ برنگی جھنڈیوں اور چھوٹے فانوس سے مزین چھت اور سٹیج کے سامنے خوبصورت پھولوں سے لدے ہوئے گملوں کے بنے ہوئے اس رنگین بارڈر نے پورے ماحول کو خوش رنگ بنا رکھا تھا۔

پروگرام کے پہلے حصہ میں محترمہ امۃ اللطیف ملک صاحبہ، محترمہ امۃ الرفیق طاہرہ صاحبہ اور محترمہ امۃ الطیف خورشید صاحبہ کو دعوتِ سٹیج دی گئی اور محترمہ امۃ الرفیق ظفر صاحبہ صدر لجنہ اماء اللہ کینیڈا کی صدارت میں تلاوت قرآن پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ رضوانہ کوثر صاحبہ نے تلاوت اور ترجمہ پیش کیا۔ نورالعین صاحبہ نے ''حمد وثنا اُسی کو جو ذاتِ جاودانی'' نظم پڑھی اور نعمانہ مسرت صاحبہ نے ترجمہ کیا۔ پارک ریجن کی ناصرات نے ''خوشی کے دیپ جلاؤ'' والا ترانہ پڑھا۔ اُس کے بعد صدر صاحبہ نے خلافت کے موضوع پر ایک سیر حاصل تقریر کی۔

انہوں نے کہا کہ جماعت آج ایک نئے تاریخ ساز دور میں داخل ہو رہی ہے۔ یہ دن سورۃ النور کی آیت استخلاف میں دی گئی خوشخبری کے پورا ہونے اور مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی کی گواہی کا دن ہے۔

27 مئی ۔ چوتھا دن

27 مئی کی صبح کے پروگرام میں نماز تہجد، نماز فجر، درس اور تقاریر شامل تھیں۔ لوگوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ بہت سے لوگ رات کو مسجد میں ہی ٹھہر گئے۔ رات بھر

پیس ویلیج میں چہل پہل رہی اور چراغاں کا جشن رہا۔ رات دو بجے باہر سے آنے والوں کی اس قدر تعداد تھی کہ ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور ایک کلومیٹر کے فاصلے کو طے کرنے میں بہت دیر لگی۔ تمام پیس ویلیج کی گلیاں اور پارکنگ لاٹ کاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ انتہائی سردی کے باوجود صبح تین بجے مسجد اور شامیانے لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ محترم امیر جماعت ملک لال خان صاحب نے انتہائی توجہ اور گہرائی میں جا کر رقت بھری دعاؤں سے نماز تہجد پڑھائی۔ جس میں سات ہزار لوگوں نے شرکت کی۔

اذان کے بعد پونے پانچ بجے مولانا نسیم مہدی صاحب مشنری انچارج و نائب امیر اول نے انتہائی خشوع وخضوع سے نماز فجر پڑھاتے ہوئے خلافت کی ایک صدی کو رخصت کیا اور سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم اور درود شریف کا درس دیتے ہوئے نئی صدی کو خوش آمدید کہا۔ پانچ بجکر پینتالیس منٹ پر محترم امیر جماعت ملک لال خاں صاحب نے حضور انور کا ارسال فرمودہ تاریخی پیغام پڑھ کر سنایا۔ صبح ساڑھے چھ بجے ربوہ سے براہِ راست خاندانِ مسیح موعودؑ اور احباب جماعت کے انٹرویوز سے ایم ٹی کی نشریات کا آغاز ہوا۔ ناشتہ کے وقفہ کے بعد حضور انور کی تقریر سننے کیلئے خلافت شمع کے آٹھ ہزار پروانے شدید سردی میں دیوانہ وار مسجد میں جمع تھے اور کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ جذبۂ شوق ہر مشکل اور ہر تنگی کو برداشت کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پردۂ سکرین پر لندن، قادیان اور ربوہ سے براہِ راست لوگوں کے تاثرات دکھائے جا رہے تھے۔ پھر آٹھ بجے کر بیس منٹ پر حضور انور کی تاریخی معرکۃ الآراء

تقریر ہوئی اور اُن کے ساتھ عہد دہرانے کیلئے دنیا کے کونے کونے سے حبل اللہ جمیعاً کا نظارہ پیش کرتے ہوئے تمام احمدیوں کا ایک ساتھ کھڑے ہوکر عہد دوہرانا ایک ایسا عظیم الشان نظارہ تھا جس کی یاد ہمیشہ دلوں میں جاگزیں رہے گی۔ 190 ممالک سے تمام احمدی ایک امام اور ایک خلیفہ کے اشارے پر اُٹھ کر خدا کے حضور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ یہ عہد تجدید وفا دہرا رہے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ الہام پورا ہو رہا تھا کہ ”میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔“

اسی طرح لندن، قادیان اور ربوہ سے بلند ہوتے ہوئے نعروں کا اجتماعی جواب دنیا کے کونے کونے سے دیا جا رہا تھا۔ یہ عالمی روح پرور نظارے صداقتِ مسیح موعودؑ اور خلافت کی برکات کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ دس بجے کر بیس منٹ پر اپنے آقا امام کی زیر قیادت عالمی دعا کے لئے تمام دنیا سے گریہ وزاری اور سوز وگداز سے بھری دعاؤں کے ساتھ اُٹھے ہوئے ہاتھوں کا نظارہ چشم فلک نے دیکھا۔ اس وقت مسجد میں سسکیوں اور بہتے آنسوؤں سے بھری ہوئی دعائیں ایک گونج پیدا کر رہی تھیں۔

اس عالمی دعا کے بعد اس عظیم الشان عالمی تقریب کا اختتام ہوا۔ خدا کرے کہ ایسے سو سال پورے ہوں ہزاروں ہی بار۔

اس عالمی تقریب کے بعد مقامی پروگرام ہوئے جن میں پرچم کشائی، اطفال احمدیہ کا پروگرام، مجلس خدام الاحمدیہ کینیڈا کا کوئز پروگرام اور ایک علمی مذاکرہ شامل تھا۔ یہ تینوں انتہائی دلچسپ اور معلوماتی پروگرام تھے جن میں خلافت کے موضوع پر ہر پہلو کو

اُجاگر کیا گیا تھا۔

بعد میں 2 بجکر 20 منٹ پر تقسیم انعامات کا سلسلہ شروع ہوا اور آخر میں محترم ملک لال خان صاحب امیر جماعت کینیڈا نے اپنا اختتامی ایمان افروز خطاب کیا اور دو پہر تین بجے اجتماعی دعا کے ساتھ صد سالہ خلافت احمدیہ کی جشن تشکر کی چار روزہ تقریبات اختتام کو پہنچیں۔ الحمدللہ۔

○○

تازہ بستیاں

(یہ مضمون جلسہ سالانہ جاپان کے خواتین کے اجلاس میں پڑھا گیا)

قادیان کی سرزمین پر جونور چمکا اُس کی ضیاباری سے ایک جہاں منور ہوا۔ ربوہ اور قادیان کا ماحول ایک اور پاکیزہ اور روح پرور ماحول تھا کہ وہاں کے رہنے والے اس روحانی ماحول میں پرورش پا کر جب باہر نکلے تو تمام دنیا کی رہبری اور ہدایت کا باعث ہو گئے۔ آج ہم دُنیا کے ہر گوشے میں ربوہ کے باسیوں کو آباد دیکھتے ہیں جن میں اکثریت دین و دنیا دونوں میں اعلیٰ مقام پر فائز ہے اور لوگوں کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ جس طرح آج یہاں جاپان میں بھی ربوہ کی پُرنور فضاؤں میں پلے ہوئے رشد و ہدایت کا سامان کر رہے ہیں۔ اس طرح ان فرزانوں نے کینیڈا بھی آ کر ایسی بستیاں بسائی ہیں جہاں قادیان و ربوہ کے شب و روز کی جھلکیاں ہر وقت دیکھنے میں آتی ہیں اور بعینہٖ ایسا ہی پاکیزہ اور روح پرور احمدی ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔

مجھے پاکستان ٹھہرنے کے دوران ربوہ آنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ صرف جلسوں وغیرہ پر ہی جانا ہوتا تھا۔ مگر ہمیشہ اس کمی کا احساس رہا کہ کاش ہم بھی ایسے پاک ماحول میں رہ سکتے۔ کہتے ہیں کہ جذبہ صادق ہو تو کوئی نہ کوئی سبب اور وسیلہ خدا تعالیٰ بنا دیتا ہے۔ یہاں کینیڈا آ کر میری یہ خواہش خدا تعالیٰ نے اس طرح بطریق احسن پوری کی کہ

خدا تعالیٰ کی حمد وثنا اور شکر سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔

کینیڈا میں احمدیت کا پودا 1950ء کی دہائی میں لگا اور آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوا۔ 1967ء میں یہ جماعت نیشنل لیول پر قائم ہوئی جو امریکہ کی جماعت کے تحت تھی۔ اس زمانے میں YMCA کا ایک کمرہ لے کر یہ بیس نفوس اپنا ماہانہ اجلاس کرایا کرتے تھے اور چندے وغیرہ امریکہ کی جماعت میں جاتے تھے۔ 1977ء میں یہ پہلے مبلغ کے آنے پر پہلا جلسہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ کینیڈا کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا اور دیکھتے دیکھتے یہ تعداد اب 20 ہزار تک جا پہنچی (آجکل 40 کی دہائی چل رہی ہے)

تعداد کے ساتھ ساتھ ضروریات بھی بڑھتی گئیں اور پھر وسع مکانك کے مطابق جگہیں ایک کمرہ سے بڑھ کر بڑی بڑی مسجدوں میں تبدیل ہوئیں اور مسجدیں بھی کم پڑنے پر اور مسجدیں اور لوگوں کے رہائشی علاقے بھی تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ سب سے پہلے مسجد بیت الاسلام جب بنائی گئی تو اُس وقت آس پاس سب فارم اور کوئی رہائشی سکیم گورنمنٹ کی طرف بنانے کی کوئی سکیم نہیں تھی بلکہ گورنمنٹ کی طرف سے آس پاس کے علاقے میں گاربیج ڈمپ بنانے کی تجویز زیرِ غور تھی۔ چنانچہ اس علاقے کے رہنے والوں اور جماعت والوں نے بھی اس کے خلاف بہت احتجاج کیا۔ اگرچہ میرا پختہ یقین تھا کہ جس خدا تعالیٰ کا یہ گھر ہے وہ یقیناً اسے پاک صاف رکھے گا اور یہ ڈمپ بننے نہیں دے گا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ ڈمپ کی تجویز ختم ہوئی اور پھر اس علاقہ میں دیکھتے دیکھتے وہ جنگل میں منگل ہوا کہ یہ علاقہ خدا تعالیٰ کی قدرت کا ایک نشان بن گیا۔ وہ بے آباد ویران علاقہ اب بہترین پوش رہائشی کالونیوں

میں تبدیل ہو گیا ہے ۔ جگہ جگہ کمرشل پلازے بنے ، بڑی بڑی بلند عمارات بنیں اور ساتھ ہی نارتھ امریکہ کی ایک بڑی مال بن گئی ہے۔ٹورنٹو کا ونڈر لینڈ بھی ساتھ ہی ہے اور ایک جدید ہسپتال بنا۔ اب اسقدر گنجان آباد،خوبصورت اور مہنگا علاقہ ہو گیا ہے کہ وہاں گھر لینا ایک اعزاز کی بات ہے۔

بہر حال جب مسجد بنی تو جماعت میں یہ تحریک کی گئی کہ مسجد کے آس پاس کے علاقہ کو احمدی ہی خریدیں اور وہاں پر آباد ہوں ۔یعنی خدا تعالیٰ کے گھر کے آس پاس اس کے نام لیوا ہی رہنے والے ہوں اور مسجد کو آباد رکھیں ۔ چنانچہ جماعت نے دل و جان سے اس پر لبیک کہا۔اور اکثریت کو اگ چہ گھر خریدنے کی استطاعت تھی یا نہیں مگر مسجد کو آباد رکھنے کیلئے وہاں گھر book کروانے شروع کئے ۔کچھ نے اپنے پہلے گھر فروخت کر کے وہاں گھر لئے ۔غرضیکہ ہر قیمت پر مسجد کو آباد رکھنے کیلئے جماعت کی اکثریت نے وہاں گھر خریدے ۔ اگر چہ شروع میں آبادیوں سے دور ہونے کی وجہ سے بہت مسائل کا سامنا تھا مگر لوگوں نے مطلق پرواہ نہ کی اور ایک مشن اور ایک جذبے کے تحت وہ بستی بسائی جس کا نام پیس ویلیج رکھا گیا۔

خواتین !اب آپ وہ خوبصورت نظارہ تصور میں لائیں کہ ایک خوبصورت مسجد کے آس پاس ہر طرف یہ ربوہ آباد ہے۔ ہر نماز پر عموماً اور شام کی نماز پر خصوصاً سب گھروں سے جوق در جوق مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے نمازی ایک ایسا روح پرور نظارہ پیش کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور حمد وشکر سے دل بھر جا تا ہے کہ اس کفر والحاد کے ماحول میں ایسا پاکیزہ نظارہ۔

اس کے علاوہ عمومی ماحول تقریباً ربوہ جیسا ہی سمجھئے۔ کسی شخص نے یہاں آ کر یہ تبصرہ کیا کہ بس ''ٹانگوں'' کی کمی رہ گئی ہے ورنہ یہ تو مکمل ربوہ ہے۔ اور بقول لوگوں کے خواتین ربوہ کی ''حوروں'' کی طرح ہی یہاں پر کوٹوں، سکارفوں اور برقعوں میں ہر جگہ ہر طرف نظر آتی ہے۔ اکثریت اپنے جلسوں کے سلسلہ میں اور چندے وغیرہ لینے کیلئے مختلف گھروں کو کھٹکا رہی ہوتی ہیں۔

مسجد میں ہر روز دو تین میٹنگز ہونی لازمی ہیں۔ تینوں تنظیموں خدام الاحمدیہ، لجنہ اماء اللہ اور انصار کے لئے علیحدہ علیحدہ تین گھر خریدے گئے ہیں۔ جہاں پر ان تنظیموں کے ہیڈ کوارٹر اور دفاتر ہیں۔ لجنہ کے سینٹر کا نام بیتِ مریم ہے جو کہ ہمیشہ لجنہ کی شبانہ روز مساعی کے سلسلہ میں انتہائی مصروف جگہ ہے۔ یہاں پر لجنہ کی لائبریری بھی قائم ہے۔ عاملہ کی میٹنگز اور دوسرے شعبوں کی میٹنگز کیلئے یہ جگہ ہر وقت خواتین سے بھری رہتی ہے۔ ایم ٹی اے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔ لڑکیاں اب عمومی طور پر اپنے جلسوں اور تقریبات کی کوریج خود کرتی ہیں۔ جلسہ سالانہ پر بھی باقاعدہ آڈیو ویڈیو کا شعبہ اور سوشل میڈیا کا شعبہ اپنا کام لجنہ نے اپنے جلسوں میں خود سنبھالا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اس خوبصورت کالونی کی مختلف سڑکوں کے نام احمدیہ اکابرین کے نام پر ہیں۔ سب سے بڑی سڑک کا نام احمدیہ ایونیو ہے اور چاروں خلفاء کے ساتھ باقی سڑکوں کے نام، چوہدری ظفر اللہ خان صاحب اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ناموں پر ہیں۔ ان گھروں کے آس پاس گھومتے ہوئے ایک بہت ہی اپنائیت اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

حضور انور کی آمد پر تمام پیس ویلیج کے گھروں کو لائٹوں سے سجایا جاتا ہے۔ درمیان میں مسجد اپنے سفید رنگ اور سفید لائیٹوں کے ساتھ بالکل چاندی کی طرح چمکتی ہوئی عمارت لگتی ہے۔ شام کو پیس ویلیج میں رنگ ونور کا طوفان آیا ہوا ہوتا ہے۔ اور پھر دور و نزدیک سے ہزار ہا لوگ حضور سے ملاقات کرنے اور نمازیں پڑھنے کیلئے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں تو حسین سماں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی حضور اپنے رفقاء کے ساتھ پیس ویلیج کی سیر کو نکلیں تو سب گھروں سے لوگ نکل کر حضور کا استقبال کرتے ہیں اور اکثر گھروں میں بچیاں اور گھر والے گاکر اھلاً و سھلاً کہتے ہیں۔ ہر طرف انی معك یا مسرور کے بینر لگتے ہیں اور گھروں کو گملوں، پھولوں اور روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔ کھانے کا اور لنگر کا انتظام ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ اُدھر کباب اور تکوں کے سٹالوں پر سرِ شام تکوں کے دھوئیں سے فضا ویسے ہی مہک جاتی ہے۔ لوگ رات گئے تک باہر کرسیوں پر بیٹھے تکے کباب، بھٹوں اور پانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دور و نزدیک سے آئے ہوئے رشتہ داروں کا عجب ایک فیملی گیٹ ٹو گیدر ہوتا ہے۔

لیجئے اب ربوہ نمبر 2 یعنی ایک Compact ربوہ ملاحظہ فرمائیے۔ ہماری بلڈنگ جسے احمدیہ ابوڈ اف پیس کہتے ہیں، گورنمنٹ کی منظور شدہ، 1993ء میں جماعت احمدیہ کیلئے بنائی گئی ہے۔ جس میں 160 احمدی گھرانے آباد ہیں۔ جس میں کچھ گھر باقی مسلمان ممالک از قسم صومالیہ، غانا، سیریا وغیرہ کے لئے ہیں، باقی سب احمدی گھر ہیں۔

اس بلڈنگ کے 14 فلور ہیں اور ہر فلور ربوہ کے محلوں کی طرح اپنی شناخت رکھتا ہے۔ فلور والوں کا آپس کا بھائی چارہ بھی محلہ قسم کا ہوتا ہے۔ گراؤنڈ فلور پر ملٹی پرپز ہال

ہمارے ہاں بطور مسجد استعمال ہوتا ہے۔صبح تہجد سے لے کر رات عشاء تک یہاں خدا تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ با قاعدہ اذانیں ہوتی ہیں اور تمام نمازیں ایلیویٹر یا سیڑھیوں سے اُتر کر نمازوں میں شامل ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ جماعت کی ساری تنظیموں کے ہفتہ وار اجلاس،تربیتی کلاسز اور دیگر بڑی تقاریب منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

ایک کونے میں طاہر ہومیو کلینک بھی بنایا گیا ہے۔ جو احمدی غیر احمدی ہندو سکھ حضرات کی خدمت کا ایک بڑا امرکز ہے۔ایک لحاظ سے تبلیغی رنگ رکھتا ہے۔خواتین کے مینابازاروں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بلڈنگ کے باہر بچوں کا پارک ہے۔

بلڈنگ کا ایک اپنا ماحول ہے جو ربوہ کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ ہر طرف اپنے لوگ بچے بوڑھے اور جوان اپنے اپنے کاموں میں مگن، ہر تنظیم اپنے کاموں کے سلسلہ میں یاتو فلائیر پھینک رہی ہوتی ہے یا دروازے کھٹکھٹا رہی ہوتی ہے۔آپس میں میل جول ،Gossip،خبریں،افواہیں،کہانیاں،شاپنگ،مشورے،فیشن،دعوتیں،ایک دوسرے کی مدد، وقارِعمل، کسی کی Moving کروانی...سب باہمی محبت و پیار سے چل رہا ہوتا ہے۔ایک زندگی،ایک ہنگامہ،ایک چہل پہل اس بلڈنگ کا طرہ امتیاز ہے۔

یہاں پر اکثر گھروں میں پاکستان سے منگوائے گئے ملبوسات کی بوٹیکس ہیں۔Cosmetics کی ترسیل گھروں میں جا کر ہو رہی ہوتی ہے۔کئی چھوٹے موٹے بزنس از قسم گھریلو اشیاء کی مرمت، ٹی وی، وی سی آر وغیرہ، کیٹرنگ، بچوں کو سکول لانے لے جانے کی سروس،انکم ٹیکس فائل کرنے کی خدمات،Day Careوغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

بلڈنگ کے آس پاس کا ماحول بدلنے میں بھی اس بلڈنگ کا خاص ہاتھ ہے۔آس

پاس کے شاپنگ پلازے اب منی پاکستان کا ماحول پیش کرتے ہیں۔ پاکستانی گروسری، مٹھائیاں، کپڑے، تکے کباب، پان ہوٹل سب انڈیا پاکستان کے لوگوں کیلئے ہیں۔جیولری کی دوکانیں، کھلے کپڑے، بوٹیکس، پلاؤ زردہ، چکن روسٹ کے لئے ٹیک آؤٹ کی سروس، غرضیکہ ہر طرف پاکستانی انداز ہے۔

اس کے علاوہ بھی بلڈنگ کے باہر عمومی طور پر امن وسکون کا ماحول ہے۔اور پولیس کو یہاں اس بلڈنگ کی وجہ سے کم چکر لگانے پڑتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ڈرگز ہیں اور نہ کوئی لہو ولعب۔ جبکہ آس پاس یہ سب لوازمات اپنی پوری شان کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔اور پولیس بھی ہر وقت تیار رہتی ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پولیس ہم سے بہت خوش ہے۔

یہاں باہر عموماً لوگ سروں پر ٹوپیاں پہن کر اور عورتیں کوٹ سکارف پہن کر پھرتی ہیں۔ایک دفعہ کسی شخص نے بس ڈرائیور سے اس سٹاپ پر اتارنے کو کہا تو بس ڈرائیور نے جواب دیا کہ ہاں وہی سٹاپ ناں جہاں سب لوگ سر کور کر کے پھرتے ہیں۔

تنہائی نام کی کوئی چیز اس بلڈنگ میں نہیں ہے۔ یہاں عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان سب کو اپنی قسم کی صحبت میسر ہے۔سب اپنے ہم عمر ساتھیوں کی محفلوں میں چہکتے پھرتے ہیں۔خواتین بھی کمیٹی پارٹی قسم کی کوئی نہ کوئی رونق لگائے رکھتی ہیں۔اکیلی عورت اور بوڑھے لوگوں کیلئے بہت محفوظ اور پُرسکون جگہ ہے۔رات کے کسی حصہ میں یہاں پھرتے ہوئے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا۔MTA کی بدولت اب خلیفہ وقت ہر گھر میں محوِ گفتگو رہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں Cable کے ذریعہ MTA کے علاوہ مسجد

میں ہونے والی ہر کاروائی گھر میں سنائی دیتی ہے۔یعنی گھر بیٹھے بھی استفادۂ عام ہے۔

قصہ مختصر کہ ایک ربوہ ہم سے چھینا گیا تو خدا تعالیٰ نے اور بہت سے ربوہ آباد کر دئے۔

یہ تو تھی ہماری کینیڈا کی کہانی جو آپ نے سنی۔ یہاں آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔اب ایک احمدیہ کلچر ہر جگہ موجود ہے۔اس لئے یہاں آ کر ایسے لگا جیسے کہ اپنے ہی گھر میں آ گئی ہوں۔منصورہ سیگی گوچی سیکرٹری نومبائعین محنت اور جذبے سے اپنا کام کر رہی ہیں۔خدا تعالیٰ ان لوگوں کے دل بدلے اور یہ خدائے واحد کے پرستار بن کر دنیا اور آخرت میں سُرخرو ہوں۔جیسے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ فرما گئے ہیں کہ آدھے مسلمان تو یہ لوگ پہلے سے ہی ہیں۔اب آپ نے آدھا مسلمان اور بنانے کی کوشش کرنی ہے۔آپ سب بہنیں اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کر رہی ہیں۔ بچے عموماً بہت خوش باش اور بہت مہذب ہیں۔اور بہت اچھی دینی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔خدا تعالیٰ سے اُمید ہے کہ یہ نئی نسل احمدیت کو پھیلانے والی اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بلند کرنے والی ہوگی۔ان شاء اللہ۔

OO

شرفِ میزبانی

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے 1991ء میں دورۂ کینیڈا کے بعد اپنے تاثرات اور شکریہ کا اظہار ایک خط کے ذریعہ کیا۔ اس خط میں بطورِ خاص انہوں نے لجنہ کی اُس ٹیم کی شاندار کارکردگی کا شکریہ ادا کیا جو اُن دنوں اُن کی خدمت پر مامور تھی۔ یقیناً حضورؒ کے یہ الفاظ لجنہ کی اس ٹیم کیلئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ حضورؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''وہ خواتین جن کے سپرد آپ نے میری اہلیہ، بچوں اور عزیزوں کی مہمان نوازی فرمائی تھی اُن سب نے حیرت انگیز باریک نظر سے اور بڑی محنت سے ہمارا خیال رکھا اور ادنیٰ ادنیٰ آسانیاں کرنے کیلئے بڑی بڑی تکلیف اُٹھاتی رہیں۔ ان بہت سی خواتین نے جس طرح دن رات محنت کی اُن سب کے نام تو مجھے یاد نہیں رہے لیکن ان سب کی پرخلوص محنت اور خدمت کا نقشہ ذہن اور دل پر ثبت ہے۔ ان سب کو میری طرف سے نہایت محبت بھرا سلام پہنچا دیں۔ ہم سب اُن کے بے حد ممنون ہیں اور دل کی گہرائیوں سے ان کیلئے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہو۔''

ہمارے لئے یہ خط ہی اس مضمون کے لکھنے کیلئے محرک ہوا کہ اُن خواتین سے براہِ راست مل کر ان دنوں کی روئیداد پوچھی جائے۔ چنانچہ ان سے اس ملاقات کی

تفصیل پیش خدمت ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اپنے دورِ خلافت میں 7 بار کینیڈا کا دورہ کیا۔اس زمانے میں بیت الاسلام ٹورانٹو کے مشن ہاؤس میں ہی حضورؒ اور ان کے عملہ کے قیام و طعام کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ان کی آمد پر حضورؒ اور ان کے عملے کے قیام و طعام کا انتظام لجنہ کے تحت ہوتا تھا۔ یہ ایک بہت اہم اور بھاری ذمہ داری تھی جو لجنہ کے سپرد تھی۔ کیونکہ سیکورٹی کے نقطہ نظر سے کھانا پکانے اور اس کے جملہ انتظامات کے لئے بہت احتیاط اور سوچ بچار کے ساتھ کھانے کا مینو وغیرہ بنانے کی منصوبہ بندی کرنی پڑتی تھی اور کڑی نظر کے ساتھ انتظامات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں امیر و مشنری انچارج مکرم نسیم مہدی صاحب کی بیگم فیضیہ مہدی صاحبہ (مرحومہ) نے اس معاملے میں بہت اہم اور بھرپور کردار ادا کیا۔انہوں نے تمام قوائد وضوابط بنائے اور ان پر بہت سختی اور نگرانی کے ساتھ عمل کروایا۔انہوں نے اپنی ٹیم کی تشکیل دی جس میں محترمہ امۃ اللطیف ملک صاحبہ، محترمہ قدسیہ حمید صاحبہ، محترمہ راضیہ سرفراز صاحبہ، محترمہ اختر صوفی صاحبہ، محترمہ عبید اللہ صاحبہ، محترمہ ناہید سلطان قریشی صاحبہ، محترمہ انیسہ دانیال صاحبہ، محترمہ نعیمہ داؤد صاحبہ اور محترمہ سعدیہ مہدی صاحبہ شامل تھیں۔ چنانچہ یہ ٹیم تمام دنوں کے کھانے کا مینو بہت پہلے تیار کر لیتی تھیں اور پھر اس کے مطابق کام کرتی تھیں۔ درمیان میں لوگوں کی طرف سے کھانوں کی پیشکش کو بھی بہت چھان پھٹک کر اور ذمہ دار افراد کو چن کر قبول کی جاتی تھی اور ہر روز کے مینو میں کبھی کبھی وہ کھانے بھی شامل کر کے ان لوگوں کے ناموں سے بُک کر لئے جاتے تھے۔

لیکن اس تمام کام میں رازداری اور حفاظت کا خیال سب سے ضروری نکتہ تھا جس پر بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔

اس زمانے میں مشن ہاؤس کا چھوٹا سا کچن تھا۔ جس میں ہر روز 25 /افراد کے کھانے کا چاروں وقت کا انتظام کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی اور حضور ؒ کو دفتر میں ملنے والوں کی تواضع ، چائے اور دیگر مشروبات سب اس چھوٹے سے کچن میں چلتے تھے۔ اس کے علاوہ ساتھ چھوٹی سی گیلری میں مردوں کی طرف سے پردہ لگا کر آنے جانے والوں کا کام چلایا جاتا تھا۔ راقم الحروف کو بھی ایک دفعہ وہاں حضور کیلئے چائنیز کھانا بنا کر لے جانے کا شرف حاصل ہوا۔ تو میں نے بھی اس چھوٹے سے کچن کی کیفیت دیکھی۔ ایک بہت مستعد، چوکس اور منظم ٹیم نے یہ سب کام خوش اسلوبی سے سنبھالا ہوا تھا۔

حضورؒ کے انتہائی مصروف شب و روز میں کھانوں کو عین وقتِ مقررہ پر پیش کرنا ہوتا تھا جس میں ایک منٹ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ کھانے سے پہلے بھی اور کھانے کے بعد بھی حضورؒ کے اوقات کسی نہ کسی کام کے لئے مختص ہوتے تھے۔ خصوصاً شام کا کھانا بہت اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ حضورؒ شام کی نماز پڑھا کر آتے ، کھانا کھاتے اور پھر مجلس عرفان کیلئے چلے جاتے۔ ٹیم کا حضورؒ کے اوقاتِ کار کے متعلق رابطہ رہتا تھا۔ جونہی حضورؒ سلام پھیرتے تھے فوراً بتا دیا جاتا تھا۔ اب شام کے کھانے میں چند منٹ کی دیر سویر اگلے پروگرام پر اثر انداز ہوسکتی تھی۔ چنانچہ آپ اس ٹیم کی مستعدی اور کارکردگی کا اندازہ لگا سکتی ہیں۔ میں نے چونکہ چائنیز کھانا دینا تھا اور وہ کھانے آخر وقت

میں بنا کر پیش کرنے ہوتے ہیں۔اب آپ میری اس وقت کی کیفیت کا سوچ سکتی ہیں کہ میں کس قدر ٹینشن میں تھی کہ کھانا لگانے میں جو چند منٹ رہ گئے ہیں اس میں کس طرح سب کام نمٹا لوں۔مگر شکر ہے خدا تعالیٰ نے عزت رکھ لی اور سب کام وقت پر ہوگیا۔اور حضورؒ نے Excellent کہہ کر تعریف کی۔الحمد للہ۔میں نے وہ ایک دن کی ٹینشن دیکھی مگر آپ اس ٹیم کے اعصاب کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو صبح پانچ بجے سے لیکر رات اڑھائی بجے تک ان تمام کیفیات سے گزرتی تھی۔

محترمہ فیضیہ مہدی صاحبہ (خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے) کی وفات کے اگلے سال 1994ء میں محترمہ صاحبزادی امۃ الجمیل صاحبہ اس ٹیم کی انچارج تھیں اور حضورؒ کی تمام ضروریات کا بہت احسن طریقے سے خیال رکھتی تھیں۔

محترمہ قدسیہ حمید صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت صاحبؒ ڈرائنگ روم یا کھانے کے کمرے میں جاتے ہوئے کبھی کچن سے ہوکر گزرتے۔ضرور مسکرا کر شفقت سے حال پوچھتے اور اکثر پوچھتے کہ کیا کچھ کھایا بھی ہے؟ بعض اوقات کوئی تحفہ بھی عنایت فرماتے۔سچ تو یہ ہے کہ آپ جہاں تشریف رکھتے وہاں کی فضا ہی بدل جاتی۔حضورؒ کو کھانے کی میز پر کھانا پیش کرنا ایک انتہائی سعادت اور مسرت کا وقت ہوتا تھا۔وہاں حضورؒ کی ایک شفقت بھری نظر اور ستائش بھرا جملہ دن بھر کی تھکاوٹ کو دور کرنے اور اس کام کو جاری وساری رکھنے میں مدد دیتا چلا جاتا۔اس میز پر ساتھ ساتھ مہمانوں کی آمد جاری رہتی اور دلچسپ محفل کا سماں بن جاتا۔حضور سب سے پہلے خود بیگم صاحبہ بی بی آچھی کی پلیٹ میں کھانا ڈالتے اور ساتھ ساتھ دلچسپ باتوں، چٹکلوں اور لطیفوں کا سلسلہ جاری رہتا۔وہ

اوقات ہماری زندگیوں کے خوبصورت ترین لمحات تھے۔ جن کی یادیں ہم تمام عمر نہیں بھول سکتیں۔

محترمہ قدسیہ صاحبہ بتاتی ہیں کہ 1996ء میں ٹیم میں شامل محترمہ راضیہ سرفراز صاحبہ وینکوور سے آئیں تو حضورؒ نے ان سے پوچھا کتنے کا ٹکٹ لیا ہے، ان کے بتانے پر کہ 500 ڈالر کا ٹکٹ تھا، حضورؒ کافی حیران ہوئے۔ پھر آتے جاتے بطور مذاق پوچھتے راضیہ تمہارے پیسے پورے ہوئے یا نہیں؟

اسی طرح ایک سیر سے واپسی پر اپنے سیر کے گیلے کپڑے خود دھونے لگے۔ آپ کی خدمت میں بہت عرض کی گئی کہ ہم دھو دیتے ہیں۔ پوچھا کہ ان کو سکھاؤں کہاں پر؟ بہر طور پھر سکھانے کیلئے ڈرائر میں ڈالے۔ اسی طرح جاتے وقت اپنے اٹیچی خود اٹھا کر لا رہے تھے۔ جب ان سے لینے کیلئے اصرار کیا گیا تو فرمایا اپنے بوجھ خود اُٹھانے چاہئیں۔

اسی طرح قدسیہ حمید صاحبہ بتاتی ہیں کہ اُن دنوں عصر کی نماز سے پہلے عین چار بجے حضورؒ چائے کیلئے اپنے کمرے سے باہر تشریف لے آتے اور کھانے کے کمرے میں آ کر بے تکلفی سے بغیر پگڑی کے بیٹھ جاتے اور چائے کا ایک کپ پیتے۔ اس کے ساتھ کبھی ایک یا دو نمک پارے یا کچھ میٹھی چیز لیتے۔ حضورؒ کے اس معمول میں کبھی ایک منٹ کی کمی بیشی بھی نہیں ہوئی۔ آپ کی اس قدر وقت کی پابندی پر بہت حیرت ہوتی تھی۔

مکرم ممتاز حسین صاحب اکثر اوقات لنگر کا کھانا بھی حضورؒ کو بھجواتے جسے حضورؒ تبرک فرماتے اور پھر ڈش انہیں واپس بھیج دی جاتی۔ جس دن حضورؒ نے واپس جانا ہوتا

تھااس سے ایک رات پہلے کھیر کا ایک بڑا دیگچہ پکتا تھا جسے حضورؒ تبرک فرما دیتے اور پھر سب احباب میں تقسیم کر دیا جا تا تھا۔ یہی طریق حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کیلئے بھی قائم ہے۔

1996ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تشریف لائے تو مشن ہاؤس میں ہی ان کا قیام تھا۔ دونوں بیٹیاں محترمہ بی بی طوبیٰ صاحبہ اور محترمہ بی بی مونا صاحبہ اور ان کے میاں بھی حضورؒ کے ساتھ تھے۔ ان دنوں کام کرنے والی ٹیم کے متعلق حضورؒ نے فرمایا کہ یہ ٹیم اب اس کام کی ماہر ہو چکی ہے۔ اس لئے اسے ہی رکھا جائے اور اس کے علاوہ باہر سے کھانا نہ لیا جائے۔ ان کا کھانا ہی میرے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔

1997ء میں جب حضورؒ تشریف لائے تو اکیلے تھے۔ اُس وقت امۃ النصیر مہدی صاحبہ انچارج تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان دنوں بھی عملے کا کھانا لجنہ ٹیم ہی تیار کرتی تھی۔

حضورؒ کے آنے سے پہلے ٹیبل سیٹ کر دی جاتی تھی۔ ان دنوں حضور اپنی ہومیوپیتھی والی کتاب لکھ رہے تھے۔ اس لئے جلد ہی کمرے میں چلے جاتے تھے۔ بعض اوقات زمین پر جائے نماز بچھا ہوتا تھا اس پر بیٹھ کر ہی حضورؒ اپنی کتاب لکھتے رہتے تھے۔ ان دنوں اس کمرے میں ہم نے ایک سینری لگائی ہوئی تھی۔ وہ حضور کو اپنے سرورق کیلئے بہت پسند آئی۔ آپ نے فرمایا یہ میں ساتھ لے جارہا ہوں۔ امریکہ سے پرنٹ کروا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ وہ پھر انہوں نے ہمیں بھجوا دی۔ ان دنوں رات گئے تک اپنی کتاب لکھتے رہتے تھے۔ اور پھر رات کو اگر بھوک لگتی تو فرج میں سے آم نکال کر کھا لیتے۔ حضورؒ

کو اس وقت ہم بغیر پگڑی کے دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ سعودی عرب کی ایک خاتون نے حضورؒ کو عبا تحفے میں دی تو حضورؒ نے مجھے فرمایا کہ امۃ النصیر یہ تحفہ تو تمہارے پہننے والا ہے اور پھر مجھے دے دی۔ وہ تبرک میرے پاس آج محفوظ ہے۔

حضورؒ کی مصروفیات اسی طرح تھیں جس طرح پہلے سالوں میں تھیں۔ ویسے ہی جلدی جلدی تمام کام سمیٹتے جانا اور ہر کام وقت پر کرنا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد صرف پندرہ منٹ سے آدھ گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر ملاقاتوں کیلئے دفتر میں چلے جاتے تھے۔ ہر کام مقررہ وقت پر ہوتا تھا۔ صبح کا ناشتہ آٹھ بجے کر کے ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتے بلکہ بعض لوگ ابھی تک دفتر نہیں پہنچے ہوتے تھے مگر حضورؒ اپنا کام شروع کر دیا کرتے تھے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز جب 2004ء اور 2005ء میں کینیڈا تشریف لائے تو اس وقت تک پیس ویلیج بن چکا تھا۔ اور حضورؒ کی رہائش محترم امیر و مشنری انچارج مولانا نسیم مہدی صاحب کے گھر میں ہوتی تھی۔ اس وقت کی ٹیم میں محترمہ امۃ النصیر مہدی صاحبہ، محترمہ امۃ اللطیف ملک صاحبہ، محترمہ اختر صوفی صاحبہ، محترمہ نعیمہ داؤد صاحبہ، محترمہ انیسہ دانیال صاحبہ، محترمہ وحید مرزا صاحب، محترمہ فردوس نعیم صاحبہ، محترمہ سعدیہ مہدی صاحبہ، محترمہ عصمت شریف صاحبہ، محترمہ قمر باجوہ صاحبہ اور محترمہ بدر باجوہ صاحبہ شامل تھیں جو محترمہ امۃ النصیر مہدی صاحبہ کی سرکردگی اور نگرانی میں نہایت مستعدی سے تمام خاطر تواضع اور مہمان نوازی کو سنبھالتی تھیں۔ حضور کے آنے پر سب سے پہلے ٹیم کا تعارف کروایا جاتا تھا۔

محترمہ امۃ النصیر مہدی صاحبہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ حضور کا کھانا بھی اسی طرح گھر میں بنتا تھا۔ عملے اور خاص مہمانوں کا کھانا باہر سے بن کر آتا تھا۔ حضور نماز ظہر اور عصر کی ادائیگی کے بعد آکر فوراً کھانا کھا کر ایک گھنٹہ آرام کرتے اور چار بجے نیچے تشریف لے آتے۔ اور گھر کے دفتر میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے اور پانچ بجے چائے پی کر ملاقاتوں کیلئے مشن ہاؤس تشریف لے جاتے۔ حضورؒ جب بھی گھر سے باہر نکلتے، سامنے لوگوں کا ہجوم کھڑا ہوتا۔ نعرہ تکبیر کی آوازیں فضا میں بلند ہوتیں۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے۔ حضور سب کو ہاتھ ہلاتے ہوئے مسجد چلے جاتے۔

جب حضور پہلی دفعہ نیا گرا فال سے رات ساڑھے بارہ بجے واپس آئے تو باہر روشنیوں کی چکا چوند میں لوگوں کے ہجوم اور نعرہ تکبیر سے ان کا استقبال ہوا تو فرمایا یہاں تو دن چڑھا ہوا ہے۔ اندر آئے تو گھر میں بچوں نے بھی اسی طرح استقبال کیا تو فرمایا اندر بھی دن چڑھا ہوا ہے۔

ان دونوں دوروں کے دوران حضور کے بڑے بھائی محترم ڈاکٹر مغفور احمد صاحب جو امریکہ میں رہائش پذیر ہیں، ان کی فیملی، حضور کا بیٹا اور داماد بھی ساتھ تشریف لائے۔ ان سب مہمانوں کا انتظام گھر میں ہی ہوتا تھا۔ البتہ رات کے وقت جو مہمان آتے تھے ان کا کھانا باہر سے پکتا تھا۔

حضور رات کا کھانا ان تمام مہمانوں کے ساتھ مل کر اکٹھے کھاتے تھے۔ اس وقت بی بی یاسمین صاحبہ، بی بی امۃ الصبور صاحبہ، بی بی مینا احسن صاحبہ اور ان کی بیٹی صباحت

سلمہ ڈیوٹی دیتی تھیں اور مردوں کی طرف مرزا احسن صاحب ڈیوٹی دیتے تھے۔ یہ سب بہت اچھے طریقے سے ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔ محترمہ بی بی امۃ الجمیل صاحبہ بھی رات کو حضور کی ملاقات کیلئے تشریف لاتیں اور حضور کی پسند کے کھانے بھی پکا کر لاتی تھیں۔ اسی طرح بی بی امۃ الصبور صاحبہ اور بی بی مینا صاحبہ بھی اکثر کچھ نہ کچھ پکا کر لاتی تھیں۔ بی بی امۃ الصبور کے بنے ہوئے میٹھے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ دونوں کو ہی پسند تھے۔

2005ء کے دورے کے بعد جب حضور واپس جانے لگے تو کچن میں آئے اور سب کا شکریہ ادا کیا اور ساری ٹیم کو الیس اللہ کی انگوٹھیاں تحفۃً عنایت فرمائیں اور جانے سے پہلے حضور نے کہا کہ ''گھر والی کدھر ہے۔ یہ چابیاں سنبھالو۔ ہم جا رہے ہیں۔''

حضور کے تیسرے دورے کے وقت گیسٹ ہاؤس بن چکا تھا۔ لہٰذا حضور وہاں قیام فرما ہوئے۔ البتہ ان کے بھانجے ہمارے ہاں قیام پذیر ہوئے۔

آپا جان سیدہ امۃ السبوح بیگم صاحبہ کی باتیں یاد کرتے ہوئے محترمہ امۃ النصیر مہدی صاحبہ نے ان خوبصورت دنوں کا ذکر کیا جب آپا جان کی دل موہ لینے والی شخصیت کی بابرکت صحبت سے وہ اپنے ٹیم کی کارکنات سمیت فیضیاب ہوتیں۔ ان کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ آپا جان کی طبیعت میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ وہ اپنے کپڑے خود دھوتیں اور استری کر لیتی تھیں۔ اپنا کمرہ خود ٹھیک کرتیں۔ حضور کا اور اپنا کام سب خود کرتی تھیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد کچن کی ٹیبل پر آ جاتیں اور ٹیم کے پاس بیٹھ کر اپنے دوروں کی باتیں سناتیں۔ نصائح کرتیں۔ ان کو ٹیم کے کام کا

بہت احساس تھا۔ اکثر ہم سے کھانوں کے متعلق اور اس تمام کام کو چلانے کے بارے میں استفسار کرتیں۔ وقتاً فوقتاً کچن یا فیملی روم میں یہ دلچسپ گفتگو جاری رہا کرتی تھی۔ گھر میں شام چھ بجے سے ساڑھے سات بجے تک عام ملاقاتوں کے لئے لجنہ کو وقت دیتی تھیں۔ اور ساڑھے سات بجے کے بعد رات گئے تک اپنے افرادِ خاندان کے پاس بیٹھتی تھیں۔ ان دنوں بیت المریم میں دو دفعہ تشریف لے گئیں۔ وہاں پر اور گھر پر بھی لجنہ سے ملاقاتیں جاری رکھتیں۔

جب بھی حضور تشریف لاتے تھے تو ہماری فیملی کے افراد بیسمنٹ میں رہائش رکھتے تھے۔ ان دنوں بچوں کو اوپر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی تاکہ حضور کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ مگر آپا جان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ بچوں کو کیوں منع کیا جاتا ہے۔ جب مسجد کے افتتاح کے لئے ہم کیلگری گئے تو آپا جان نے خود نسیم مہدی صاحب سے کہا کہ مجھے اپنے بچوں سے ملوائیں۔ پھر بہت پیار سے ملیں اور کہا کہ میں ان کیلئے بہت اداس تھی۔ اور اپنے بہت قیمتی وقت سے ہمیں نوازا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ مقدس صحبتیں عطا فرمائیں اور ان کے ساتھ ہمارا یہ قیمتی وقت گزرا۔ الحمدللہ۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کے تیسرے دورے کے وقت جماعت کینیڈا کا گیسٹ ہاؤس بن چکا تھا۔ لہٰذا حضور اور ان کے رفقاء کا قیام وہیں رہا۔ اس دفعہ شرفِ میزبانی محترمہ امۃ اللطیف ملک صاحبہ اور ان کی ٹیم کو حاصل ہوا۔ ان کی ٹیم میں بشریٰ داؤد صاحبہ، امۃ السلام ملک صاحبہ، وحیدہ مرزا صاحبہ، بدر باجوہ صاحبہ اور قمر باجوہ

صاحبہ شامل تھیں۔

محترمہ امۃ اللطیف ملک صاحبہ نے بتایا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کو بھی مرچوں والے کھانے اور سویٹ ڈش بہت مرغوب ہیں۔ مگر اس دفعہ حضور نے کم مصالحوں والے کھانے زیادہ پسند فرمائے۔ ان دنوں بی بی امۃ الصبور صاحبہ اور بی بی مینا احسن صاحبہ بھی حضور کی پسند کے کھانے بنا کر لاتی تھیں۔ شام کو حضور کا خاندان اکٹھا ہوتا تھا۔ پرائیویٹ ملاقاتیں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھیں۔

آپا جان بی بی امۃ السبوح بیگم صاحبہ کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بریڈفورڈ بھی تشریف لے گئے۔ بیگم صاحبہ اور کچھ افرادِ خاندان بھی ساتھ تھے۔ نیو مارکیٹ اور بیری کی جماعتوں نے حضور کا استقبال کیا۔ وہاں باربی کیو بھی ہوا۔ حضور نے ساری زمین کا دورہ کیا اور امیر صاحب کو ہدایات دیں۔ باہر لجنہ کے ساتھ تصویریں بنوائیں اور جب اندر تشریف لائے تو کہا کہ ڈیوٹی والی خواتین بھی اب تصویر بنوالیں۔ اس طرح حضور کے ساتھ سب خواتین کی فوٹو ہوئی۔

الحمدللہ کہ لجنہ کینیڈا کو اس شرفِ میزبانی کی سعادت نصیب ہوئی۔

○○

پسِ آئینہ-''النساء'' کی کہانی

وقت کی شاخ سے توڑے ہوئے لمحے

کینیڈا میں جماعت احمدیہ کے قیام کے بعد لجنہ کینیڈا نے بھی شانہ بشانہ ہر شعبے میں جماعت کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اُس وقت کی صدر محمودہ میاں صاحبہ نے بھی تمام شعبہ جات میں جماعت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کیلئے بے حد محنت کی۔ 1987ء میں جب محترمہ صاحبزادی امۃ الصبور صاحبہ وینکوور سے تشریف لائیں تو اُنہوں نے انہیں اپنی وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا۔ ان دونوں نے مل کر نہایت تن دہی سے لجنہ کو ہر طرح سے فعال کرنے کیلئے بہت کوشش کی۔ محترمہ محمودہ صاحبہ نے محترمہ امۃ الصبور صاحبہ کو انگلش اسپیکنگ لجنہ اور ینگ لجنہ و ناصرات دونوں کیلئے انگلش پروگرام کرنے کا شعبہ اور انٹرفیتھ سمپوزیم کروانے کا کام سپرد کیا جو کہ اس وقت کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس شعبے میں تمام لجنہ و ناصرات کیلئے کامیاب پروگرامز کا انعقاد کیا جس سے ایک بہت تعمیری اور خوشگوار تاثر قائم ہوا۔ اور اسی طرح سب سے پہلا کینیڈا انٹرفیتھ سمپوزیم بھی بہت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔

اس کے ساتھ ہی محترمہ محمودہ میاں صاحبہ نے انہیں 'النساء' کی ادارت بھی سونپی جس پر انہوں نے نہایت تن دہی سے کام شروع کیا۔ 1987ء میں عاملہ کی ایک میٹنگ میں اس کے متعلق تجویز پیش کی گئی جو منظور ہوئی اور پھر اس پر جلد ہی عملدرآمد شروع

ہوگیا۔جس کے نتیجہ میں جنوری 1988ء میں پہلا رسالہ منظرِ عام پرآیا۔

محترمہ امۃ الصبور صاحبہ نے النساء کے اُردو وانگریزی دونوں حصص کی ادارت سنبھالتے ہوئے سب سے پہلے رسالہ کا نام تجویز کرنے کیلئے ایک مقابلہ کا انعقاد کیا۔

جمیلہ سعید صاحبہ کا تجویز کردہ نام 'النساء' منظور ہوا۔اسی طرح رسالے کے کور کیلئے بھی ایک مقابلہ کروایا گیا جو کہ ساجدہ داؤد صاحبہ نے جیتا اور اُس کے انعام کے طور پر ان کیلئے ایک سال کیلئے میگزین مفت دینے کی پیشکش کی گئی۔اُن دنوں اُن کو رسالہ کے اخراجات کے ٹوٹل ایک سو ڈالر دیئے جاتے تھے جبکہ باقی اخراجات النساء ٹیم خود چندہ ڈال کر رقم مہیا کرتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پیسے بچانے کیلئے کئی کور اکٹھے ہی چھپوا لئے تا کہ کم خرچ ہو۔

محترمہ امۃ الصبور صاحبہ کہتی ہیں کہ ہم نے النساء کیلئے ایک ٹیم تشکیل دی اور مختلف کاموں کیلئے خواتین اورلڑکیوں کا انتخاب کر کے وہ شعبے ان میں تقسیم کر دیئے ۔مثلاً رائیٹنگ،کوکنگ،سوال و جواب، ناصرات کا صفحہ، اشتہارات وغیرہ۔ ہرلڑکی اپنے صفحہ کیلئے خود ذمہ دار ہوتی تھی اور نہایت محنت اور ذمہ داری سے تمام مواد اکٹھے کر کے شائع کرتی تھی۔ چنانچہ اُردو اور انگریزی میں مضامین لکھوائے جاتے۔سوال و جواب کیلئے بڑی محنت سے سوال نامہ تیار کیا جاتا۔ ناصرات کی دلچسپی کیلئے مضامین لکھنے کا مقابلہ کروایا جاتا اور اکثر ساری رات بیٹھ کر ان مضامین پر غور وخوض ہوتا اور فرسٹ سیکنڈ کے مضامین منتخب کئے جاتے۔غرضیکہ بہت منظم طریقے پر رسالے کا آغاز کیا گیا۔

اس زمانے میں ہمارے پاس صرف ایک کمپیوٹر ہوتا تھا جو مارکھم میں سسٹر خدیجہ کی

بیٹی زاہدہ خان کے پاس ہوتا تھا۔ چنانچہ امۃ الصبور خود وہاں جاتی تھیں۔ اکثر اوقات میں رات کو 12 بجے بھی سی سا گا سے مارکھم جا کر اُن سے یہ سب کام لے کر آتی تا کہ دیر نہ ہو جائے۔ اُن دنوں اُردو کی کتابت ہاتھ سے کی جاتی تھی جو محترمہ امتہ الحفیظ صاحبہ کے سپرد تھی۔

چنانچہ یہ سب کام ختم ہونے پر پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ وغیرہ کیلئے مشن ہاؤس میں محترم نسیم مہدی صاحب اور کرنل سعید صاحب کو دیا جاتا اور وہ اُس کو چیک کر کے فائل کی منظوری دیتے تو پھر پرنٹر کو دیا جاتا۔ پہلے چونکہ وسائل کم تھے لہٰذا تمام پرنٹ شدہ مٹیریل میں گھر لے آتی اور پھر تمام النساء کی ٹیم ساری ساری رات بیٹھ کر اُسے سٹیپل کرتی اور سالوں کی شکل دے کر ڈبوں میں بند کرتی اور پھر مختلف جماعتوں کو تقسیم کرنے کیلئے بھیجے جاتے تھے۔

غرضیکہ ایک نہایت اچھی لیڈر شپ اور ٹیم ورک نے رسالے کو بہت جلد کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اُن دنوں ان کے ساتھ انگلش سیکشن میں جبین خان، ساجدہ احمد اور زاہدہ خان وغیرہ شامل تھیں۔ جبکہ اُردو سیکشن میں محمودہ میاں صاحبہ، نسیم دہلوی صاحبہ باسط ادریس وغیرہ شامل تھیں۔

مگر اتفاق سے محترمہ امتہ الصبور صاحبہ کو دو سال کیلئے انڈونیشیا جانا پڑ گیا اور یہ تمام فرائض ان کی نائبہ جبیں خان کے سپرد ہوئے۔

انہوں نے بھی اسی طرح یہ تمام کام جاری رکھے۔ وہ اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ محترمہ امتہ الصبور صاحبہ کے ساتھ کام کرنے کا ایک خاص مزا تھا۔ اُن کی

سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کام کو جماعت کی ترقی کے جذبے سے کرتی اور کرواتی تھیں اور اسی جذبے کی وہ ہم سے بھی توقع رکھتی تھیں کہ ہم نے اسے ایک مثالی رسالہ بنانا ہے اور جماعت کو ہر طرح سے آگے بڑھانا ہے۔ اور ہم لوگ دن رات اُن کے ساتھ پوری محنت سے کام کرتے تھے۔ ایک خاص ماحول تھا جس میں ایک بہت ہی دوستانہ مزیدار اور محبت بھرے انداز میں کام جاری رہتا۔ ہنسی مذاق، ہلکے پھلکے ماحول اور محبت بھری رفاقت میں نہایت محنت کے کام بھی اچھے لگتے تھے۔ ہم نے بہت کچھ اُن سے سیکھا۔ وہ ہر ایک کی خوبی کے مطابق اُس سے کام لیتی تھیں۔

ٹائم کے معاملے میں بہت حساس تھیں کہ ایک خاص ٹائم کے اندر یہ کام کرنے ہیں اور یہ احساس ہم میں ابھارتی تھیں کہ How to be proud to be an Ahmadi چنانچہ اُن کے جانے کے بعد بھی ہم نے پوری کوشش کی کہ انہی بنیادوں پر ہر کام کو جاری رکھا جائے۔

اُردو کے سیکشن میں محترمہ امۃ الحفیظ حسین صاحبہ نے ہمیں بتایا کہ محترمہ محمود میاں صاحبہ مجھے تمام مضامین وغیرہ لکھوا کر اور تیار کروا کر اور احادیث اور ارشاداتِ حضرت مسیح موعود وغیرہ کا انتخاب کرکے دیتی تھیں اور میں ان کو لکھتی جاتی۔ خالی جگہوں پر اقوالِ زریں، اشعار یا روحانی وطبی ٹوٹکے میں خود شامل کرکے لکھتی جاتی تھی جنہیں وہ پسند کرتی تھیں اور جو رسالے کے حسن اور دلچسپی کا بھی باعث ہوتے تھے۔

اُس زمانے کی معروف مضامین نگار محترمہ نزہت آرا حفیظ صاحبہ، آپا عطیہ شریف صاحبہ، نسیمہ دہلوی صاحبہ، مبارکہ شکور صاحبہ، نوری رضوی صاحبہ اور بہت سی دوسری

خواتین شامل ہیں۔کیلگری سے امۃ الرشید شوکت ھمہ صاحبہ بھی لکھا کرتی تھیں۔

پرانے رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے ہمیں ان پر بہت پیار آیا۔ بہت کیوٹ سے لگے۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے اور ٹائپ کئے ہوئے ۔ پورے صفحے کے اشتہارات مثلاً سونو ساڑھی ہاؤس، ہانڈی ریسٹورنٹ، احمد گروسز وغیرہ۔ساجدہ احمد اور صبور چوہدری کے بنے ہوئے کارٹون اور کراس ورڈ۔لوگوں کے ذاتی اشتہارات وغیرہ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی کافی تنوع لئے ہوئے دلچسپی اور معلوماتی تھے۔کافی Original سٹائل تھا جو آج کل کے مضامین سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔خاصے اخلاقی ، مذہبی اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ اُن میں ایک طرح کی شگفتگی اور دلچسپی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔الغرض امۃ الصبور صاحبہ اور امۃ الحفیظ حسین صاحبہ سے لیکر فرزانہ سنوری تک اور ماہ جبین خان سے صادقہ صاحبہ تک کے ادوار میں یہ رسالہ ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔

2008ء میں لجنہ نے خلافت کے موضوع پر ایک خاص ایڈیشن خلافت نمبر تیار کیا۔ مگر وہ کچھ ٹیکنیکل وجوہات کی وجہ سے منظرِ عام پر نہ آسکا۔ پھر خلافت خامسہ کے بابرکت دس سال پورے ہونے پر لجنہ کینیڈا کو ایک اسپیشل ایڈیشن چھاپنے کی سعادت حاصل ہوئی جو خلافتِ خامسہ کے دس سال پر پھیلی ہوئی فتوحات اور کامیابیوں پر محیط تھا۔اُس کی تیاری میں تمام کینیڈا سے ممبرات نے حصہ لیا اور خلافت خامسہ کے دور کے ہر پہلو پر بھرپور روشنی ڈالی جو سب کیلئے بہت معلوماتی اور تقویت ایمان اور ازدیادِ ایمان کا باعث ہوا۔

الغرض النساء کا جو پودا محمودہ میاں اور امۃ الصبور نے لگایا وہ امۃ الحفیظ سے فرزانہ سنوری تک اور ماہ جبین سے صادقہ حفصہ تک ایک شجرِ سایہ دار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ موجودہ اشاعت کی قیادت اسے مزید ترقی کی نہج پر نکھارنے میں مصروف ہے جبکہ اشاعت کے شعبے میں النساء کے ساتھ ساتھ 12 نئی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔

النساء جو پہلے دس ڈالر سالانہ چندہ سے شروع ہوا تھا اب 5 ڈالر فی کس کے حساب سے ہر ممبر لجنہ کے گھر بذریعہ ڈاک پہنچ رہا ہے جبکہ ہم سب کیلئے یہ بھی ایک خوشخبری ہے کہ ''النساء'' اور ''مریم'' برائے وقفِ نو دونوں میگزین اب آن لائن بھی موجود ہیں۔ الحمد للہ۔

○○

نئے پرانے جلسے

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی ہجرت کے بعد احمدی دُنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے اور ہر جگہ کئی ربوہ آباد ہو گئے۔ اسی طرح ہر جگہ سالانہ جلسے بھی منعقد ہونے لگے جو قدیم روایات کو جاری رکھنے کے ساتھ نئے زمانے کی سہولتوں سے بھی آراستہ ہیں۔ جہاں اکثر بزرگ خواتین و حضرات جو ربوہ کے جلسوں کی یادوں کے امین ہیں، بھی تشریف فرما ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے بچوں نے ربوہ کے جلسے نہیں دیکھ رکھے، ان کو کچھ اس زمانے کی جھلک دکھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ عبدالغفور صاحب کے یہ اشعار پیش خدمت ہے:

بھلے وقتوں میں جلسوں کا وہ منظر یاد آتا ہے
ہزاروں قدسیوں کا لاؤ ولشکر یاد آتا ہے
وہ لاکھوں احمدی جلسوں میں زینت رونق محفل
ہمیں اقصیٰ کا وہ محراب وممبر یاد آتا ہے
وہ پیارے دین کی باتیں وہ مدح سرورِ عالمؐ
میں کیا لکھوں، مجھے اِک اِک مقرر یاد آتا ہے
مشینی ہاتھ کی روٹی، زمیں پر بیٹھ کر کھانا
مسیح پاکؑ کا جاری وہ لنگر یاد آتا ہے

ربوہ کے جلسوں کی یادیں دلوں میں بےحد تروتازہ رہتی ہیں ۔مگر اب کچھ سالوں سے کینیڈا کے جلسوں نے وہاں کی یاد میں عجب ایک حسن سا پیدا کر دیا ہے۔اب ہم یہاں بھی ربوہ کے جلسوں کی کچھ جھلک لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ایک جلسے پر میرے ساتھ والی نشست پر محترمہ بشریٰ بشیر صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں اور مجھے ان کے ربوہ کے جلسوں پر سٹیج کی اناؤنسمنٹ کرنے کا زمانہ یاد آرہا تھا۔اپنی کھنکدار صاف آواز میں وہ ہر طرح کے اعلانات کرتی ہوئی بہت اچھی اور رعب دار لگا کرتی تھیں۔اجتماع اور جلسوں میں وہ آواز مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے۔اس دفعہ ان کو اپنے ساتھ بیٹھے دیکھ کر میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو بھی اس جلسے سے ربوہ یاد نہیں آرہا۔ کہنے لگیں ہاں اگرچہ زمانے کے مطابق انداز بدل گئے ہیں۔اس پر میں نے کہا؛مگر روح ایمانی اور ولولہ تو وہی ہے۔

پھر میں نے ہال میں نظر ڈالی۔وہی چہل پہل، وہی رونق، وہی اسٹیج کا وقار اور دین کی باتیں...کچھ زیادہ تو نہیں بدلا۔وہی سنجیدہ سی عورتیں، جن کی اکثریت خشوع وخضوع سے تقاریر سننے کے موڈ میں، کچھ اپنے بچوں کے ساتھ معاملات سلجھاتی ہوئی، کچھ اِدھر اُدھر ملنے ملانے اور سرگوشیوں میں دُکھ سُکھ سنانے یا بٹانے میں مصروف۔ڈیوٹیاں دینے والیاں ہمہ وقت چاک وچوبند اور نہایت ذمہ داری سے فرض نبھانے کیلئے ادھر اُدھر بھاگتی ہوئیں، فیشن کے نئے انداز اور ٹرینڈ۔نئی دلہنوں کے نئے نویلے جوڑے اور زیور، گمشدہ بچے اور سٹیج کے اعلانات، رشتے ڈھونڈھنے والی ماؤں کی عینک کے زاویے درست کرتی ہوئی متجسس نگاہیں، حلقہ خاص سے کوئی کرسیوں کیلئے کشاکش اور کچھ

بدمزگی۔ سبھی کچھ ویسا ہی ہے۔ نئے زمانے کے نئے انداز کے ساتھ پرانی روایات ویسے ہی جاری اور ساری ہیں اور ہمیشہ جاری وساری رہیں گی انشاءاللہ۔

اگر کچھ بدلا ہے تو وہ 21ویں صدی کی ایجادات وسہولیات ہیں جن کے نتیجہ میں کام کی کارکردگی میں جدت اور فنی مہارت نے اپنی جگہ بہت تیزی سے بنائی ہے۔ معاملہ آڈیوز ویڈیوز سے نکل کر پردۂ اسکرین پر تقریروں کے ساتھ ساتھ دکھائی جانے والی گرافکس اور لائف تصاویر تک آن پہنچا ہے۔ لہٰذا تقریریں بہتر طور پر ذہن نشین کروائی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً قرآن کریم، حدیث اور ارشادات حضرت مسیح موعودؑ سکرین پر تحریری طور پر گرافکس کے ساتھ بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں اور توجہ قائم رکھنے میں مدد لیتے ہیں۔

پروازی صاحب کے زمانے کے آب خوروں کی جگہ اب فوم کے بنے ہوئے کھانے کے ڈبوں اور گلاسوں نے لے لی ہے۔ ہمہ وقت پانی اور چائے کی فراوانی بھی نئے زمانے کی مہربانی ہے۔

اسی طرح ہال اور رجسٹریشن کے شعبوں میں کمپیوٹر کے صدقے بہت آسانی ہے۔ بچوں کیلئے ٹیک کیئر کا سسٹم ماؤں اور حاضرین جلسہ دونوں کیلئے بہت اچھا ریلیف ہے۔ صفائی اور واش روم کا سسٹم بھی جدید خطوط پر بہت منظم طریقے پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔

شعبہ طبی امداد میں دونوں قسم کے درد علاج یعنی ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی ڈاکٹروں پر مشتمل عملہ اپنی ڈیوٹیاں دیتا ہے اور گورنمنٹ کا فرسٹ ایڈ کا شعبہ بھی موجود ہوتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر سیل فون کا تحفۂ عظیم جو جلسے کے دوران اور بعد میں بچھڑے اور گمشدوں کو ملانے کی نہایت اعلیٰ اور ضروری ایجاد ہے۔ بس کبھی کبھی گرم پکوڑوں کیلئے طبیعت بہت مچلتی ہے جو ربوہ میں جلسوں کے بریک کے دوران ٹھنڈی روٹی پر رکھ کر کھایا کرتے تھے۔

نہیں دُنیا داری کے میلوں سے نسبت
روحانی خزائن لُٹائیں یہ جلسے
فضائیں ہیں معمور ذِکر خدا سے
لُٹائیں معارف کے مخزن یہ جلسے

OO

آن لائن کی آفاقی دُنیا اور خاتون خانہ

اس عالمی بیماری نے کئی عالمی مسائل کو جنم دیا ہے۔کووڈ 19 کی آمد سے تمام دُنیا کے کاروبار اور معمولاتِ زندگی آناً فاناً ٹھپ ہو گئے اور زندگی سنسان ہو کر رہ گئی۔شہر خالی، جادہ خالی، کوچہ و بازار خالی ہر طرف خاموشی اور بے بس سی ویرانی کا راج ہو گیا۔ اس زمینی ویرانی کے جواب میں انٹرنیٹ اور وائی فائی کی عملی حکمرانی کا وہ دور شروع ہوا کہ الامان... ہر طرف یہ آسمانی اور ہوائی دُنیا آباد ہو گئی اور انسان کی انسان سے دوری کی چھاپ مزید گہری کر دی گئی۔ایسے میں آن لائن کی اصطلاح آبِ حیات بن گئی اور تمام کاروبارِ دنیا اسی پر منتقل کر دیئے گئے۔

''Zoom'' کو دوسرا تریاق بنایا گیا۔ چنانچہ سب کے ساتھ ساتھ دنیائے احمدیت نے بھی ہمیشہ کی طرح زمانے سے قدم ملا کر چلتے ہوئے پہلے سے بھی بڑھ کر اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔خصوصاً لجنہ نے تو ہفتہ کے ساتوں دن آن لائن ٹیلی فونی لگا لگا کر خواتین کو اِسقدر مصروف کر دیا ہے کہ وہ اپنی گھریلو مصروفیات میں سوشل میڈیا یا کسی قسم کی ذہنی اور سماعتی فراغت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔

پرانے زمانے میں ریڈیو پر فرمائشی گانوں کا پروگرام چلتا رہتا تھا اور خواتین گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں اور آج کل سب کام چھوڑ کر موبائل کے گھن چکر میں پھنسی ہوئی تھیں۔مگر جب آنمکرم کووڈ صاحب کی تشریف آوری ہوئی تو مشقِ سُخن کے

ساتھ ساتھ چکی کی مشقت بھی چلنے لگی۔ میرا مطلب ہے کہ ہنڈیا بھُن رہی ہے اور تعلیم و تربیت کی کلاس میں تربیت حاصل کررہی ہیں۔ برتن دُھل رہے ہیں اور کان ٹِک کلب کی آڈیوز میں لگے ہیں۔ لوکل باڈی میٹنگ میں بچوں کے مسائل سے اُلجھتے سلجھتے شمولیت کی جارہی ہے۔ میز پر بیٹھی سبزی کاٹنے میں مصروف ہیں اور کان درسِ قرآن یا درسِ حدیث میں ہمہ تن گوش ہیں اور ''دست با کار اور دل با یار'' کی عملی تفسیر بنی بیٹھی ہیں۔

اُدھر مرد حضرات آن لائن گھروں میں کام کرنے لگے ہیں۔ اب اُن کیلئے ڈبل ڈیوٹی ادا کرنا بھی خاتونِ خانہ کی ذمہ داری ہے۔ ہر گھنٹے بعد چائے اور سنیکس اور وقت پر کھانا حاضر کرنا اور گھر میں امن سکون اور خاموشی کی فضا کو قائم کرنا اس کے علاوہ ہے۔

اور پھر بچے چوبیس گھنٹے گھر میں رہنے لگے تو ہر عمر کے بچوں کے ساتھ سارا دن سر کھپانا، سارا دن کچن میں مصروفیت کے ساتھ اُن کی آن لائن کلاسیں لگوا کر نگرانی کرنا، اُن کے لڑائی جھگڑے اور دیگر مسائل کے حل کے علاوہ ناصرات اور اطفال کی آن لائن تربیتی کلاسوں میں حاضری کروانا۔ گھر کی گروسری کے علاوہ بچوں کو باہر سیر تفریح پر لے جانا وغیرہ وغیرہ۔ یعنی جو تھوڑا سا وقت کسی ڈرامہ یا واٹس ایپ یا فون پر gossip میں گزرتا تھا وہ خواب ہوا سراب ہوا اور فقط ''نیکی اور فرائض'' کے صراطِ مستقیم پر چلتے رہنے کی ''خوش نصیبی'' حصے میں آئی۔

یعنی کووڈ نے گھروں میں اجتماعی طور پر نیکی اور باہمی روابط کی فضاء قائم کرنے میں

مدد دی ہے۔ آخر ہر چیز کے مثبت پہلو بھی تو ہو سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سارے فسانے میں خسارہ کس کا تھا۔ یعنی تمام دُنیا کی اکونومی کی تو بہت ڈھنڈ یا پٹی مگر ازل سے ہی Thankless Job پر مامور خاتون خانہ تو کسی شمار میں ہی نہیں ۔

بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

OO